روح فرسا انکشافات

پاکستانی
نظامِ کرپشن
کے اسرار و رموز

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk

جولائی ۲۰۱۲ء

+ 24 گھنٹے میں پکنے والا آم
مہلک بیماریوں کا باعث ہو سکتا ہے

+ تین کردار: ولی، چور اور مکار
ادارے ہی نہیں، اخلاقی اثاثے بھی داؤ پر لگ گئے

+ لندن اولمپکس
میلہ پھر سجنے کو ہے

+ رمضان المبارک
شفقت و محبت کی عظیم تربیت گاہ

PDFBOOKSFREE.PK

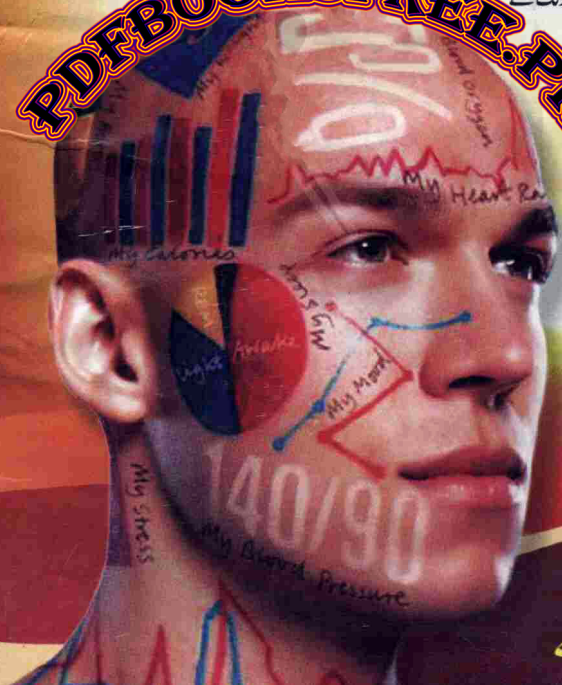

سیلف ٹریکنگ

اس دلچسپ ٹیکنالوجی کا احوال
جو ہماری زندگی کا ہر لمحہ ریکارڈ کر سکتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماں باپ سے سلوک

اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انھیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا○ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے کندھے جھکائے رکھنا اور دعا کرنا کہ اے رب! جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تو بھی ان پر رحمت فرما○

(بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳-۲۴)

ماں باپ سے حُسنِ سلوک

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؐ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کی۔ رسول کریمؐ نے دریافت فرمایا ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے عرض کیا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا ''تو پھر ان دونوں (کی خدمت کرنے) میں ہی جدوجہد کرو (یہی تمھارا جہاد ہے)۔''

(بخاری کتاب ۵۶۔ باب ۱۳۸: مسلم کتاب البر۔ باب ۱)

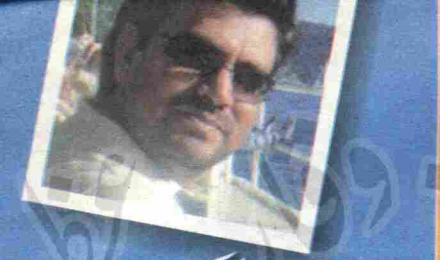

اس شمارے میں

میرا ماننا ہے کہ
سوچ میں پختگی اور تازگی ہو
تو ترقی کے امکانات لامحدود ہوتے ہیں

سلمان دانش

۳۳

لندن اولمپکس
میدان پھر سجنے کو ہے

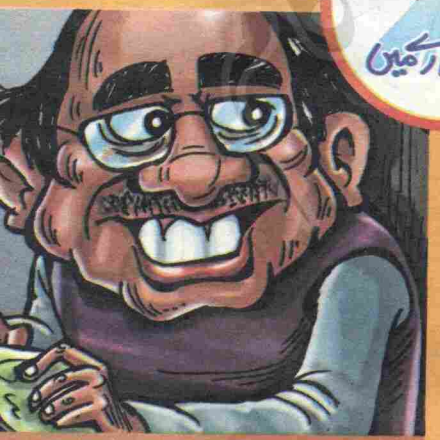

۲۰۱۲ء

۷۹

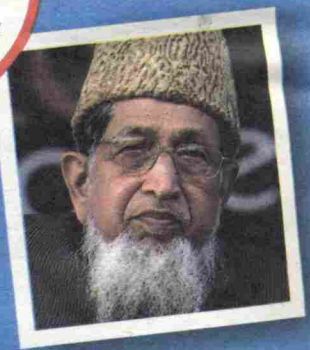

نظامِ کرپشن
کے اسرار و رموز

موجودہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ۴ سال میں ۸۵۰۰ ارب روپے کی کرپشن ہے

۱۴۸

یہاں کی جماعت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی ہے

سید جلال الدین عمری

۴۳

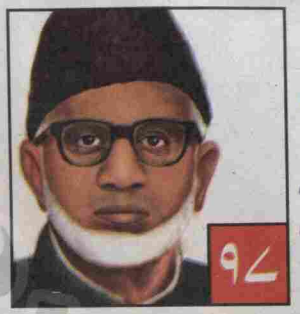

لالہ صحرائی

۱۲ سال پہلے رخصت ہونے والے ایک ادیب اور شاعر کا دل پذیر تذکرہ

احمد ندیم قاسمی

۹۷

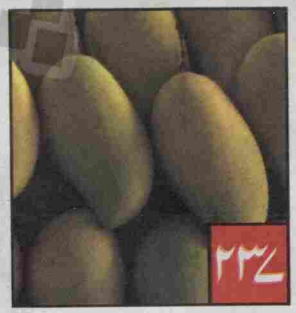

ختم شدہ فائلیں دوبارہ حاصل کریں

صغیر عباس

۱۴۵

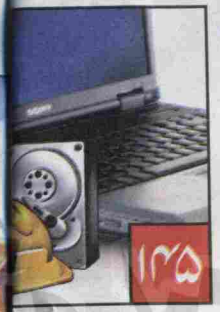

۲۴ گھنٹے میں پکنے والا صحت کیلئے نقصان دہ آم

عبدالرشید

۲۳۷

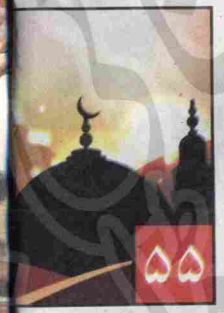

رمضان المبارک

شفقت و محبت کی عظیم تربیت گاہ

مسلم سجاد، طارق محمود

۵۵

وزن کم کریں صحت نہیں

نوشین ناز

۲۶۱

کیرئیر کونسلنگ

طلبہ و طالبات کے لیے تحفۂ خاص

یوسف الماس

۲۳۱

پیر رومی

قونیہ میں محوِ خواب ایک مردِ خود آگاہ و خود بین کا تذکرہ

سفیان شہزاد گورایہ

۱۲۲

ہم کسی سے کم نہیں

تحریم حنا صدیقی

۱۳۷

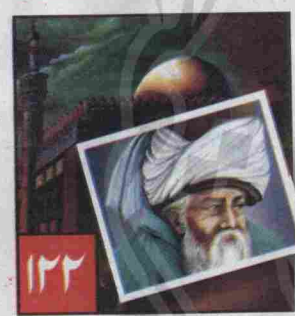

اداریہ	کچھ اپنی زبان میں	الطاف حسن قریشی	۱۷
تجزیہ	ہم کہاں کھڑے ہیں	الطاف حسن قریشی	۲۱
تازہ بہ تازہ	مصر اور مصری عوام کی فتح	ابن انور	۳۰
نقوشِ صحابہ	حضرت اُسامہؓ بن زید	خالد محمد خالد	۴۹
سفر نامہ	اُردن، جرمنی، آسٹریلیا کے سفر کا احوال	طیب اعجاز قریشی	۶۵
کھیل کھلاڑی	اولمپک مقابلے	رانا محمد شاہد	۸۵
گوشۂ ممکنات	حساب ہر لمحے کا/سیلف ٹریکنگ	عاطف مرزا	۹۰
آپ بات کرتے ہیں	سروے وہ کتاب جس نے مجھے متاثر کیا	قارئین	۹۵
وراثت	ایک اہم مسئلہ جو کئی مسائل کی جڑ ہے	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۰۹
ہندوستان سے	بھارتی مسلمانوں کی آنکھوں میں آنسو	تنویر قیصر شاہد	۱۱۱
شاعر کی آپ بیتی	من کہ ایک شاعر، دلچسپ تحریر	مقبول حسین کانجو	۱۱۴
غالب نامہ	اشعارِ غالب - جو کتابوں کے نام بنے	غلام حسین میمن	۱۲۹
اتفاق یا حسن اتفاق	۴/۴ کا ہندسہ، اتفاقات کی حیرت انگیز دنیا	حبیب اشرف صبوحی	۱۳۴
سانحۂ گیاری	وعدے سانس لیتے ہیں	میجر عاطف مصطفیٰ	۱۵۶
اُمید کہانی	سلاخوں کے پیچھے	عالیہ فاطمہ	۲۰۱
انگریزی کہانی	جھینگر اور چیونٹی	سید شفقات احمد ساجد	۲۰۷
سچی کہانی	کھلا دل خالی ہاتھ	فرحان بٹ ولایت	۲۱۱
دلچسپ کہانی	انتخاب	سید سلیم گردیزی	۲۱۵
امریکی کہانی	معجزہ	حافظ محمود ترمذی	۲۱۷
المناک کہانی	تمھیں کیسے کہوں	ثریا خانم	۲۲۰
بیتے دن	وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا	ڈاکٹر ندیم اکرام	۲۲۳
جاپانی اہلِ وفا	پاکستان سے محبت کرنے والے ۲ جاپانی	سید احسان اللہ وقاص	۲۲۵

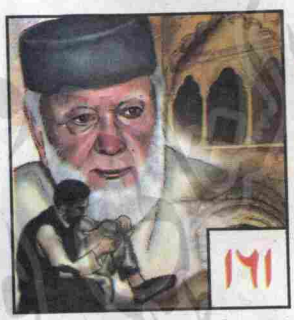

جھروکے

آسائشوں کی کثافت سے گہنائے ایک گھر کا المیہ

بشریٰ رحمٰن

۱۶۱

جنگلی لڑکی

ایک مظلوم بچی کی چشم کشا داستان

جواد گیلانی

۱۸۸

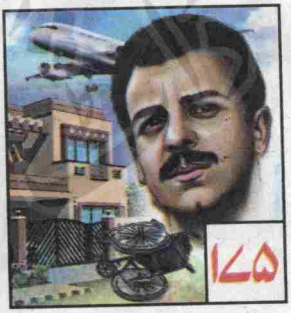

کمرے

بنتے بستے گھر کا المناک ماجرا

نیلم احمد بشیر

۱۷۵

کے ٹو پر موت وحیات کی کشمکش

دنیا کی ۱۴ چوٹیاں سر کرنے والی دوبیا کا سچا واقعہ

ندیم اصغر

۱۹۵

چشم کشا رپورٹ	جہاں گھروں میں بیٹیاں نہیں ملتیں	نعیم احمد	۲۲۸
پھلوں کا بادشاہ	آم۔ کئی بیماریوں میں مفید	حکیم قاضی ایم اے خالد	۲۴۱
نیا سلسلہ	ایک بار ایسا ہوا، یادگار واقعات	فریدہ خانم	۲۴۴
دو رنگ	قرطبہ سے اجمیر تک	نوید اسلام صدیقی	۲۴۹
مستقل سلسلہ	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں	۲۵۷
انعامی مقابلہ	قصہ کوئز، دلچسپ سوال وجواب	ادارہ	۲۶۶
موضوع سخن	ولی۔ چور۔ مکار	وصی شاہ	۲۶۸
یادِ رفتگان	ایسے عظیم لوگوں کا اب قحط پڑنے لگا ہے	الطاف حسن قریشی	۲۸۱
اسلامی کوئز	بوجھیں تو جانیں	ادارہ	۲۸۸
چمن خیال	گلے، شکوے، باتیں اور مشورے	قارئین	۲۸۹
مستقل کالم	دیدِ دل پہ دستک	اختر عباس	۲۹۳

کچھ اپنی زباں میں

اداریہ

خود ساز مگر داغدار وزیراعظم

سید یوسف رضا گیلانی آئین سے زیادہ اپنی پارٹی سے وفاداری نبھاتے ہوئے عدالتِ عظمیٰ کے ہاتھوں اقتدار سے محروم ہوگئے تاہم پاکستان میں جمہوری قوتوں کے لیے یہ اَمر خوشی کا باعث ہے کہ نئے وزیراعظم کا انتخاب کسی قدر حسن و خوبی سے انجام پا گیا۔ بوٹوں کی آواز سنی گئی نہ اسمبلی کی تحلیل کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ الگ بات کہ نئے وزیراعظم کے انتخاب پر ابھی تک عوام سکتے کی حالت میں ہیں اور اپنی بدنصیبی اور بے چارگی پر خاموشی سے ماتم کناں ہیں۔ البتہ انھیں جمہوریت کی اس خوبی اور خوبصورتی سے کسی قدر اطمینان حاصل ہوا ہوگا کہ راجہ پرویز اشرف جن کا تعلق درمیانے طبقے سے ہے اور جو سیاست میں ایک عام کارکن کے طور پر برسوں کام کرتے آئے اور اپنی محنت سے آگے بڑھے ہیں، وہ آج وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہیں۔ وہ چونکہ گراس روٹ سے آئے ہیں اس لیے اُن سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ عوام کے بنیادی مسائل اُن کی اوّلین ترجیحات میں شامل ہوں گے اور اُن کے دامن پر الزامات کے جو داغ لگے ہیں وہ انھیں دھونے اور اپنا امیج بہتر بنانے کی پوری سنجیدگی سے کوشش کریں گے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ بارِ امانت کامل ذمے داری سے اُٹھائیں اور قوم کو شفاف انتخابات کی منزل تک پہنچانے میں ایک مثبت کردار ادا کریں۔

اس حقیقت میں ذرہ برابر شک نہیں کہ پیپلز پارٹی کی زیرِ قیادت حکومت کی سوا چار سالہ کارکردگی

تصور سے کہیں زیادہ مایوس کن رہی اور یہ پورا عرصہ پاور پولیٹیکس کی زلفِ پُر پیچ سے کھیلتے اور رقیبانِ روسیاہ سے لڑتے جھگڑتے گزرے ہیں جس کے باعث سب سے زیادہ منفی اثرات عوام کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی صحت پر مرتب ہوئے ہیں اور ان کے لیے سکھ کا سانس لینا دوبھر ہو چکا ہے۔ اس اعتبار سے راجہ پرویز اشرف کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہی ہوگا کہ وہ فوری طور پر عام آدمی کو کیا ریلیف دے سکتے ہیں۔ اس وقت قدرتی وسائل سے مالا مال پاکستان کے شہری ۲۰، ۲۰ گھنٹوں کی بجلی کی لوڈشیڈنگ سے بلبلا اُٹھے اور اُن کے کاروبار ٹھنڈے پڑتے جا رہے ہیں۔ بجلی کی قلت سے پانی کی فراہمی میں بھی خلل پڑتا جا رہا ہے اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ مختلف شہروں اور قصبوں میں میت کو غسل دینے کے لیے بھی پانی میسر نہیں۔ اس خوفناک اور سنگین مسئلے کا خالق تو وہی شخص ہے جو اب پاکستان کا وزیراعظم ہے۔ لوگوں کے اندر لاوا اُبل رہا ہے کہ صدر زرداری نے اُن کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے ''راجہ رینٹل'' کو ہم پر مسلّط کیا اور ہماری بے بسی کا منہ چڑایا ہے۔ عوامی احساسات کی اس تپش میں ہمارے نئے وزیراعظم کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ صدر زرداری کے نوکر کے بجائے عوام کے خادم ہیں اور اس بار وعدوں کی چکاچوند سے کام لینے کے بجائے بجلی کی پیداوار میں اضافے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں گے۔ اگر انھوں نے ماضی کے تجربات سے واقعی کچھ سیکھا ہے تو انھیں عوام کی مشکلات کم کرنے کے لیے جنگی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔

عوام کے اندر اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے لیے راجہ صاحب کی طرف سے پہلی فرصت میں اپنے اور اپنے قریبی رشتے داروں کے اثاثوں کا اعلان بہت سودمند ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ انھیں سادگی اور کفایت شعاری کا عملی ثبوت دینا چاہیے۔ اُن کی طرف سے یہ اعلان بھی آجانا چاہیے کہ وہ اربوں کے صوابدیدی فنڈز سے دستبردار ہوتے ہیں اور عالیشان وزیراعظم ہاؤس کے بجائے نہایت کم خرچ رہائش کو ترجیح دیں گے۔ ان عملی اقدامات سے مایوس اور دل شکستہ اہلِ وطن میں اُمید کی قندیلیں روشن کی جاسکتی ہیں۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب وہ صدر زرداری کے کالے جادو سے باہر آئیں، پارلیمنٹ کے اندر اور باہر جو سیاسی قوتیں ہیں ان کے ساتھ حقیقی رشتے قائم کریں اور پارلیمانی روایات اور مزاج کے مطابق حکومت کے معاملات سرانجام دیں۔ سید یوسف رضا گیلانی نام کے وزیراعظم تھے اور حکومت آصف علی زرداری چلا رہے تھے، اس لیے سوا چار سال کی تمام تر ناکامیاں صدرِ مملکت کے حصے میں آتی ہیں اور آئندہ بھی انھی کے حصے میں آئیں گی۔ اگرچہ اٹھارھویں اور بیسویں آئینی ترامیم کے ذریعے ان کے اختیارات بہت محدود ہوگئے مگر پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین کی

حیثیت سے وہ تمام سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ وزیراعظم کا تقرر بھی وہی کرتے ہیں اور کابینہ کی تشکیل بھی انھی کا صوابدیدی اختیار ہے۔ ہمارے ہاں پارلیمانی اصولوں کے خلاف جو حکومت چل رہی ہے، اُس میں پارلیمنٹ، وزیراعظم اور اس کی کابینہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس خطرناک صورتِ حال کی تبدیلی کے لیے تمام سیاسی جماعتوں کو یکجا ہو کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ صدر صاحب اس مرتبہ بھی سوئس عدالتوں میں اپنے خلاف منی لانڈرنگ کے مقدمات بند رکھنے کے لیے ایک اور وزیراعظم قربان کردیں گے اور نعرہ یہ لگائیں گے کہ محترمہ کی قبر کے ٹرائل کی ہم کسی صورت اجازت نہیں دیں گے۔

صدر زرداری کے مانند وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کا دامن بھی آلایشوں سے داغدار ہے۔ اس لیے ان سے کسی بڑے کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ وہ اپوزیشن کے ساتھ ایک بامقصد مکالمے کے ذریعے وقت سے پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا عمل تیز کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے چیف الیکشن کمشنر کی تقرری کے لیے قائد حزبِ اختلاف سے مشاورت جلد سے جلد مکمّل کی جائے اور غیر جانب دار عبوری حکومت کے قیام کو غیر معمولی اہمیت دی جائے۔ وقت سے پہلے انتخابات کا مطالبہ بیشتر سیاسی جماعتوں کے علاوہ قانون دانوں کی تنظیمیں بھی کر رہی ہیں اور بلوچستان کے خون رنگ حالات بھی اسی امر کے متقاضی ہیں۔

ایک نئے مینڈیٹ کے ساتھ ایک نئی قیادت سامنے آئے گی جو حالات میں خوشگوار تبدیلی لانے کے لیے تازہ دم اور پُرعزم ہوگی۔ اس معاملے میں اپوزیشن جماعتوں پر بھی بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اُن کے قائدین جو آپس میں اُلجھتے رہتے ہیں، وہ سخت لہجے میں نازیبا الزام تراشیوں سے اجتناب کریں اور باہمی احترام کا کلچر اپنائیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ اگر عمران خان، میاں نواز شریف، سید منور حسن اور سندھ اور بلوچستان کے محبِ وطن قوم پرست لیڈر ایک اسٹیج پر جمع ہوجائیں تو انتخابات کے ذریعے ایک مضبوط، تیز گام اور بلند مقاصد سے ہم آہنگ حکومت وجود میں آسکتی ہے جس میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن بھی اپنی گہری سیاسی بصیرت کے ذریعے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی اپنی ایک سیاسی حیثیت ہے جس کا احترام ضروری ہے۔ ہمارے نئے وزیراعظم اگر ثابت قدمی کے ساتھ جلد انتخابات کی طرف قدم بڑھاتے جائیں تو عدالت عظمیٰ بھی انھیں زیادہ سے زیادہ مہلت دینے کی پالیسی پر گامزن ہوگی یوں وہ تاریخ میں اپنا نام لکھوانے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں۔

الطاف حسن قریشی

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا

میری اُمت کے تمام لوگ شہداء کے گھرانوں کے کفیل اور سرپرست ہیں۔ (بخاری و مسلم)

شہدائے اسلام فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

امت مسلمہ پر عائد فرض کی ادائیگی اور ہزاروں شہداء کے گھرانوں کی خدمت کے لئے ہمہ وقت مصروف عمل ہے

آیئے .....! آپ بھی اس دینی و اخلاقی فرض کی ادائیگی کے لیے فاؤنڈیشن کے ہاتھ مضبوط کیجئے۔

اپیل

شہداء کے گھرانوں کے کفیل بنیئے

- بچوں کے لیے تعلیمی وظائف کا اہتمام
- شہداء کے بچوں کی شادی کے اخراجات میں تعاون
- دشمن کی قید میں اسیران کی مدد
- مکانات کی تعمیر کے لیے عطیات
- شہداء کے ذمہ واجب الادا قرض کی ادائیگی کے لیے تعاون
- عیدالفطر کے موقع پر تحائف کا اہتمام
- عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کا اہتمام
- رمضان المبارک میں شہداء کے گھرانوں کے لیے "رمضان راشن پیکیج" کا اہتمام

سرپرست: سید منور حسن

چیئرمین: لیاقت بلوچ

سیکرٹری جنرل: نذیر احمد جنجوعہ

نقد عطیات مقامی دفتر میں جمع کروا کر رسید حاصل کیجئے یا چیک، ڈرافٹ، منی آرڈر کی شکل میں براہِ راست ہمیں ارسال کیجئے۔

BANK AL-HABIB LTD.

Awami Complex, New Garden Town Lahore - Pakistan Pak Rupee Account 081001112019

منصورہ ملتان روڈ، لاہور

فون: +92 42 35410787,35425188 فیکس: +92 42 35425188

ای میل: sifpak@hotmail.com, sifpak@gmail.com ویب سائٹ: www.sif.org.pk

تجزیہ

ہم کہاں کھڑے ہیں

اچھی تبدیلیوں کے آثار

حالات کے خشمگیں تیور اس حقیقت کی طرف اشارے کر رہے ہیں کہ بدی کی طاقتیں جو بہت منہ زور ہو چکی ہیں،
اُن کے خلاف ایک طاقتور تحریک نئی تبدیلیوں کا پیامبر ثابت ہوگی
عوامی تحریک پاکستان کو ایک نئی جہت اور ایک نئی عظمت عطا کرے گی
مستقبل میں جھانکنے والی تحریر، الطاف حسن قریشی کے قلم سے

اِس

وقت اندھیرے بہت گہرے ہیں اور انسان کو انسان سجھائی نہیں دے رہا، مگر گزشتہ چند ماہ سے ہماری قومی زندگی میں جو تحیّر خیز واقعات رونما ہوئے ہیں، اُن سے اس یقین کو بڑی تقویت ملی ہے کہ اچھے دن آنے والے ہیں اور وہ سحر طلوع ہونے کو ہے جس سے پورا شبستانِ وجود لرزا اُٹھے گا اور ایک جہانِ تازہ آباد ہوگا۔

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا سوا چار سالہ عہد ہماری ۶۵ سالہ زندگی میں کرپشن اور سازشوں کے حوالے سے بدترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل پاکستان (ٹی آئی پی) کے سربراہ جناب عادل گیلانی نے گزرے ہوئے حوادث کی جو تصویر کشی کی ہے، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے اور اس احساس کی تمازت میں

غیر معمولی اضافے کا باعث بنی ہے کہ پاکستان کو گزشتہ ۵۰ مہینوں میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ٹی آئی پی کے مطابق صرف ۳ شعبوں میں یومیہ ۵ ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ جو ۵۰ مہینوں میں ایک ہزار ارب تک پہنچ گیا ہے۔ بدعنوانیوں کے مواقع پیدا کرنے اور احتساب کی گرفت سے بچنے کے لیے اس عرصے میں اسٹیٹ بینک کے ۴ گورنر، ۴ وزرائے خزانہ، ۶ سیکرٹریز، ایف آئی اے کے ۱۰ ڈائریکٹر جنرل، نیب کے ۳ چیئرمین تبدیل کیے گئے۔ اس کے علاوہ قانون کے وزراء، سیکرٹریز اور اٹارنی جنرل یکے بعد دیگرے بدلے جاتے رہے۔ وفاقی محتسب کا ادارہ جو شہریوں کو آسان طریقوں سے انصاف مہیا کرتا رہا ہے، وہ گزشتہ ۲۰ مہینوں سے اپنے سربراہ سے محروم چلا آ رہا ہے۔ لامحدود اور ہوشربا حکومتی اخراجات اور ادائیگیوں میں عدم توازن کا یہ عالم ہے کہ اندرونی اور بیرونی قرضوں کا حجم گیلانی دورِ حکومت میں چھ ہزار سات سو ارب سے بڑھ کر ۱۲ ہزار ارب تک جا پہنچا ہے۔

ملکی معیشت کو ضعف پہنچانے والے فیصلے، جناب یوسف رضا گیلانی نے اقتدار میں آتے ہی صادر کرنا شروع کر دیے تھے۔ ایمنسٹی کی ایک اسکیم کے تحت حکومت نے اعلان کیا کہ ۲ فیصد ٹیکس ادا کر کے پیسا وائٹ کرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ۳۵۰ ارب کا کالا دھن ملکی معیشت میں انجیکٹ کر دیا گیا جس سے باقاعدہ ٹیکس ادا کرنے کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ سرکاری تحویل میں چلنے والے نفع بخش اداروں میں نااہل، خائن اور کام چور افراد کی تقرری سے قومی خزانے کو کھربوں کا نقصان پہنچا ہے۔ وزیراعظم گیلانی سے پہلے پاکستان اسٹیل ۱۱ ارب کا منافع کمار ہا تھا، مگر اب اسے ۱۲۰ ارب خسارے کا سامنا ہے اور یہی حال پی آئی اے، ریلویز، نیشنل بینک آف پاکستان، شمالی اور جنوبی گیس کارپوریشنز، او جی ڈی سی اور پی ایس او کا ہے۔ معیشت کا جہاز ڈگمگا رہا ہے اور کرپشن جج کے انتظامات میں اس درجے داخل ہو گئی تھی کہ حجاج کرام اپنے حکمرانوں کے لیے جھولیاں بھر کر بددعائیں مانگنے پر مجبور تھے۔ ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق گیلانی حکومت نے ایک سازش کے ذریعے بجلی کی مصنوعی قلت پیدا کی۔ ۲۰۰۸ء میں لوڈشیڈنگ صرف ۴ گھنٹے کی تھی جو ۲۰۱۲ء میں ۱۲ سے ۱۸ گھنٹوں تک پہنچ گئی ہے۔ سپریم کورٹ نے ۳۰ مارچ ۲۰۱۲ء کو اپنے فیصلے میں لکھا کہ ملک میں بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی، مگر گردشی قرضوں پر قابو پانے کے بجائے بھکی اور شرقپور میں رینٹل پاور پلانٹس نصب کرنے پر اربوں خرچ کر دیے گئے۔ فاضل عدالت نے رینٹل پاور پلانٹس کے سلسلے میں متعلقہ کمپنیوں سے اربوں روپے وصول کیے اور یہ بھی حکم دیا کہ ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء اور اس کے بعد جو سرکاری حکام اور وزرائے کرام ان منصوبوں پر کام کرتے رہے ہیں، ان کے خلاف نیب دیوانی اور فوجداری تحقیقات کرے۔ ان وزرائے کرام میں جناب راجہ پرویز اشرف بھی شامل تھے۔ ٹی آئی پی کے سربراہ عادل گیلانی نے اپنی رپورٹ میں میمو گیٹ کا بطورِ خاص ذکر کیا جو فوج کے خلاف گیلانی حکومت نے سازش تیار کی تھی۔ ان تمام بدعنوانیوں اور سازشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹ جون کی سہ پہر

وزیراعظم سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق نااہل قرار پائے اور یوں تبدیلیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے جو بڑھتا ہی جائے گا اور بڑے بڑے برج گرتے نظر آئیں گے۔ بداعمالیوں کا یومِ حساب نادان وزیراعظم کی طرف سے فوج، عدلیہ اور عوام کے ساتھ طاقت آزمائی کے نتیجے میں آیا ہے۔

☆☆☆

پیپلز پارٹی جس کی سرشت میں فوج اور عدلیہ کے خلاف تحفظات پیوست ہیں، اس نے اپنے حالیہ دورِ حکومت میں ان دونوں اداروں سے عداوت کا گاہے گاہے اعلانیہ گاہے خفیہ طور پر مظاہرہ کیا۔ فوج کی طاقت کم کرنے کے لیے امریکا سے ملی بھگت کر کے کیری لوگر بل اور میمو گیٹ بروئے کار لائے گئے۔ اس گہری کدورت کا اس وقت انتہائی دلخراش انداز میں اظہار ہوا جب امریکا نے چوروں کی طرح ایبٹ آباد آپریشن کیا اور ہماری عسکری صلاحیت اور قومی وقار پر کاری ضرب لگائی، تو اس ہولناک واقعے کو جناب صدر زرداری نے 'تاریخی فتح' قرار دیا۔ سلالہ چیک پوسٹ پر نیٹو افواج کی طرف سے وحشیانہ حملے پر فوجی قیادت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے عوام کی بھرپور تائید سے امریکا کے خلاف ایک مضبوط اور نڈر موقف اختیار کیا، لیکن آج دونوں ملکوں میں باہمی تعلقات جو شدید کشیدگی کا شکار ہیں، وہ پیپلز پارٹی کی بے بصیرتی اور غیر سنجیدگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اس نے فوج کے ساتھ اپنی بقا کے لیے تو سمجھوتہ کر لیا ہے، مگر عدلیہ کو آنکھیں دکھانے کا جو سلسلہ روزِ اوّل سے جاری تھا، اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ ایک آزاد اور جرأت مند عدلیہ اس کے سیاسی عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ جنرل مشرف نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کی ایمرجنسی کے بعد چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی سربراہی میں جو عدالتِ عظمیٰ قائم کی تھی، اُس نے شریف برادران کے خلاف بدنیتی پر مبنی فیصلے دیے اور وفاقی حکومت نے پنجاب میں مسلم لیگ نون کی حکومت ختم کر کے گورنر راج نافذ کر دیا۔ اس غیر قانونی اقدام کے خلاف عوام سڑکوں پر نکل آئے اور اسی رو میں عدلیہ بحالی کی تحریک لانگ مارچ کی شکل اختیار کر گئی جس کی قیادت بطلِ حریت جناب محمد نواز شریف کر رہے تھے۔ ۱۶ مارچ ۲۰۰۹ء کی صبح وزیراعظم نے ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے جج صاحبان بحال کر دیے، مگر پیپلز پارٹی کی نفسیات میں آزاد عدلیہ کے خلاف جو رجحانات پائے جاتے ہیں، وہ مختلف صورتوں میں اور مختلف موقعوں پر ظاہر ہوتے رہے۔

☆☆☆

فاضل چیف جسٹس جناب افتخار چودھری نے بحالی کے بعد نو دولتیوں، کرپٹ افسروں، بے لگام حکمرانوں اور سیکورٹی کے خود سر عناصر پر ہاتھ ڈالنا شروع کیا اور اُنہیں قانون کے دائرے میں لانے کے لیے اپنی اَن تھک اور پُرعزم کوششیں جاری رکھیں۔ عدالتِ عظمیٰ نے جب احتساب کا عمل شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ عوام کے کھربوں روپے ضائع کیے اور لوٹے جا رہے ہیں اور توانائی کے اسٹریٹیجک اور نفع بخش اداروں کی سربراہی

میٹرک پاس لوگوں کو بخشی جا رہی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کے ۱۷ رکنی بینچ نے دسمبر ۲۰۰۹ء میں این آر او کو حکومت کی استدعا پر خلافِ آئین قرار دیا اور ایگزیکٹو اتھارٹی کو اس امر کا پابند کیا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے حکام کو یہ خط لکھے کہ ان کی عدالتوں میں جو مقدمات منی لانڈرنگ کے حوالے سے چل رہے تھے، ان میں پہلے کی طرح پاکستان کو ایک پارٹی بنایا جائے۔ حکومت نے ۳ برس حیلے بہانوں میں گزار دیے اور عدلیہ کو زِچ کرنے کے لیے بار بار پینترے اور وکیل تبدیل کیے جاتے رہے۔ ۲۶ اپریل ۲۰۱۲ء کے بعد سازشی عناصر عدالتِ عظمیٰ پر مختلف اطراف سے پوری قوت سے حملہ آور ہوئے۔ اسی روز عدالتِ عظمیٰ کے ۷ رکنی بینچ نے وزیراعظم کو توہینِ عدالت کے جرم میں ۳۰ سیکنڈ کی سزا دی تھی اور اپنے فیصلے میں آئین کی جس شق کا حوالہ دیا تھا، اُس کی رو سے وہ نااہل ہو چکے تھے، مگر بیرسٹر اعتزاز احسن جو کبھی لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے، وہ صراطِ مستقیم سے ہٹتے گئے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ جناب یوسف رضا گیلانی جیل میں رہ کر بھی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز رہ سکتے ہیں اور اپنے علم اور ذہانت کے غرور میں وزیراعظم کو سزا کے خلاف اپیل بھی کرنے نہیں دی اور وہ یوں وزیراعظم کے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ بدقسمتی سے قومی اسمبلی کی اسپیکر ڈاکٹر فہمیدہ مرزا جو ملک میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور جنھوں نے بڑے وقار کے ساتھ قومی اسمبلی کے معاملات چلائے تھے وہ بھی اُن کی فطانت کے جال میں پھنس کر فاضل عدالت کے فیصلے کے خلاف رولنگ دے بیٹھیں اور یوں پارلیمنٹ کو عدالت کے مدِمقابل کھڑا کرنے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔

آخری تار پیڈو جناب ریاض ملک نے فائر کیا جو پیپلز پارٹی کے دور میں بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے اچانک یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ وہ فاضل چیف جسٹس کے صاحبزادے ارسلان کو اپنے حق میں عدالتی فیصلے حاصل کروانے کے لیے ۴۲ کروڑ خرچ کر چکے ہیں۔ اِس مہم جوئی کا مقصد فاضل چیف جسٹس کی دیانت اور اخلاقی حیثیت کو متنازع بنانا' عدالتِ عظمیٰ کا وقار مجروح کرنا اور اُسے دوررس نتائج کے حامل مقدمات میں آزاد اور بے خطر فیصلوں سے باز رکھنا تھا جو اُس کے زیرِ سماعت تھے۔ فاضل چیف جسٹس نے ہر قسم کے دباؤ کو خاطر میں لائے بغیر اپنے بیٹے کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ ملک ریاض نے عدالت میں جو بیان داخل کرایا، اس میں یہ اعتراف موجود تھا کہ اُن کے داماد نے یہ خطیر رقم انصاف خریدنے کے لیے خرچ کی ہے۔ اُن کی اس مہم جوئی کا بھانڈا اس انٹرویو میں سرِبازار پھوٹ گیا جو اُنھوں نے ایک نجی نیوز چینل کو دیا۔ اس انٹرویو کے غیر رسمی حصے یوٹیوب اور بعد میں الیکٹرونک میڈیا پر دکھائے گئے تو ثابت ہو گیا کہ اس کے پیچھے حکومت کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور وہ عدلیہ کو بدنام کرنے کی ایک خوفناک سازش بروئے کار لائی جا رہی تھی۔ ملک ریاض کا یہ دھماکا دراصل ایک خودکش حملہ ثابت ہوا اور اُن کی عظمت و شوکت کا ہرا بھرا باغ بادِصرصر کی زد میں آ کر ایک ہی رات میں اُجڑ چکا تھا۔

☆☆☆

عدالتِ عظمیٰ نے ۱۹ جون کی سہ پہر جناب گیلانی کو نااہل قرار دے دیا اور جمہوریت کے خلاف سازش کرنے والے تمام دق زدہ چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں۔ بیرسٹر اعتزاز احسن کا داخلہ ملک بھر کی بہت ساری بار ایسوسی ایشنز میں بند ہے اور فطری ردِعمل کے طور پر کوئی صاحبِ ضمیر وکیل ملک ریاض کے خلاف توہینِ عدالت کے مقدمے میں پیش ہونے کے لیے تیار نہیں۔ فاضل عدالت نے بڑی جرأت اور بالغ نظری سے ایک تاریخ ساز فیصلہ صادر کیا اور پیپلز پارٹی کی قیادت نے اسے بے دلی سے تسلیم کر کے بظاہر سسٹم کو بچا لیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک طرف عدالتِ عظمیٰ میں اٹارنی جنرل عرفان قادر کے گستاخ طرزِعمل کا سخت محاسبہ کیا جائے اور دوسری طرف جناب یوسف رضا گیلانی کے خلاف اقتدار پر غیر آئینی طور پر قبضہ جمائے رکھنے اور آئین سے بغاوت کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ اُنہوں نے قومی خزانے سے جو رقوم خرچ کی ہیں اور سزایافتہ ہونے کے باوجود لندن کے دورے پر جو لاکھوں پاؤنڈ لُٹائے ہیں ان کا پورا پورا حساب لیا جائے اور وہ ملکی خزانے میں جمع کرائے جائیں۔ قوم کو عدلیہ کا فیصلہ مبارک کہ وہی اس عمرانی معاہدے کی محافظ ہے جو ۱۹۷۳ء کے آئین میں ریاست اور شہریوں کے درمیان طے پایا تھا۔ فاضل چیف جسٹس اپنی عظمتِ کردار سے ایک عظیم قوت بن کر اُبھرے اور ریاست کے استحکام اور قانون کی حکمرانی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان پر جو سوا چار سال تک اندھیر نگری اور چوپٹ راج کے جو فتاک مناظر اُبھرتے رہے اُن میں صدر آصف زرداری کے علاوہ مخلوط حکومت میں شامل سیاسی جماعتوں کا ایک بہت بڑا مجرمانہ کردار ہے۔ اُنھوں نے ہر غلط کام اور ہر ناجائز خواہش میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا اور چند وزارتوں اور چند اربوں کے لیے ملکی مفادات سے بے وفائی کی۔ فوج کے خلاف مہم جوئی کا منصوبہ ہو یا عدالتِ عظمیٰ کا وقار تار تار کرنے کا داعیہ، یا عوام پر مہنگائی کی بجلی گرانے کا شاخسانہ، اتحادی جماعتوں نے وزیراعظم یا صدر کا سیاسی نیازمندوں کی طرح بے چون و چرا ساتھ دیا، کیونکہ بدعنوانی، لوٹ کھسوٹ اور اپنے دائرۂ اختیار کو وسعت دینے کا ایک مشترکہ ایجنڈا تھا اور اس پر کامل یکسوئی سے عمل ہوتا رہا۔ عوام کی چیر پھاڑ کے اس خونخوار کاروبار میں ان تمام جماعتوں کی ساکھ بُری طرح متاثر ہوئی ہے اور اُن کے لیے انتخابات میں عوام کے سامنے آنا اور اُن سے ووٹ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔ پیپلز پارٹی کا یہ بھرم کہ وہ پاکستان کی سب سے بڑی جماعت ہے اور اس میں قابل اور نابغہ روزگار لوگوں کی فراوانی ہے' اس ایک حادثے سے پاش پاش ہو گیا ہے کہ وزارتِ عظمیٰ کے لیے حضرت آصف زرداری نے جو ۲ نام تجویز کیے' وہ سنگین الزامات کی زد میں تھے اور سپریم کورٹ نے اُن کے خلاف تحقیقات اور گرفتاری کے احکام جاری کر رکھے تھے۔ ایم کیو ایم جو ہر بحران کے وقت حکومت کا ساتھ دینے کی قیمت اور شرائط میں اضافہ کرتی رہی، اس کا امیج ایک مصلحت کوش اور ناقابلِ اعتبار پارٹی کے طور پر اُبھرا

ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں کراچی اور دوسرے شہروں میں ایک بے تعلقی بڑھتی جارہی ہے اور کارکن عوام کے غضب کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اے این پی ہر نوع کی بدعنوانیوں میں لت پت ہے اور اس نے ہر ظلم اور عدلیہ کے ساتھ ہر چپقلش میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا ہے، جس کے سبب اس کا تاریخی ورثہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ قاف لیگ حکومت میں جناب مونس الٰہی کو احتساب کے شکنجے سے بچانے کی خاطر شامل ہوئی تھی اور نئے وزیراعظم کے انتخاب کے موقع پر اس کی تمام تر دلچسپی کا مرکز ایک ہی نقطہ تھا کہ ان کے علاقے سے کوئی دوسرا شخص وزیراعظم نہ بننے پائے اور جناب پرویز الٰہی کو ڈپٹی وزیراعظم کا منصب حاصل ہوجائے۔ یہ سب لوگ تاریخ اور اپنے وطن کے بہت بڑے مجرم ہیں جن کے بارے میں رائے عامہ کی بیداری وقت کی سب سے بڑی ضرورت بنتی جارہی ہے۔

☆☆☆

جناب شہباز شریف جو حکمرانوں کو علی بابا چالیس چور کے لقب سے پکارتے ہیں، وہ دراصل اپنے وطن میں چوری اور سینہ زوری کی ایک سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے اس تجزیے میں بھی ایک صداقت محسوس ہوتی ہے کہ اس ٹولے سے نجات پائے بغیر عوام سکھ چین سے نہیں رہ سکتے اور ملک سلامتی اور ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ اس مرحلے میں جمہوری طریقے سے تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے کے لیے مشترکہ سیاسی جدوجہد لازمی ہے، میاں صاحب نے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے منصورہ میں امیرِ جماعت اسلامی سید منور حسن سے ملاقات کرکے سیاسی تعاون کا دائرہ کسی قدر وسیع کیا۔ مسلم لیگ نون کی مرکزی قیادت کو مولانا فضل الرحمٰن سے بھی مکالمے کا سلسلہ آگے بڑھانا چاہیے۔ ان کے ذریعے متحدہ مجلسِ عمل کو فعال بنانے اور اسے مین اسٹریم میں نہایت مؤثر کردار کے لیے تیار کرنا کسی حد تک ناگزیر محسوس ہوتا ہے۔ اگر عمران خان اپنے حریف قائدین پر تنقید کرتے وقت سیاسی آداب کا لحاظ رکھیں، لن ترانیوں سے باز رہیں اور اپنے پُرجوش کارکنوں کو روک لیں، تو ظلم و جور کی بت شکنی کے لیے اُن سے بھی مذاکرات کیے جاسکتے ہیں۔ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ فسطائی رجحانات کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اور جمہوریت کے نام پر شخصیت پرستی اور اختیارات کی مرکزیت کی کیسی کیسی صورتیں جلوہ گر ہیں۔ بگاڑ اور بناؤ کی قوتیں آج پوری طرح بے نقاب ہوچکی ہیں اور اس نازک دوراہے پر تمام صحت مند عناصر کو آگے بڑھ کر اپنا تاریخی کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ وقت اَنا کے گنبد میں بند ہوجانے اور اپنی عظمت کا ساز چھیڑنے کا نہیں، بلکہ اپنے وطنِ عزیز کو آزمایشوں کے شکنجے سے باہر لانے اور مفاہمت کے نام پر دہری منافقت کو تار تار کرنے کا ہے۔

بگاڑ پیدا کرنے والے عوامل کے پہلو بہ پہلو بناؤ اور تعمیر کی طاقتیں بھی سرگرمِ عمل ہیں مگر وزیراعلیٰ پنجاب انقلابی تبدیلیوں کے سرچشمے تعمیر کررہے ہیں۔ ناقدین کو سنگ باری میں بہت مزہ آتا ہے مگر یہ ایک عظیم حقیقت

ہے کہ لیپ ٹاپ کی فراہمی سے نوجوانوں کا ذہنی افق تبدیل ہورہا اور اُن میں جدید علوم تک رسائی کا شوق پرورش پانے لگا ہے۔ اس تبدیلی کے حیرت انگیز اثرات جلد ہی معاشرے میں ظاہر ہونے لگیں گے۔ نوجوان نسل میں اگر سائنسی فکر اور سائنسی مزاج راسخ ہوجائے، تو ایک بہت بڑا علمی انقلاب ہمارے تعلیمی اداروں اور ہمارے گھروں پر دستک دے رہا ہوگا۔ لیپ ٹاپ کی مدد سے طالب علم ندرت خیال سے آراستہ ہوکر اپنی دنیا خود تعمیر کرنے کا خوگر ہوجاتا ہے اور حقیقی تبدیلی اسی کا نام ہے۔ جناب شہباز شریف نے لینڈ ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کرنے کا جو عظیم سلسلہ شروع کیا ہے، وہ زمینوں کے تنازعات اور بھاری بھاری رشوتوں کا ہولناک اور تباہ کن کاروبار ختم کرنے کا باعث بنے گا جو ہماری سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دے گا۔ جناب وزیراعلیٰ پورے ملک میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کا جو عظیم الشان پروگرام ترتیب دیتے ہیں، اس کے صحت مند اثرات پورے معاشرے کے اندر پھیلتے جارہے ہیں۔ اس کے ذریعے قومی یک جہتی کو بھی فروغ مل رہا ہے اور جوہرِ قابل بھی پیدا ہورہے ہیں۔ پنجاب کے علاوہ جنوبی وزیرستان اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں بھی تعمیر کے عجوبات رونما ہورہے ہیں، جن سے پاکستان کا چہرہ بڑی حد تک سدھر جائے گا۔

☆☆☆

تبدیلی کا جو عمل ہماری عدالتِ عظمیٰ کے ہاتھوں سرانجام پارہا ہے، اس کی بڑی جہتیں اور بہت سارے حوالے ہیں۔ فاضل چیف جسٹس نے ایک طرف اپنے بیٹے کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرکے اور دوسری طرف وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کو آئین کے مطابق اعلیٰ ترین منصب اور قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے نااہل قرار دے کر اس امر کا عملی مظاہرہ کیا ہے کہ قانون کے سامنے تمام شہری برابر ہیں۔ پہلی بار عدلیہ نے بڑے بڑے طاقتور افراد پر ہاتھ ڈالا اور احتساب کے عمل کو مستحکم بنیادیں فراہم کی ہیں۔ جناب یوسف رضا گیلانی، جن کا پورا خاندان یعنی بیگم، بیٹے، بیٹیاں اور بھائی سب بڑے سائنٹیفک انداز میں رشوت کا دھندا چلا رہے تھے، وہ توہینِ عدالت میں سزا پانے کے باعث ایوانِ اقتدار سے بہت بے آبرو ہوکر نکلنا پڑا اور یوں بدعنوان مافیاؤں کا ایک بہت بڑا سہارا ٹوٹ گیا ہے۔ اب یقینی طور پر بڑے بڑے مگرمچھ قانون کی گرفت میں آئیں اور قرار واقعی سزا پائیں گے۔ سابق وزیراعظم کے ایک صاحبزادے علی موسیٰ گیلانی جوایفی ڈرین کیس کے مقدمے میں پوری طرح ملوث ہیں، اُن کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوچکے ہیں۔ گزشتہ دنوں اے این ایف کی ٹیم نے اُن کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے، مگر وہ بار بار جگہ تبدیل کرنے سے وقتی طور پر گرفت میں آنے سے بچ گئے، مگر کب تک وہ ریاست کو فریب دیتے رہیں گے۔ اُن کے پرنسپل سیکرٹری جناب خوشنود لاشاری بھی اس مقدمے میں ماخوذ ہیں، وہ رخصت لے کر ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ ان سب کا بہت کڑا حساب ہوگا جو دوسروں

کے لیے سامانِ عبرت بنے گا۔ خوش قسمتی سے وکلاء برادری کی عظیم اکثریت عدلیہ کی پشت پر کھڑی ہے جس کے سبب آئین شکن عناصر، منہ زور اعلیٰ سرکاری افسر اور طیاروں میں اُڑنے والے نو دولتیے خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت وزیراعظم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے، عوام اس واقع سے بے تعلق دکھائی دیتے ہیں کیونکہ لالچ، خودغرضی اور تاریخ سے بے خبری کا وہی عالم ہے جو پہلے تھا۔ اُن کی امید کا مرکز آزاد عدلیہ، آزاد میڈیا، منظم اور بیدار سول سوسائٹی ہے۔ آنے والے وقتوں میں جوں جوں غرور و نخوت کے بت گرتے جائیں گے، جمہور کی سلطانی کا زمانہ قریب آتا جائے گا۔ ہمارے عہد کے فرعون، ہامان اور شداد اپنے انجام کے تصور سے لرزہ براندام ہیں کہ عوام اپنی تقدیر خود لکھنے کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئے ہیں۔ بجلی، گیس اور پانی کی قلت اور گرانی اور بے روزگاری کے عفریت نے اُنہیں اندیشۂ سود و زیاں سے بالاتر کر دیا ہے۔ اُنہیں اپنے ووٹ کی قدر و قیمت کا احساس ہو چلا ہے، وہ اپنا نام رائے دہندگان کی فہرست میں درج کرانے اور اس کے ذریعے ایک نرم انقلاب لانے کا عہد کر چکے ہیں۔ سوشل میڈیا نے اُن کے رگ و پے میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ وہ اب لغاریوں، گیلانیوں، مخدوموں، زرداریوں، ملکوں، سرداروں، نوابوں اور رئیسانیوں کا غلام بن کر زندگی بسر کرنا ہرگز نہیں چاہتے۔

ہماری عدالتِ عظمیٰ نے فرد کی آزادی، انسانی حقوق کے تحفظ اور قانون کی بالادستی کا جو صور پھونک دیا ہے اس کے باعث غلامی کی زنجیریں کٹتی جا رہی ہیں اور گند صاف ہو جانے کے ایقان افزا امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی شہرۂ آفاق مسدس میں برصغیر کے مسلمانوں کی پستی کی جو تصویر کشی کی تھی اس نے سرورِ دو عالم ﷺ کی اُمت میں زندگی کی حرارت پیدا کی تھی اور آزادی کی جوت جگا دی تھی۔ آج راجہ پرویز اشرف کے وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو جانے سے ہمارا اجتماعی ضمیر چیخ اُٹھا اور عامۃ الناس میں ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا جذبہ اُمڈ آیا ہے۔ اب حالات جوں کے توں نہیں رہ سکتے اور بلندی کی طرف سفر کا آغاز یقینی ہوتا جا رہا ہے۔ گندے خون کے اخراج سے جسم توانا اور اُمنگوں کا مرکز بن جاتا اور فساد کھولنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ عدلیہ اور عوام کا منہ چڑانے سے اس عمل میں تیزی آتی جائے گی اور بجلی فرعون صفت اربابِ اختیار کے آشیاں پر گر کر رہے گی کہ فطرت کا یہی فیصلہ ہے جو متکبر لوگوں کی خطائیں معاف نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حکومت پاکستان، پاکستان بیت المال
پرائم منسٹر سیکرٹریٹ

پاکستان سویٹ ہوم کیلئے کرایہ پر جگہ درکار ہے

ایک وفاقی خودمختار ادارے (پاکستان بیت المال) کے تحت پنجاب کے ضلع اوکاڑہ تحصیل دیپالپور میں شفقت پدری سے محروم بچوں کے لئے ''پاکستان سویٹ ہوم'' قائم کیا جا رہا ہے۔ مجوزہ سنٹر کے لئے تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ میں مناسب بلڈنگ جس میں 100 بچے اور تقریباً 15 سٹاف ممبرز با آسانی رہائش پذیر ہو سکیں، کرایہ پر درکار ہے۔ مجوزہ بلڈنگ تقریباً آٹھ ہزار مربع فٹ کوورڈ ایریا، تقریباً 20 عدد کشادہ کمروں ترجیحاً جن کے ساتھ اٹیچڈ باتھ رومز ہوں اور 1 بڑا ہال، کشادہ کچن اور سٹورز پر مشتمل ہو۔ اور عمارت میں مناسب لان پر مشتمل ہو۔

خواہشمند افراد، پارٹیاں مندرجہ ذیل دستاویزات کے ساتھ نیچے دیئے گئے پتہ پر رابطہ کریں۔

۱۔ جگہ کا ملکیتی ثبوت۔
۲۔ ایک سے زیادہ مالکان کی صورت میں مختارنامہ خاص۔
۳۔ عمارت کا منظور شدہ نقشہ۔
۴۔ مالک کا کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ مع مصدقہ نقل۔
۵۔ مالک کا رابطہ نمبر۔
۶۔ مطلوبہ کرایہ۔

نوٹ: قواعد و ضوابط کے مطابق ضروری شرائط لاگو ہونگی۔ ادارہ کو کسی ایک یا تمام پیشکشوں کو بغیر وجہ بتائے مسترد کرنے کا اختیار ہوگا۔

PID(L)3361

لفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید احمد ندیم قادری تمغہ امتیاز
ڈائریکٹر (پنجاب) پاکستان بیت المال،
41-B-I ایمپرس روڈ، بالمقابل شملہ پہاڑی، لاہور۔

تازہ بہ تازہ

مصر اور مصری عوام کی فتح کا تاریخی لمحہ

۸۴

سال کی صبر آزما جدوجہد کے بعد اخوان المسلمون کو یہ دوسری بڑی خوشی نصیب ہوئی ہے جب الیکشن کمیشن نے اخوان المسلمون کے امیدوار محمد مرسی کو صدارتی انتخاب میں کامیاب قرار دیا۔ محمد مرسی نے ۵۱٫۷ فیصد ووٹ لے کر حسنی مبارک کے وزیراعظم اور فضائیہ کے سابق چیف احمد شفیق کو شکست دی ہے۔

اخوان المسلمون اپنے قیام سے لے کر اب تک آزمایشوں اور صدموں سے ہی دوچار رہی ہے مگر اس نے بے مثال جدوجہد کا سفر نہیں روکا۔ صدارتی الیکشن سے ایک دن قبل فوجی حکمرانوں نے مصر کی وہ پارلیمنٹ ہی توڑ دی جس میں پہلی بار اخوان کی اکثریت تھی۔ ایک عبوری آئین نافذ کر کے صدر کے تمام اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں۔ عملاً صدر کو اب سپریم کونسل آف آرمڈ فورسز کے ماتحت کام کرنا ہوگا جب تک کہ پارلیمنٹ واپس آ کر ان اختیارات کو بحال نہیں کرتی۔

اخوان نے تاریخی التحریر چوک میں جہاں صدر کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے لاکھوں لوگ جمع تھے، اعلان کیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی بحالی کے لیے مہم چلائیں گے۔

الیکشن کمیشن نے نتائج کا اعلان اس عالم میں کیا کہ فوج نے وہاں ٹینک بھیج دیے، سرکاری ملازمین کو چھٹی دے دی گئی اور بازار سنسان تھے تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو جائے۔

ان تاریخی نتائج کو بدلنے کے لیے کافی کوششیں بھی کی گئیں۔ احمد شفیق کی امریکی اور برطانوی سفیروں سے خفیہ ملاقاتیں اور نتائج روکنے کی اپیل اسی سلسلے کی کڑی تھی مگر ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ۳۰ ہزار ۱۳۱ ووٹ لے کر جیتنے والے محمد مرسی ۱۰ لاکھ سے زائد ووٹوں کے واضح فرق سے فاتح قرار پائے ہیں۔ اس سے پہلے صدر حسنی مبارک لوگوں کے شدید احتجاج پر ۳۰ سال سے زائد عرصہ صدر رہنے کے بعد ۱۱ فروری ۲۰۱۱ء کو مستعفی ہو کر قاہرہ چھوڑ گئے تھے۔ ابھی حال ہی میں عدالت نے ان کے جرائم پر انھیں سزا بھی سنائی ہے۔ جس کے بعد سے وہ کومے میں ہیں۔

اخوان المسلمون کے لیے جہاں یہ بہت بڑی خوشی اور کامیابی کا لمحہ ہے وہاں کامیابی سے جڑی بے تحاشا توقعات پر پورا اترنے کے چیلنج کا بھی سامنا ہوگا۔

اتنی بڑی انتخابی کامیابی کے بعد بھی اخوان المسلمین کو انتخابی جیت کے لیے ایک لمبا سفر درپیش ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے ساتھ ہے۔ ان کے حوصلے بلند اور ایک بڑی تبدیلی کے لیے وہ پُرامید ہیں۔

اختر عباس

رائل

پام کا خوبصورت اور ٹھنڈا ہال تھا۔ سٹیج پر ''پاکستان ۲۰۱۵'' کے عنوان سے بینر سجا تھا اور سٹیج پر ہمایوں اختر خاں، میاں عامر محمود، الطاف حسن قریشی، عارف نظامی، مجیب الرحمٰن شامی اور مبشر لقمان بطور پینلسٹ موجود تھے اور وصی شاہ موڈریٹر۔ طیب اعجاز قریشی پروگرام کے میزبان تھے اور کاشف الحق (کاروٹ والے) شریک میزبان۔ اصل میں تو یہ آل ورلڈ نیٹ ورک کے اراکین کا ری یونین ڈنر تھا جسے طیب اعجاز کے ذہن رسا نے ایک بھرپور دل کشا شام میں بدل دیا۔ انہی کا آئیڈیا تھا کہ کھانے کو یوں زیادہ پر لطف بنایا جا سکتا ہے۔ پروگرام میں جہاں مبشر لقمان نے مایوسی والی اپنی روایتی گفتگو کی وہاں شامی صاحب نے بہت ہی عمدگی سے ''پاکستان ۲۰۱۵'' کا ایک دلکش نقشہ کھینچا۔ انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا کہ جہاں چاروں طرف ناشکرے تاجروں اور صنعت کاروں کا غلغلہ ہے جو اپنی ترقی سے کبھی خوش نہیں ہوتے۔ ان کے بقول بزنس آگے نہیں بڑھتا۔ پھر بھی ان کو مسلسل پھل پھول لگ رہے ہوتے ہیں۔ انہی لوگوں کے درمیان ''پاکستان ۱۰۰'' والے لوگ بھی خوب ہیں کہ اپنی ترقی پر خوش بھی ہیں۔ اسے ملک اور عوام کے لیے مفید بھی بنا رہے ہیں۔

کاشف الحق نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ طیب اعجاز نے صرف ایک مہمان کا شکریہ ادا کیا، وہ تھے میڈیا لا جک کے سربراہ سلمان دانش۔

یہی سلمان دانش ہمارے اس ماہ کے بزنس رو ماڈل ٹھہرے۔ پتا چلا کہ انھوں نے ایک ایسے مختلف منفرد کاروبار کی بنیاد رکھی ہے جو اس سے پہلے پاکستا میں موجود نہیں تھا۔ اس حوالے سے بے شمار سوالات ہم گارڈن ٹاؤن میں واقع میڈیا لا جک کے آفس پہنچ عاطف مرزا میرے ہمراہ تھے۔ ملاقات سے پہلے سادہ بورڈ روم تھا جہاں ہم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ دیواروں گے سرٹیفکیٹس دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مطمئن متحرک ذہن ہی یکسوئی کے ساتھ نیا سوچ سکتا ہے۔ آ بڑھنے کا راستہ دیکھ اور نکال سکتا ہے۔

کامیابی بے شک مسلسل سوچنے اور دوسروں مختلف ہونے والوں کا انتظار کرتی ہے۔ وہ اپنے جیسے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اچھی ٹیم بناتے پھر اس ٹیم کھل کر کھیلنے دیتے ہیں۔ یہ لوگ کچھ نیا سیکھنے کے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ آج کے عہد میں Entrepreneurial Approach بھی کہلاتی ہے کچھ ایسا نیا کام کرو کہ دوسروں کے لیے ویسا کرنا آسان ہو۔ بہترین کام، بہترین لوگوں کی مدد سے ہی ہوتے ہیں کوئی اکیلا میچ نہیں جیت سکتا۔ یہ تو پھر کاروبار کی دنیا ہے اپنے ہی لوگوں کے مزاج و اطوار میں ہر پل تبدیلی، دوسر کے بنائے معیار پر چلنا، اپنے آپ کو منوانا اور پھر اپنا معیار طے کے خود معیار ٹھہرنا ایک الگ سے چیلنج ہوتا ہے۔ اس چیلنج کو قبو کرنے والے بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک اور معاشرے میں ہوتے ہیں اور اپنے ناموں اور شکلوں کے مختل ہونے کے باوجود اپنے کاموں سے پہچانے جاتے ہیں۔

کامیابی کے چند اُصول

دنیا بھر کے کامیاب کاروباری لوگوں کے مطالعے سے ماہرین نے کامیابی کے بھی چند اصول وضع کیے ہیں۔ ایسی ملاقاتیں ان اصولوں کو جانچنے اور ان کے مطابق افراد اور ان کے خیالات کو پرکھنے کا بھی خوب موقع فراہم کرتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ پسندیدہ پیشہ ہو یا کام کامیابی کی اصل بنیاد بنتا ہے۔ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے والے، تعلقات کو نبھانے اور دوستیاں بڑھانے والے کامیاب رہتے ہیں۔ نعمتوں اور خوشیوں کو یاد اور شمار کرنے والے آگے بڑھتے ہیں۔ یہی لوگ دوسروں کے کام آتے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کاروبار میں خوش، چیریٹی کرنے والوں یعنی اللہ کی راہ میں اور اس کی مخلوق پر خرچ کرنے والوں کو زیادہ ملتی ہے۔

میڈیا لا جک کے نوجوان سربراہ سلمان دانش جن کی کمپنی پاکستان کی تیز رفتار، شفاف اور مسلسل ترقی کرنے والی ۱۰۰ کمپنیوں میں سے ۲۴ویں نمبر پر ہے، نے بورڈ روم میں آکر ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ یہ کسی روایتی سی ای او یا سیٹھ کا بڑا خوبصورت، جدید اور چمکتا دمکتا آفس بالکل نہیں تھا۔ سادہ سی ۲/۲ کرسیاں اور میز پر فائلوں اور کاغذات کے ساتھ لیپ ٹاپ، سائیڈ ٹیبل پر بھی کاغذات اور کچھ شیلڈز۔ ٹیپ ریکارڈر آن کرتے کرتے میں نے مسکراتے ہوئے پہلا سوال کر دیا۔

س: اتنی اہم ٹیکنالوجی کمپنی کا چیف ایگزیکٹو ہونے کے لیے آپ کی عمر کچھ کم نہیں ہے کیا؟

سلمان: (جواب بھی مسکراہٹ سے ملا) عمر اتنی بھی کم نہیں۔ اپنا بزنس شروع کرنے سے پہلے میں ۹ سال ملازمت کر چکا ہوں۔ ۶ سال پیپسی میں اور ۳ سال شیل میں۔ ۲۰۰۷ء میں یہ بزنس شروع کیا۔ اسے بھی ساڑھے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے ملازمت کے دوران یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنا بزنس شروع کرنا ہے۔

س: لمز (LUMS) میں پڑھتے ہوئے زندگی کا کیا ہدف مقرر کیا تھا؟

سلمان: میں نے دیکھا ہے کہ ۵ سال کے بعد آپ کے اہداف بدل جاتے ہیں۔ آپ کا Exposure بڑھ جاتا ہے مختلف چیزیں پتا چلتی ہیں۔ تو میرے لیے کوئی گول حتمی نہیں رہا۔ اہداف وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

س: اپنے تعلیمی پس منظر اور فیملی کے متعلق کچھ بتائیے۔

سلمان: لاہور میں پیدا ہوا، سکول، کالج لاہور میں ہی تھے۔ والدین دونوں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ والد سول سرونٹ اور والدہ تعلیم کے شعبہ سے وابستہ تھیں۔ ہوم اکنامکس کالج سے وائس پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ ہم ۳/۲، بہن بھائی ہیں۔ ایک بڑے بھائی اور ایک بڑی بہن۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ مڈل کلاس فیملی تھی۔ والدین نے ہماری تعلیم کا بہترین انتظام کیا۔ میں نے KG سے لے کر سینئر کیمبرج تک بیکن ہاؤس میں تعلیم حاصل کی۔ ایف ایس سی اور بی اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ایم بی اے لمز سے کیا۔

س: لمز میں جانے کا فیصلہ کیسے کیا؟

سلمان: بڑے بھائی لمز کے گریجوایٹ تھے تو خاندان میں ایک مثال موجود تھی۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ میں سول سروس میں جاؤں۔ میں لمز میں اس ارادے سے گیا تھا کہ پروفیشنل ڈگری حاصل کرلوں پھر سول سروس میں چلا جاؤں گا۔ جب لمز میں رہے تو ارادہ بدل گیا۔ پھر میں بینک میں نوکری کرنا چاہتا تھا لیکن جب تک گریجوایشن مکمل ہوئی مارکیٹنگ اور برانڈنگ کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ گورنمنٹ کالج کا میری کامیابی اور میری شخصیت کی تعمیر میں بڑا کردار رہا۔ وہاں گزرے بی اے کے ۲ سال بہت

میڈیا لا جک، پہلی پاکستانی میڈیا ریٹنگ کمپنی

میڈیا لا جک بنیادی طور پر ایک ٹیکنالوجی کمپنی ہے جو ۲۰۰۶ء میں میڈیا کی صنعت کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائی گئی۔ یہ کمپنی پاکستان میں دیکھے جانے والے ٹی وی چینلز کی ریٹنگ فراہم کرتی ہے۔ یعنی اس بارے میں معلومات (Data) دیتی ہے کہ کوئی چینل کتنا دیکھا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر چینلز کی کامیابی، شہرت اور اشتہارات کے اجراء اور فلو کو طے کیا جاتا ہے۔ یہ کمپنی جرمنی میں قائم GfK گروپ سے منسلک ہے جو دنیا کی تیسری بڑی تحقیقی کمپنی ہے۔ پچھلے چند سال میں ہی اس کمپنی نے اپنے آپ کو پاکستان کی نمایاں ریٹنگ ایجنسی کے طور پر مستحکم کر لیا ہے۔ تمام معروف ٹی وی چینلز اور اشتہارات دینے والی کمپنیاں میڈیا لا جک کے ڈیٹا سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ ایجنسی پیپل میٹر (Peoplemeter) ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہے۔

اہم تھے۔ ایف ایس سی پری میڈیکل گورنمنٹ کالج سے کی۔ اس میں نمبر اچھے آگئے۔ ایڈمیشن بھی ہوگیا لیکن میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا تھا۔ والدین کو بھی راضی کرلیا کہ میں

> **میرا یقین ہے کہ جو کچھ آپ حقیقی طور پر چاہتے ہیں وہ آپ کو مل جاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟**

نے نمبر اچھے لے لیے ہیں لیکن میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا۔ میں بی اے میں چلا گیا۔ ہمارے ہاں خیال پایا جاتا ہے کہ جو کچھ نہیں کرسکتا وہ بی اے کرلیتا ہے۔ میرے ایف ایس سی کے سارے دوست ڈاکٹر ہیں۔ بی اے کے ۲/ سال کردار سازی کے لیے بڑے اہم تھے۔ آپ کے پاس وقت ہوتا ہے، اسے ضائع بھی اور اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج نے اچھے پلیٹ فارم دیے۔ میں ڈیبیٹنگ سوسائٹی (Debating Society) کا سیکرٹری رہا۔ Dramatic سوسائٹی میں بھی کافی حصہ لیا۔ مباحثوں اور دیگر سرگرمیوں نے بعد کی زندگی میں بڑا فائدہ دیا۔ میں لمز میں Presentations بھی اعتماد کے ساتھ دیتا تھا۔ یہ سب گورنمنٹ کالج کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ وہاں ماحول بہت اچھا اور مثبت تھا۔

س: کچھ اساتذہ یاد ہیں؟

سلمان: اساتذہ اچھے تھے۔ فرحان عبادت صاحب انگلش کے استاد تھے۔ ہماری انگلش مجلس مباحثہ کے پیٹرن تھے۔ اردو کی مجلس مباحثہ کے پیٹرن ہارون صاحب تھے۔ Dramatic Society کے عبدالروف پیٹرن تھے وہ اب جیو میں ہوتے ہیں۔ ان سب سے دوستی کا تعلق تھا۔ ان پلیٹ فارمز پر خواتین بھی تھیں اس لیے ان کے ساتھ کام کرنے میں کبھی کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ لمز میں مخلوط تعلیم ہوتی ہے اسی وجہ سے وہاں بھی آسانی رہی۔ جی سی میں آفتاب صاحب پرنسپل تھے۔ اب بھی جی سی والے بلاتے رہتے ہیں تو ایک رشتہ قائم ہے۔ میری شخصیت تعمیر کرنے میں جی سی کا بڑا ہاتھ ہے۔ لمز ہماری پروفیشنل تربیت کرتا ہے۔ لوگ محنت جیسی عادات وہیں سے سیکھتے ہیں۔

س: لمز کی تعلیم کیسی تھی؟ کہا جاتا ہے لمز اچھے مینیجر پیدا نہیں کرتا۔

سلمان: لمحہ بھر رک کر، آپ ملاقات سے پہلے بڑی بھرپور تیاری کرکے آئے ہیں۔ مہمان ہی نہیں اس کے کام اور اداروں کے بارے میں معلومات، بہت اچھا احساس ہوا ہے۔ اصل میں لمز میں آپ کتابیں نہیں پڑھتے۔ ان کا طریقہ کار کیس سٹڈیز پڑھانا ہے۔ پھر آپ ان پر ڈسکشن کرتے ہیں۔ وہاں آپ کو چیف ایگزیکٹو کی طرح سوچنے کی عادت ڈالتے ہیں۔ لیکن جب آپ اپنا سفر Management Trainee کی حیثیت سے شروع کرتے ہیں تو آپ کی توقعات زیادہ ہوتی ہیں۔ لمز کی تعلیم میں اس بات پر بھی زور ہوتا ہے کہ آپ کی توقعات حقیقی ہوں۔ میں لمز کے پہلے سال میں یہ سوچتا تھا کہ بینک میں یا فنانس میں جانا ہے۔ وہاں ٹائی لگائیں گے اور بڑے بڑے قرضے دیا کریں گے۔

پہلے سال انٹرن شپ اے بی این ایمرو میں کی۔ اس دوران اندازہ ہوا کہ فنانس میرا شعبہ نہیں۔ اس کے بعد میں مارکیٹنگ کورسز میں زیادہ دلچسپی لیتا رہا۔ لمز کا ایم بی اے فنانس یا مارکیٹنگ کا نہیں ہوتا بلکہ جنرل مینجمنٹ ایم بی اے کرواتا ہے۔

س: پہلی ملازمت تو آپ نے شیل پاکستان میں کی تھی ناں!

سلمان: لمز کے آخری ۲/ ماہ میں جاب انٹرویوز شروع ہوجاتے ہیں کمپنیاں ہائرنگ (Hiring) کے لیے کیمپس آتی ہیں۔ میں پی ٹی سی (پاکستان ٹوبیکو کمپنی) میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہاں کشش (Attraction) اور مراعات کافی تھیں۔ ایریا مینیجر کو نئی کرولا گاڑی ملتی تھی لیکن میں نے شیل کمپنی جوائن کرلی اور ۳/ سال شیل میں رہا۔ پنڈی میں پہلی پوسٹنگ ایسے ماحول میں ہوئی کہ شیل جیسی بڑی کمپنی کا ذہن میں جو امیج تھا اُسے دھچکا لگا۔ صدر بازار کے اندر ہمارا دفتر تھا۔ جو ڈائریکٹر کا گھر تھا ۱۹۴۰ء کا بنا ہوا۔ شیل کمپنی برما شیل سے وجود میں آئی تھی تو اس میں پرانے لوگ بھی تھے۔ شیل کا کراچی ہیڈ آفس بہت زبردست تھا۔ ہمارے انٹرویو وہاں ہوئے تھے اور انگریزوں نے لیے تھے۔ اب یہاں پنڈی آفس کے باہر ریڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسسٹنٹ پرانا ٹائپ رائٹر استعمال کررہا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہوتے گئے۔ میں نے سیلز اور مارکیٹنگ میں کام

پاکستان میں جو مواقع اور آسودگی ہے وہ دُنیا میں کہیں اور نہیں

[redacted]

آپ کو حیرت ہوگی کہ اس وقت امریکا میں برائین ٹریسی کی ریسرچ کے مطابق ۲/ کروڑ ۳۰/ لاکھ طرح کے کاروبار ہیں۔ ہر سال ان میں ۶/ سے ۱۰/ لاکھ نئے تجارتی اداروں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ادارے ان اداروں کے علاوہ ہیں جو رجسٹرڈ نہیں ہوتے اور کسی قانونی نیٹ ورک میں آئے بغیر کام کررہے ہوتے ہیں۔ ان کا سائز، حجم، پھیلاؤ اور ترقی ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ ان سے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں اور نوکریاں جڑی ہوئی ہیں۔

ہر آنے والا دن جہاں نئی سوچ، نئی ایجادات سامنے لا رہا ہے وہاں کاروباری دنیا میں یہ تبدیلی تصور سے بھی زیادہ تیز ہے۔ اب یہ سوچ پوری پختگی کے ساتھ کاروباری دنیا میں پائی جاتی ہے کہ ہمارا کاروبار بہت حد تک ویسا ہی ہوتا ہے جیسی ہم زندگی گزارتے ہیں۔

اس نظام کو، اس میں کام کرنے والے لوگوں کو اور وہاں کارگر سوچ کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر معاشرے سے آپ وہ کچھ بھی حاصل کرنے کا تصور نہیں کرسکتے جو آپ کا حق بنتا ہے۔ اگر کوئی یہ فہم پالیتا ہے تو وہ ان لوگوں کی نسبت بہتر زندگی اور کاروبار میں غیر معمولی کامیابی کا مزہ بھی چکھ لیتا ہے جو اس فہم سے محروم ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں بڑے متضاد اور مختلف نقطہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں۔ یہی تصورات آپ کی زندگی کی ڈرائیونگ سیٹ کو سنبھالتے آپ کو کامیاب یا ناکام کرتے ہیں۔ اگر بل گیٹس یہ کہتا ہے کہ ''غریب پیدا ہونا جرم نہیں، غریب رہ کر مرجانا جرم ہے۔'' تو ہمارے ہاں بہت سے لوگ محنت اور کوشش کیے بنا توکل کے نام پر غریب رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ سوچے بنا کہ اسلام کے ۵/ ستون دولت مند ہوئے بنا تعمیر ہی نہیں ہوسکتے۔ دولت کی کثرت، وسعت ہوگی تو زکوٰۃ دینے کے درجے پر جا پائیں گے۔ وسائل ہوں گے تو حج کا سوچ سکیں گے۔ محرومی کے ساتھ تو جہاد کے ساز و سامان اور اخراجات اٹھانے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ مدد لینے کے لیے پھیلے ہاتھ، دینے کی خوشی کیسے پاسکتے ہیں۔

آنحضور ﷺ پر ہماری جان، مال، آل اولاد سب قربان، انھوں نے ہی تو فرمایا تھا اللہ نے رزق کی فراخی اور فراہمی ۱۰/ میں سے ۹/ درجے کاروبار میں رکھی ہے اور ایک درجہ ملازمت میں۔

کیا اور انڈسٹریل شعبے کو دیکھتا تھا۔ پھر لاہور میں پوسٹنگ ہوگئی۔ نیٹ ورک پلینر کی حیثیت سے یہ اہم ذمے داری تھی۔ یہاں سفارشیں بھی بہت آتی تھیں۔ بیرونِ ملک کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ میں ۶ر ماہ کے لیے لبنان پوسٹ ہوگیا۔ لبنان ماڈرن جگہ تھی یورپ کی طرح۔ اس دوران میری شادی بھی ہوچکی تھی۔

س: شادی کیسے ہوئی؟

سلمان: بیگم کا انتخاب میرا تھا۔ والدین کی رضا مندی بھی شامل تھی۔ ۲ر بچے ہیں۔ بڑا ۸ر سال کا اور چھوٹا پونے دو سال کا ہے۔ بیگم محکمہ انکم ٹیکس میں ڈپٹی کمشنر ہیں جو آج کل چھٹی پر ہیں۔ (سلمان نے جلدی سے موضوع کو مکمّل کیا۔)

س: شیل کے بعد پیپسی کا رُخ کیوں کیا؟

سلمان: اس کے بعد پیپسی کی جاب آفر ہوئی۔ پیپسی کولا انٹرنیشنل میں میرا دوست عمر تھا۔ وہ فرنچائز مینیجر ملتان سے مارکیٹنگ مینیجر بن گیا۔ اس نے میرا نام تجویز کیا۔ یوں میرا انتخاب ہوگیا۔ جب وہ دبئ چلا گیا تو میں اس کی جگہ مارکیٹنگ مینیجر بن گیا۔ بہت کم ادارے ایسے ہوں گے جو پیپسی جتنا Exposure دیتے ہوں گے۔ یہاں گلیمر بھی تھا۔ کرکٹ اور میوزک سٹارز کے ساتھ اشتہار بنانے میں وقت گزرتا تھا۔ مارکیٹنگ مینیجر، مارکیٹنگ ڈائریکٹر سمیت ۱۰، ۱۵ر لوگوں کی ٹیم تھی۔ بجٹ بھی بڑے ملتے تھے۔ کمپنی نے SNAKS کی مارکیٹ کو سمجھنے کے لیے مجھے ۸ر ماہ کے لیے میکسیکو بھی بھیجا۔ یہاں واپس آ کر SNAKS کے کئی پراجیکٹس پر کام کیا اور کئی پراڈکٹس متعارف کروائیں۔ آپ کو پراڈکٹ لانچ کرنے میں ۳۶۰ر ڈگری کا تجربہ ملتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں کھیتوں سے کیسے آتی ہیں۔ اس پر غور کیا جاتا ہے پیکیجنگ کیسی ہوگی۔ یہ اچھی کمپنی تھی اگر بزنس میں نہ آتا تو وہیں رہتا۔ یہاں ترقی کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

یہاں ہر کسی کو ساری عمر گھر بنانے کی ہی فکر لگی رہتی ہے

احسن میرے لمز کے دوست ہیں۔ انھوں نے لمز سے فارغ ہونے کے بعد اپنا سافٹ ویئر ہاوس شروع کیا تھا۔ ہم نے مل کر ڈیفنس میں ٹیلی نار کی فرنچائز لے لی۔ اس بزنس سے کچن کا خرچہ نکلنے لگا۔ اس لیے میں نئے بزنس کا رسک لینے پر آمادہ ہوگیا۔

۲۰۰۶ء میں میڈیا لاجک کمپنی شروع کی۔ جی ایم سنیکس میرے باس تھے۔ انھوں نے کہا اگر تم اپنا بزنس شروع کرنا چاہتے ہو تو میں تمھیں نہیں روکوں گا۔ میں سمجھتا ہوں ہر ملازمت کرنے والا خواہش رکھتا ہے کہ اپنا بزنس شروع کیا جائے۔ ۶ر کروڑ کی انویسٹمنٹ سے ہم نے یہ کمپنی بنائی۔ بڑے بھائی اور لمز کے ۲ر کلاس فیلوز اس میں میرے ساتھ ہیں۔ میں مینیجنگ پارٹنر ہوں۔ ہم نے ڈھائی کروڑ قرضہ لیا جو ۳ر سال میں واپس کر دیا۔ ۵۰ر فیصد ہماری اپنی سرمایہ کاری تھی۔ یہ کمپنی پاکستان میں دیکھے جانے والے ٹی وی چینلز کی ریٹنگ فراہم کرتی ہے کہ کوئی چینل کتنا دیکھا جاتا ہے۔

یہ کام شروع کرنے کے لیے پاکستان ایڈورٹائزرز سوسائٹی (پی اے ایس) اور پاکستان براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن (پی بی اے) کو اعتماد میں لیا تھا۔ جلد ہی سب لوگ اعتماد کرنے لگے کہ ہمارا ڈیٹا ٹھیک ہوتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں آڈٹ بھی کرایا۔ ہماری ٹیکنالوجی میں گھر میں موجود ٹی وی کے ساتھ ایک آلہ لگایا جاتا ہے۔ جی ایس ایم موڈیم کے ذریعے ڈیٹا ہمارے دفتر ٹرانسفر ہوجاتا ہے۔ اگلے دن چینلز اور ایڈورٹائزرز ہمارے کمپیوٹر سے پچھلے ۲۴ر گھنٹوں کا ڈیٹا دیکھ لیتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ بڑے چینل پر پیغام دینے سے ساری دنیا اسے دیکھ لیتی ہے

س: اس بزنس میں آنے سے کیا انکشافات ہوئے۔

سلمان: اس بزنس میں آنے کے بعد پتا چلا کہ ٹی وی کے کل Viewership کی تعداد ہمارے خیال سے کہیں کم تھی۔ سب سے زیادہ جس چینل کی Viewership ہوتی ہے وہ ۲ر فیصد کے قریب ہوتی ہے۔ گویا یہ خیال غلط ہے بڑے چینل پر پیغام دیا جائے تو ساری دنیا دیکھ لیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ایک وقت میں ۵۰ر فیصد سے زائد لوگ تو ٹی وی دیکھ ہی نہیں رہے ہوتے اور باقی لوگ ۸۰ر سے ۹۰ر چینلز دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پاکستان بھارت کا کرکٹ سیمی فائنل ۲۴ فیصد تک گیا۔ دیکھنے والوں کی یہ تعداد اب تک کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

ہم اس روایت کو جانتے، پڑھتے مگر کہیں دل سے ماننے کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ جبھی تو صرف نوکریاں کرنے والوں کا ایک پورا گروہ کھڑا کر دیا ہے۔ جو صرف ۹ر سے ۵ بجے کی نوکری کے علاوہ کچھ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت، ہمت اور طاقت سے ہی محروم ہوگیا ہے۔

صدر کالوہن کولیج نے ایک بار کہا تھا ''امریکا کا کام ہی کاروبار ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ وہاں کی سوچ، رفتار، انداز اور اپروچ ہر چیز ہم سے مختلف اور تیز ہے۔ ہم ہفتوں میں سوچتے ہیں اور وہ دِنوں میں۔ ہم مہینے کی تنخواہ کو زندگی کی خوشی اور کامیابی گردانتے ہیں وہاں پر یہ ہر گھنٹے کے کام اور آمدن سے جڑی ہے۔ آپ کو امریکا نہ بھی پسند ہو، اس کی سوچ تو ہر جگہ کارفرما ہے۔

دنیا میں ہر جگہ نئے کاروبار شروع ہو رہے ہیں، نئی کمپنیاں بن رہی ہیں۔ سرمایہ آرہا ہے، ملازمتیں بڑھ رہی ہیں۔ کچھ ناکام ہو جاتیں، کچھ کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق امریکا میں ہر سال ۵۰۰ر بڑی کمپنیوں کی فہرست سے ۱۰۰ر نکل جاتی ہیں اور پھر اتنی ہی مزید شامل ہوجاتی ہیں۔ کچھ کاروبار ختم کر دیتیں، کچھ ادغام (مرجر) کر لیتی ہیں۔ کچھ نئی شناخت کے ساتھ نیا کاروبار کر لیتی ہیں۔ یہ مسلسل سوچنے، جاننے اور جانچنے کے عمل کا لازم حصہ ہوتا ہے۔ اگر بڑی بڑی کمپنیوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو سوچیں کہ چھوٹی کمپنیاں کس مشکل سے گزرتی ہوں گی۔ اصل میں دیکھنے اور غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ بے شمار کمپنیوں کے دیوالیہ ہونے، نقصان میں جانے کے مرحلے میں بے شمار نئی کمپنیاں نمو پاتی ہیں۔ معرضِ وجود میں آکر اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ انھیں خیر موقع ملتا ہے تو آگے بڑھتی ہیں۔ مواقع کبھی کم نہیں ہوتے اور انھیں پہچاننے والے بھی کم نہیں ہوتے۔ البتہ ہم اکثر وہاں نہیں ہوتے۔ پاکستان ایک ایسا خوش بخت خطہ ہے جہاں سو طرح کی رکاوٹوں کے باوجود کاروبار کے پھلنے پھولنے کے خوب مواقع ہیں۔ سیاسی حالات کی مشکلات جیسی بھی ہوں، کاروبار اور زندگی کی گاڑی رواں رہتی ہے اور نت نئے کام کرنے والے، نیا سوچنے والے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود رہتے ہیں۔

میں پاکستان سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا میں سمجھتا ہوں جو آرام دہ زندگی، ذہنی آسودگی یہاں ہے وہ کہیں اور نہیں۔ جو مواقع یہاں ہیں دنیا میں کہیں اور نہیں ماں باپ، دوست یہاں ہوتے ہیں، وہاں دوست نہیں ہوتے صرف وقت گزارا جاتا ہے۔ باہر تنہائی ہوتی ہے یہاں اپنائیت ملتی ہے اگر میں پیپسی میں رہتا تو مجھے باہر جانا پڑتا اس لیے چند سال بعد ہی میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اپنا بزنس شروع کیا جائے

س: کیا آپ صرف ریٹنگ فراہم کرتے یا یہ بھی بتاتے ہیں کہ کون کیوں پیچھے ہے؟

سلمان: ہم صرف ریٹنگ فراہم کرتے ہیں۔ کوئی چینل کیوں پیچھے ہے یہ Qualitative تحقیق والوں کا کام ہے۔ ہمارا ڈیٹا ۷۰۰ گھروں کے ۴۰۰۰ افراد سے آرہا ہوتا ہے۔ ہر گھر میں کوئی بھی فیملی ممبر اپنے لاگ اِن سے ریموٹ استعمال کرتا ہے۔ ہم ۱۰ بڑے شہروں سے معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔ ان میں کراچی، اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور، حیدرآباد، سکھر، ملتان، گوجرانوالہ، فیصل آباد اور پشاور شامل ہیں۔ ان افراد کی پرائیویسی کا خیال رکھا جاتا اور مجموعی ڈیٹا فراہم کیا جاتا ہے۔ ہم اس چیز کا خیال بھی رکھتے ہیں کہ ہمارا ڈیٹا قابلِ اعتماد رہے اور کوئی چینل اس پر اثر انداز نہ ہو۔

س: لوگ اثر انداز ہونے کی کوشش تو ضرور کرتے ہوں گے؟

سلمان: ایسی کوششیں ہوتی ہیں مگر ہمارا نظام ایسا عمدہ ہے کہ پتا چل جاتا ہے۔ ایک تو یہ کسی کو نہیں پتا ہوتا کہ وہ گھر کون سا ہے جہاں سے ریٹنگ جارہی ہے۔ اس گھر کی ریٹنگ کا ایک ٹرینڈ ہوتا ہے۔ ایک آدھ بار جب کسی گھر پر اثر انداز ہوا گیا تو اس کی پسند ایک دم سے بدل گئی، یہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس پر ہم نے فوری طور پر چیک کرلیا۔ جس بندے نے یہ حرکت کی تھی اس کو بھی سزا ملی اور اس کے ادارے کو بھی مطلع کر دیا گیا۔

س: ہمارا میڈیا سماجی ترقی خصوصاً دیہی علاقوں پر کیوں توجہ نہیں دیتا؟

سلمان: کیبل چینلز صرف انہی علاقوں کے مسائل پر توجہ دیتے ہیں جہاں تک کیبل کی رسائی ہے۔ کمرشل چینلز سماجی ترقی کے ایشوز پر کم توجہ دیتے ہیں۔ وہ بزنس کے لیے بیٹھے ہیں اور وہی چیز دکھائیں گے جس کے لیے اشتہار ملیں گے۔

س: بھارت کے بعض کمرشلز میں آپ کو سماجی ترقی کے ایشوز پر اچھی باتیں دیکھنے میں ملتی ہیں؟ ہمارے ہاں ہمدرد اور نورس کے علاوہ ویل (Wheel) والوں نے اس حوالے سے سوچا؟

سلمان: بھارت کی ٹی وی صنعت ہم سے ۱۵ گنا بڑی ہے۔ وہ اشتہارات پر پیسے بھی لگاتے ہیں، ان کی فلم انڈسٹری بھی مضبوط ہے۔ وہاں سے لوگوں کی تربیت ہوتی ہے اسی لیے وہاں تخلیقی صلاحیت بھی نظر آتی ہے۔ فلم انڈسٹری مضبوط ہو تو پروڈکشن ہاؤسز بنتے ہیں ان سے ٹیلنٹ نکلتا ہے۔ ان کے فنکار اپنے ملک کے بہت وفادار ہیں، وہ

اپنے ملک کے خلاف بات نہیں کرتے۔ بزنس مین بھی ایسے ہی ہیں۔ ہمارے ہاں مسئلہ ہے، ذرا مشہور ہوا تو پہلا حملہ اپنے ہی وطن پر کر دیتے ہیں۔ کئی خرابیاں نظر آنے لگتی ہیں حالانکہ عزت، شہرت تو یہیں سے ملی تھی۔

س: اکثر مالکان کا کہنا ہے کہ ٹی وی چینلز نقصان میں رہتے ہیں۔ لیکن ہر چار چھے ہفتے بعد نیا چینل بھی آجاتا ہے۔

سلمان: ایسا نہیں ہے کہ ٹی وی چینلز خسارے میں رہتے ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جو نیوز چینلز ہیں ان کا مین بزنس کچھ اور ہے۔ مالکان نیوز چینلز کو اپنے دوسرے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اگر نقصان میں ہوں تو پھر ایک ہی گروپ کے کئی کئی چینل کیوں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

س: آنے والے برسوں کو کیسے دیکھتے ہیں؟

سلمان: ۵ سال ٹی وی انڈسٹری کے لیے بہترین تھے۔ اب لائسنس پر پابندی ہے۔ مجھے لگتا ہے الیکٹرونک میڈیا کی مستقبل قریب میں ترقی کی رفتار سست رہے گی۔

س: آئندہ منصوبے کیا ہیں؟

سلمان: ۲۰۰۹ء میں ہم نے آؤٹ ڈور ایڈورٹائزنگ کی کمپنی Optimedia شروع کی۔ اس میں دنیا کی بڑی آؤٹ ڈور ایجنسی Kinetic کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔ ہمارا مشن یہ ہے کہ Media Manager کو ون ونڈو سلیوشن فراہم کیا جائے تاکہ وہ آسانی سے فیصلے کرسکے۔ ہماری ایک اور کمپنی Media Monitors ہے۔ یہ کمپنی Tracking کرتی ہے یعنی کون سا اشتہار کس وقت چلا۔ کمپنیاں پیسے دینے سے پہلے دیکھتی ہیں کہ اشتہار ٹی وی پر چلا ہے یا نہیں اور اگر چلا تو اس کی کوالٹی کیا تھی۔ آؤٹ ڈور Optimedia مانیٹرنگ کمپنی ۲۰۰۹ء میں خریدی تھی۔ اس میں ۵۵ لوگ ہیں۔

س: کون سے اینکر پرسن مقبول ہیں، آپ کا ڈیٹا کیا کہتا ہے؟

سلمان: مقبولیت میں کامران خان اور حامد میر آگے ہیں۔ خواتین میں حیسمین منظور اور ثنا بچہ کے پروگرامز پسند کیے جارہے ہیں۔

س: نیوز میں کون سے چینلز زیادہ دیکھے جاتے ہیں؟

سلمان: جیو پہلے نمبر پر ہے اس کے بعد ایکسپریس تھا اب اس کی جگہ دنیا نیوز نے لے لی ہے۔

س: سلمان دانش میں کیا خوبی نمایاں ہے اور یہاں کے لوگ سلمان دانش کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

سلمان: میں زیادہ پریشان یا جذباتی (Excited) نہیں ہوتا۔ کام کی جگہ کا ماحول پُرسکون ہونا چاہیے۔ ٹینشن نہیں ہونی چاہیے۔ ڈر نہیں Respect کا عنصر ہونا چاہیے۔ سیٹھ آرگنائزیشن والا کلچر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہنا آسان ہے لیکن ہمارے لیے بھی اس پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ایک وقت میں پچاس فیصد سے زائد لوگ ٹو ٹی وی دیکھ ہی نہیں رہے ہوتے، جو دیکھ بھی رہے ہیں وہ ۸۰ چینلز دیکھ رہے ہوتے ہیں

س: پڑھنے میں کیا پسند ہے؟

سلمان: بائیوگرافی پڑھتا ہوں۔ بل کلنٹن، گولن پاول کی کتابیں اچھی ہیں۔ گورباچوف کی بائیوگرافی بھی پڑھنے کی کوشش کی۔ آج کل عمران خان کی بائیوگرافی پڑھ رہا ہوں۔ Managerial Habits پر لکھی گئی کتابیں زیادہ نہیں پڑھتا۔ ''Good to Great'' اچھی کتاب ہے۔

س: زندگی میں لرننگ (Learning) کیا ہے؟

بعض اوقات چیزوں کا نہ ملنا ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے

سلمان: جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس کے بارے میں خوب اچھی طرح سوچیں کہ کیا یہ چیز چاہے جانے کے لائق ہے یا نہیں کیونکہ میرا یقین ہے کہ جو کچھ آپ حقیقی طور پر چاہتے ہیں وہ آپ کو مل جاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ ہماری زیادہ تر چاہتیں مادہ پرستانہ اور سطحی سی ہوتی ہیں۔ اکثر ہم وہ چیز چاہ رہے ہوتے ہیں جو اور لوگ بھی چاہ رہے ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اچھی گاڑی مل جائے گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہمیں وہ چیزیں Follow کرنی چاہئیں جو ہمیں اندر سے متوجہ کریں۔ لوگ کیا کہیں گے، اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم میں سے ہر کسی نے گھر بنانا ہوتا ہے۔ ساری عمر گھر بنانے کی فکر سر پر سوار رہتی ہے۔ میں اپنی والدہ سے کہتا ہوں میرے ساتھ رہیں یا بھائی کے ساتھ، وہ کہتی ہیں اب اپنا گھر بنا لیا ہے اس میں بھی تو کسی نے رہنا ہے اب لوگ گھروں کے لیے ہیں گھر لوگوں کے لیے نہیں۔

کامیابی ملنے پر عاجزی اختیار کرنی چاہیے تکبّر نہیں

س: کامیابی کے بارے میں کیا کہیں گے؟

سلمان: جب کوئی اپنا کام کر رہا ہو تو محنت ضرور کرتا ہے۔ لوگوں کی ذہانت میں بھی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کامیابی میں ہمارا حصہ صرف ۲۰، ۳۰ فیصد ہوتا ہے، باقی قسمت کا معاملہ ہے۔ کامیابی یا ناکامی کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ عزت بھی ان ہی لوگوں کی زیادہ کرنی چاہیے جو کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی اختیار کریں۔ اکثر جب ہم ناکام ہوجاتے ہیں ہمیں مایوسی گھیر لیتی ہے۔ بعض اوقات چیزوں کا نہ ملنا ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ کامیابی ملنے پر مزید عاجزی اختیار کرنی چاہیے، تکبّر نہیں آنا چاہیے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ سوچ میں پختگی اور تازگی ہو تو ترقی کے امکانات لامحدود ہوجاتے ہیں۔

شخصیات کے بجائے اداروں پر توجہ دینی چاہیے

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اجتماعی اور قومی ترقی کی قیمت پر انفرادی ترقی کی ہے

س: پاکستان کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

سلمان: ۱۵، ۲۰ سال اس جمہوریت کو چلنے دیں۔ جب بھی ہم اسے روکیں گے ہمیں دوبارہ نئے سرے سے سفر شروع کرنا پڑے گا۔ ہمارا ذہن شارٹ کٹ والا ہوگیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں فلاں آئے گا تو نظام بدل جائے گا۔ ہمارے ہاں کئی چیزیں بہتر ہیں۔ ہمارا میڈیا اور عدلیہ مضبوط ہے۔ جمہوریت جیسی بھی ہے چل رہی ہے۔ پاکستان میں یہ پہلی حکومت ہے جو اپنی مدت پوری کر رہی ہے، یہ اچھی چیز ہے۔ ہمارا نظام پر یقین ہونا چاہیے۔ شخصیات کے بجائے اداروں پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اجتماعی اور قومی ترقی کی قیمت پر انفرادی ترقی کی ہے۔ انفرادی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی ترقی بھی ہونی چاہیے۔

انٹرویو

پاکستان کے دورے پر آئے جماعت اسلامی ہند کے امیر سید جلال الدین عمری کی کھلی کھلی باتیں

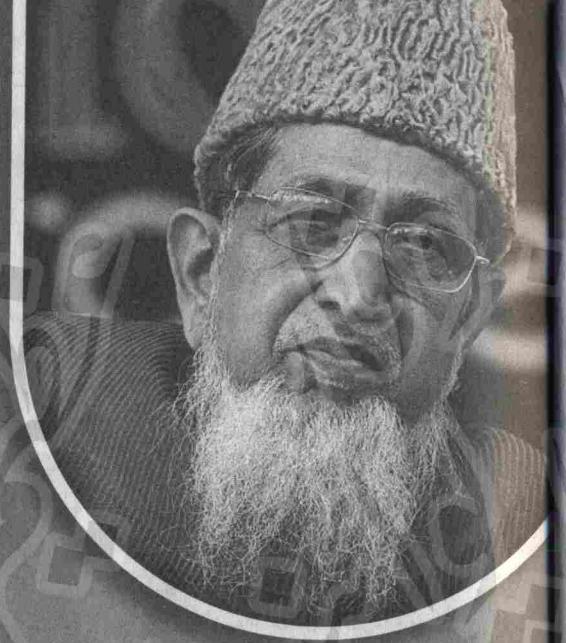

”یہاں کی جماعت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی ہے“

ملاقات: اختر عباس
شریکِ گفتگو: عاطف مرزا

آپ کے قومی کیریکٹر کا مسئلہ یہ ہے کہ جس شخص کو ٹین پرسنٹ کہتے تھے اُسے اُٹھا کر صدر بنالیا ہے

نگاہ

اُن کے چہرے کی معصومیت، لباس کی سادگی، ہلکی ہلکی مسکراہٹ، کندھے پر پڑے رومال سے ہوتی ہوئی پاجامے کے بے حد کھلے پائینچوں تک جا پہنچی۔ اس عہد کے عالمِ بے بدل سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی اسی طرح کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ بھارت سے آئے ۷۷ سالہ سید جلال الدین عمری سے مصافحہ کے بعد ہم منصورہ کے دل میں واقع دارالضیافہ (مہمان خانے) کے مرکزی کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔ بے حد دھیمے لہجے میں بات کرنے والے سید عمری اپنی عمر اور ذمے داری کے احساس کے باوصف تروتازہ، متحرک اور خوش دلی اور خوش مزاجی سے گفتگو پر آمادہ تھے۔ میرے لیے سید عمری کا نام کافی منفرد تھا۔ ایک رات پہلے ہی علم ہوا کہ بھارت میں وہ مسلمان جو حضرت ابوبکرؓ سے نسبت رکھنے والے بکری اور حضرت عمر فاروقؓ سے نسبت رکھنے والے عمری لکھتے اور کہلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں حضرت عمر فاروقؓ سے نسبت رکھنے والے فاروقی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خاندان سے نسبت رکھنے والے صدیقی کہلاتے ہیں۔ سید جلال الدین تامل ناڈو (تمل ناڈو) میں واقع مسلمانوں کی معروف دینی درس گاہ، جامعہ دارالسّلام عمرآباد کے فارغ التحصیل ہیں۔ اس لیے ان کے عمری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ بھارت میں دارالعلوم ندوہ سے ندوی، دہلی سے دہلوی اور سہارن پوری لکھنے کا رواج عام ہے۔

سید جلال الدین عمری اپریل ۲۰۱۱ء میں دوسری بار جماعت اسلامی ہند کے امیر منتخب ہوئے۔ اس سے پہلے وہ ۴ سال تک یہ ذمے داری نبھا چکے ہیں۔ وہ ہفتہ بھر کے لیے پاکستان کے دورے پر آئے تو لاہور اور کراچی میں ان کے لیے بے شمار مصروفیات اور تقریبات رکھی گئی تھیں۔ انھوں نے ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ میں جہاں

سید مودودیؒ تہ خاک سو رہے ہیں، ایک جدید لائبریری کا افتتاح کیا۔ کراچی میں قرآن پاک کے حوالے سے منعقدہ ایک نمائش کا ربن کاٹا۔ چند روز قبل مؤدب، ملنسار اور مسکراتے چہرے والے جماعت کے فارن سیکرٹری عبدالغفار عزیز نے ان کے اعزاز میں رکھے گئے الوداعی کھانے کی دعوت دی تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکل سکتی ہے؟ معلوم ہوا کہ اگلے روز ۱۲ بجے ان کی دہلی کی فلائیٹ ہے اور ۱۰ بجے امیر جماعت سید منور حسن سے الوداعی ملاقات، اس سے پہلے ناشتا ہے۔ ہاں ناشتے پر ملاقات ہوسکتی ہے اگر آپ اس کا فائدہ لے سکیں تو۔ یوں ہم صبح ۸ بجے عازم منصورہ ہوئے، عاطف مرزا بھی ہمراہ تھے۔ ملتان روڈ پر منصورہ چوک (پرانی ملتان چونگی) سے ذرا آگے سڑک پر پیادہ شہریوں کے لیے اس کی مصروف دو رویہ سڑک کو پار کرنے کے لیے ایک پیڈسٹرین پل (Padestrian) ایستادہ ہے جسے استعمال کر کے سڑک عبور کرنے کے بجائے لوگوں نے پل سے ذرا آگے سڑک کے درمیان میں واقع نالے کی کنکریٹ سے بنی دیواریں دن دیہاڑے کاٹ کر گزرنے کا راستہ بنایا ہوا ہے۔ بچے بوڑھے سب یہیں سے گزر رہے تھے۔ اس چور دروازے سے ذرا دور ہی تھا جب ایک چیخ نے دل دہلا دیا۔ ایک خاتون نے شارٹ کٹ اختیار کیا اور بے دھیانی میں سڑک پر پرنا دیکھے پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی نے اسے کم سے کم چھ سات فٹ دور اچھال دیا۔ قسمت اچھی تھی کہ دوسری کوئی تیز رفتار گاڑی قریب نہ تھی۔ خاتون کچلے جانے سے ''محفوظ'' رہی مگر اس کی چوٹوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ منصورہ کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے خدا جانے کیوں ذہن میں رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ شارٹ کٹ کوئی فرد اختیار کرے یا گروہ انسانی، لازم نہیں ہے کہ منزل پر پہنچنے کا راستہ محفوظ اور سلامتی بھرا ہو۔ کتنے ہی اَن چاہے صدمے چھوٹے بڑے حادثے اور ٹکریں راہ میں منتظر ہوتی ہیں۔

ناشتے کا بلاوا آیا تو عمری صاحب نے ہمیں ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر جا پہنچے۔ میزبانوں نے مہمان کی شخصیت کی طرح کا ہی سادہ ناشتا سجایا ہوا تھا۔ انھوں نے دودھ کے کپ میں سیریل لیا اور ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔

س: پاکستان میں آپ دوسری بار تشریف لائے ہیں کئی سال بعد''۔ میں نے کئی کتابوں کے مصنف اور بھارتی مسلمانوں کے اہم راہنما سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''کیا فرق محسوس ہوا اتنے سالوں میں یہاں کی معاشرت اور کلچر میں؟''

ج: ویسے تو بہت زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔ سفر میں آتے جاتے ہی دیکھا ہے۔ ملک نے خوب ترقی کی مگر معاشرت کے معاملے میں بے پردگی بڑھی ہے۔ حیدرآباد سے کراچی جاتے ہوئے، یا کراچی اور لاہور آتے جاتے کم کم ہی باپردہ خواتین نظر آئیں۔

یہاں بھارت کی فلمیں ڈرامے خوب دیکھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ عرب ممالک میں پاکستانی احباب کہتے ہیں فلم نہیں دیکھیں گے تو رات کیسے گزرے گی۔ پرانی قدریں وقت کے تیز دھارے کے ساتھ مٹتی جارہی ہیں اور کوئی روک نہیں ہے۔

س: ہم نے تو چاہتے نہ چاہتے بھارت کی تہذیب اور فلموں سے بہت اثر لیا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے پاکستان کی وجہ سے کوئی چیز اختیار کی؟

ج: ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگ کہتے ہیں اسلام بطور نظام زندگی ان کی وجہ سے سامنے آیا ہے۔ ان کا معاشرہ بدل گیا ہے۔ جہالت کم ہوئی ہے، ظلم ختم ہوگیا ہے۔ مساوات آگئی ہے تو بھارت کے لوگ بھی ان سے سیکھتے۔ آپ ایٹمی طاقت تو بن گئے مگر اپنی اصل اسلامی قوت سے محروم ہیں جو دوسروں کو آپ کا قدرداں یا پیرو (Follower) بنائے۔

میری خواہش تھی کہ یہاں ظلم ختم ہوجاتا۔ لوگ اس کی مثال دیتے، کرپشن نہ رہتی، وسائل کا صحیح استعمال ہوتا۔ آپ کے پاس بہت کچھ ہے۔ تعلیم، افرادی قوت،

وسائل اور ایٹمی ہتھیار۔ ٹھیک ہے تیل نہیں ہے مگر ایران کو بھی تو دیکھیے آپ کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہے۔ آپ کی آبادی سے آدھی آبادی ہوگی مگر مغرب کے سامنے اتنے سالوں سے کھڑا ہے اور کوئی اسے زیر نہیں کرسکا۔ تیل کو بھول جائیں آپ ایران سے بہت آگے ہیں۔ آپ کے پاس وسائل اور بہادر لوگوں سے بھرا پورا پنجاب ہے۔ ہمارے پاس تھوڑا سا حصہ ہے وہ پورے بھارت پر چھایا ہوا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ اتنی قوت رکھنے کے باوجود بے بسی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ امریکی وزیر دفاع جب کہتا ہے کہ ''حملہ کرتے ہوئے ہم پاکستان سے نہیں پوچھیں گے۔ یہ ہماری سلامتی کا سوال ہے۔'' کسی آزاد ملک کے بارے میں ایسے حملے اور ایسی بات کیسے کی جا سکتی ہے؟

آپ کے قومی کیریکٹر کا مسئلہ یہ ہے کہ جس شخص کو آپ ٹین پرسنٹ کہتے تھے، اُسے اٹھا کر صدر بنا لیا ہے۔ آپ کی یہ شناخت ہر جگہ بدنامی کا باعث بنی ہے۔ جس کو ٹین پرسنٹ تب کہتے تھے جب اس کی بیوی کی حکومت تھی۔ اب جو صورتحال ہے اس پر کوئی کیا کہے۔ ففٹی پرسنٹ یا ہنڈرڈ پرسنٹ۔ یہ مسئلہ آپ کی قومی سوچ کا ہے۔

س: یہاں کی جماعت اسلامی کا کام، یہ ایک رائے ہے کہ زیادہ مؤثر نہیں رہا؟ آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: دیکھیں معاملہ یہ ہے کہ آپ کے ہاں بھٹو صاحب آئے۔ انھوں نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا۔ ان کا مقصد جو بھی تھا لوگوں نے ان پر اعتبار کرلیا اور ان کے ساتھ ہولیے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ یہاں کی جماعت جب یہ کہے کہ اسلام ہمارے ذریعے آئے گا تو لوگوں کو اعتبار آجائے کہ یہی ظلم کے نظام کو تباہ کریں گے۔ یہی ہمارے مسائل حل کریں گے لیکن یہ بات لوگوں کو سمجھائی نہیں جاسکی۔ جماعت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جو صحافی اور سکالر یہاں سے وہاں آتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں۔ ہماری تو زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اسلام

ہمارا آپ کا بڑا فرق ہے ہم اقلیت میں ہیں۔ وسائل، اختیار و اعتماد سے محروم

غالب آجائے۔ دنیا کے سارے مسائل حل ہوجائیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسرے ورلڈ آرڈر دے رہے ہیں۔ یہ آپ کو دینا چاہیے تھا۔ آپ کے پاس اسلام کی فکر تھی۔ اسلام تو امریکیوں، افریقیوں، اوباما اور زرداری کے لیے بھی ہے مگر آپ کے اپنے مسائل ہی ختم نہیں ہوتے دوسروں کو فکری دعوت کب دیں گے۔

مسلمان پوری دنیا میں انقلاب لانے کے لیے آئے ہیں۔ اب ان کو یہی فکر نہیں جاتی کہ یہ ملک بچ جائے۔ فلاں ملک میں فساد ختم ہوجائے۔ حضرت محمدؐ ساری دنیا کے لیے تھے۔ ان کی دعوت عام کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ میرا احساس ہے پاکستانی قوم نے اسلام کو بطور نظام زندگی قبول نہیں کیا۔ اگرچہ ان کو اس کا انکار نہیں مگر عملاً تسلیم کرنے پر تیار بھی نہیں ہیں۔

جب تک جماعت پاکستان کے لوگوں کو اطمینان نہیں دلاتی کہ جماعت ان کی توقعات پہ پورا اترے گی، مسائل حل کرے گی، تب تک مؤثر نہیں ہوگی۔ ہمارا آپ کا بڑا فرق ہے۔ ہم اقلیت میں ہیں۔ وسائل سے محروم، بے اختیار اور اعتماد سے محروم ہیں۔ جمہوریت کا مطلب سب کی سنو۔ مگر ہمیں اسلام کی بات کرنے سے روکا جاتا ہے۔ آپ تو اپنے ملک میں ہیں۔ جب یہاں کوئی کہتا ہے کہ مذہب کی بات نہ کرو تو سو لوگ اس کے ساتھ بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ بھئی آپ جو مرضی علاج کراؤ ایک بندہ کہتا ہے کہ میرے پاس تمھارے دکھوں کا یونانی علاج ہے، علاج نہ کراؤ اس کو بولنے تو دو۔ یہ کہنا کہ یہ جدید دور ہے تم بولو نہیں، یہ آیورویدک کے علاج کا زمانہ ہے۔ جمہوریت ہی حرفِ آخر ہے اسلام نہیں، تو بات بنتی نہیں۔ لوگ کہتے

ہیں یہ نظام نہیں چلا سکتے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وقت کے ساتھ لوگ اسلامی جماعتوں پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ اس چیز کا تعلق وقت سے نہیں حکمتِ عملی سے ہے، اسے بدلنا چاہیے۔

س: سنا ہے آپ نے کسی جگہ یہ کہا تھا کہ ہندو بڑی اچھی قوم ہے؟

ج: (ہنستے ہوئے) ہاں کہا تھا۔ اگر وہ اچھے نہ ہوتے تو آج ۲۰ کروڑ وہاں، ۱۸ کروڑ یہاں اور ۲۲ کروڑ بنگلہ دیش میں مسلمان نہ ہوتے۔ انھوں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو پاکستان کیسے بنا ہوتا۔

ہمارا کام پیغام دینا ہے۔ وہ ہم سے ٹھیک سے نہیں ہوتا۔ عرب سے آئے چند لوگوں کی وجہ سے پچاس کروڑ مسلمان ہوگئے ہیں تو اب اچھی طرح اسلام پھیلے تو مزید لوگ کیوں نہیں قبول کریں گے۔

س: ایسا لگتا ہے ڈاکٹر ذاکر نائیک وہاں بڑا کام کر رہے ہیں۔ بہت لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی دعوت پر؟

ج: ہمارے پاس کوئی ثبوت (Proof) نہیں ہے۔ ورنہ جتنے مسلمان وہ کہتے ہیں اگر وہ تعداد مردم شماری میں شامل ہو جاتی تو نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ اس تعداد میں کافی مبالغہ پایا جاتا ہے۔ بہرحال کام وہ اچھا کر رہے ہیں مگر ذمہ دار مسلمان تنظیمیں ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کا انداز الگ ہے۔ بہت لوگ ان کو سننے آتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ تامل ناڈو میں جماعت کے اخبار کا ایڈیٹر ایک ہندو ہے؟

ج: ہر شعبے کا کام اس کے ماہر لوگوں سے لینا چاہیے۔ جماعت کے اس پرچے کی اشاعت لاکھ سے زیادہ ہے۔ بہت مقبول اخبار ہے وہاں کا۔

س: آپ نے علی گڑھ میں بھی وقت گزارا۔ انگریزی میں گریجوایشن کی اور ایم اے بھی کیا۔ تعلق آپ کا تامل ناڈو سے ہے۔ اتنی اچھی اردو بولتے ہیں آپ؟ تامل تو ضرور آتی ہوگی؟

ج: نہیں، سمجھتا ہوں، بول نہیں سکتا۔ ہماری رہائش جس علاقے میں تھی وہ اردو بولنے والوں کا تھا۔ یہ لکھنؤ سے آئے تھے۔ ویسے کرناٹک میں چھے فیصد مسلمان ہیں۔

س: آپ نے اپنی جماعت کا مرکز دہلی بنایا جبکہ جنوبی ہند میں آپ کا کام زیادہ ہے؟

ج: دہلی دارالحکومت ہے اس لیے۔ ہمارا مرکز تعمیر ہو رہا ہے۔ اس میں ہسپتال ہے۔ مسجد ہے مکتبہ ہے، مہمان خانے ہیں، دفاتر ہیں۔

س: بھارت میں اگرچہ بہت سے مسائل ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ کرپشن اور بدعنوانی کا مسئلہ انا ہزارے کی قیادت میں عوامی تحریک کی شکل میں سب سے بڑے مسئلے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ عوام کے اندر اس قدر زبردست بیداری کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: کرپشن تو ہمارے ہاں شروع سے ہی بہت زیادہ رہی ہے۔ مگر جس بھیانک روپ میں اب اس کا راج ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ اب تو یہ ہماری سیاست اور عوامی زندگی کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رشوت کے بغیر اس کا کام نہیں ہوگا۔ بغیر رشوت کے جائز کام بھی نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں جتنی کوششیں ہو رہی ہیں ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مگر ہمارا خیال ہے کرپشن اور بدعنوانی ابھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ نئے نئے روپ اور رخ سے ابھرتی رہے گی۔ اس کے مکمل خاتمے کی بظاہر ۲ رہی صورتیں ہیں:

۱۔ پورے معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے

دورِ اوّل میں صحابہؓ کے درمیان بھی بعض اختلافات رہے مگر دین کی دعوت اور سربلندی کے لیے ان سب نے متحد ہو کر جدوجہد کی

کہ ہر شخص رشوت لینے اور دینے کو جرم سمجھنے لگے۔ چند لوگوں کے خلاف سیاسی یا قانونی اقدامات سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ فرد اور معاشرہ دونوں میں خدا کا خوف اور آخرت کی باز پرس کا خیال اور یقین پختہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ ہر آدمی جب اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ پائے اور رشوت لیتے اور دیتے ہوئے یہ بات اس کے ذہن میں رہے تو ناجائز کام سے خود بخود بچے گا۔ یوں کرپشن کے آگے ایک مضبوط بند باندھا جا سکے گا۔

س: مسلم پرسنل لاء، بھارت کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آپ اس کے نائب صدر بھی ہیں۔ یہ بورڈ اپنے مقاصد میں کتنا کامیاب ہو سکا ہے؟

ج: مسلم پرسنل لاء کے مسئلے کو ہم ہنگامی مسائل کی فہرست میں نہیں رکھ سکتے۔ دستور ہند نے اقلیتوں کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی جو آزادی دی ہے ضرورت ہے کہ اس کو باقی رکھنے کے لیے مسلسل کوشش ہوتی رہے۔

بعض اوقات مسلم پرسنل لاء سے متعلق عدالتوں کے فیصلے شریعت سے متصادم ہوتے ہیں اور اس کی جو تشریحات ہوتی ہیں وہ بھی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان کو اگر چیلنج نہ کیا جائے تو یہ فیصلے اور تشریحات آئندہ کے لیے نظیر بن جائیں گی اور آہستہ آہستہ پورا پرسنل لاء ہی متاثر ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح آبادی کے مختلف طبقات کے پرسنل لاء کو ختم کر کے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی آواز بھی بار بار اٹھائی جاتی ہے۔

سوال: ملت نہایت شدید حالات اور مختلف النوع مسائل سے دوچار ہے، مسلکی جھگڑوں میں کمی کیوں نہیں آئی؟

جواب: عالمِ اسلام میں بھی فقہی اور مسلکی اختلافات موجود ہیں اور اس پر بحث مباحثہ بھی ہوتا رہتا ہے لیکن جو شدت برصغیر (بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) میں پائی جاتی ہے وہ دیگر ممالک میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مسالک ہی کو ان کے ماننے والوں نے اصل دین سمجھ لیا ہے اور اس کے دفاع اور تائید و حمایت ہی کو دین کی سب سے بڑی خدمت تصور کرنے لگے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسی بنیاد پر ہر مسلک زندہ ہے اور وہ کسی قیمت پر دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مسلکی اختلاف دین و شریعت کا اصولی اختلاف نہیں، بلکہ اس کا تعلق ان چند احکام و مسائل سے ہے جن میں ایک سے زیادہ آراء کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ مسائل دین کے اساسات سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ان کی حیثیت جزوی اور فروعی ہے۔ ہر مسلک قرآن و حدیث کو سند مانتا ہے اور اس پر عمل کا دعویٰ کرتا ہے لیکن بعض احکام و مسائل میں دلائل کی بنیاد پر اختلاف ہے۔ کسی بھی مسلک کو بے دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ایک کی پشت پر دلائل ہیں۔ ان دلائل کی بنیاد پر یہ بحث رہتی ہے کہ کس مسئلے میں کس مسلک کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں تازہ رہے تو مسائل کے سلسلے میں شدت نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان مسائل پر ردوکد اور بحث و مباحثہ کے باعث دین کا مقصد، اس کی اصولی تعلیمات، اللہ اور اس کے رسولؐ سے تعلق اور وفاداری، سیرت و کردار کی بلندی، امت کا خیر امت ہونا اور اپنی اور دنیا کی فلاح کے لیے سرگرم عمل ہونے جیسے بنیادی امور سے ہماری توجہ ہٹ جاتی ہے۔ دورِ اوّل میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی بعض مسائل میں اختلافات رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان سب نے متحد ہو کر دین کی دعوت اور سربلندی کے لیے جدوجہد کی۔ اسی اسوہ کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

تعجّب ہوتا ہے آپ اتنی قوت رکھنے کے باوجود بے بسی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟

یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے اور اس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے اپنے حلقۂ اثر میں فقہی اختلافات کی شدت کو کم کیا بلکہ ایک لحاظ سے اس کو ختم کیا ہے۔ جماعت کے افراد مختلف مسالکِ فقہ سے تعلّق رکھتے ہیں لیکن ان کے درمیان یہ بحث کبھی نہیں اٹھتی کہ کون کس فقہی مسلک کا پابند ہے۔

س: ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کے حوالے سے بہت سے سوالات ہیں کہ یہ جماعت اسلامی کا نیا تجربہ ہے یا صرف سیاسی ونگ ہے؟ اس کی کمان جماعت کے ہاتھ میں ہوگی، اگر نہیں ہے تو جماعت سے اس کے تعلّق کی نوعیت کیا ہے؟ اس پارٹی کے قیام سے جماعت اپنے نصب العین اور طریقہ کار سے ہٹ تو نہیں جائے گی؟

فقہی اور مسلکی اختلافات کی جو شدت بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہے وہ دیگر ممالک میں نہیں

ج: ویلفیئر پارٹی ان مسائل کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے جو ملک کے دستور اور یہاں کے جمہوری نظام میں حل کیے جاسکتے ہیں۔ ان مسائل کا تعلّق براہِ راست مسلمانوں سے بھی ہے اور دیگر اقلیتوں اور پسماندہ طبقات سے بھی ہے۔ اس ملک میں مسلمان ۲۰ رکروڑ کے قریب ہیں۔ ان مسائل کا تعلّق ان کے وجود و بقا سے بھی ہے اور دینی شناخت کے ساتھ باعزت زندگی گزارنے سے بھی۔ غربت و افلاس اور جہالت کا ازالہ، دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا نظم، مدارس اور مساجد کا قیام، پرسنل لا میں عدمِ مداخلت، اوقاف کا تحفظ اور ان کا صحیح استعمال، عدل و انصاف کا حصول اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا اور اس کے لیے چارہ جوئی جیسے بہت سے مسائل ہیں۔ ان مسائل کی طرف جماعت کی شروع سے ہی توجہ رہی ہے، اس کے لیے وہ سیاسی سطح پر بھی مختلف تدابیر اختیار کرتی رہی ہے۔

اب جماعت کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ جماعت براہِ راست ملت کے مسائل کے حل کے لیے میدان میں آئے اور دوسری صورت یہ تھی کہ ان مسائل کے لیے ایک آزاد سیاسی پارٹی بنائی جائے۔ مسلمانوں کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان سے یہاں کی دوسری اقلیتیں بھی دوچار ہیں۔ ان کو بھی اس میں شریک کیا جائے۔ جماعت نے طے کیا کہ جماعت تو اپنے نصب العین اور اپنی طے شدہ پالیسی پر عمل کرتی رہے گی اور ملت کے عمومی مسائل جو دیگر اقلیتوں کے بھی مسائل ہیں، انھیں سیاسی سطح پر اٹھانے کے لیے ایک آزاد سیاسی پارٹی کے قیام کی تحریک کرے گی۔ اسی کے نتیجے میں ویلفیئر پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ذمہ داروں میں جماعت کے افراد کے ساتھ ملت کی بعض نمایاں شخصیتیں بھی شامل ہیں اسی طرح غیر مسلم حضرات کو بھی نمائندگی حاصل ہے۔

گفتگو جاری تھی اور سوالات بھی بے شمار باقی تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور سید منور حسن کمرے میں داخل ہوئے۔ ان سے مسکراہٹوں اور چند جملوں کے تبادلے کے ساتھ ہی ہم نے اپنا قلمدان سمیٹا، سید جلال الدین عمری نے اپنی اردو کتاب ''اسلام انسانی حقوق کا پاسبان'' پر بڑا خوشخط ایک جملہ ہمارے نام لکھا اور کتاب ہمارے حوالے کردی۔ جواباً ہم نے بھی اُردو ڈائجسٹ کے خوبصورت لفافے میں رکھے ہوئے رسائل کا تحفہ ان کی نذر کیا اور دونوں ''امرا'' سے مصافحہ اور معانقہ کرکے رخصت لی۔ عاطف مرزا پہلی بار منصورہ آئے تھے۔ وہاں کے پُرسکون ماحول، صفائی، نظم و ضبط اور سیکورٹی پر حیران تھے۔ ایک بھرپور نظر ہم نے اس بستی اور اس میں بسے دفاتر پر ڈالی اور واپسی کے لیے مین گیٹ کا رخ کیا۔

نقوشِ صحابہ

محبوب ابن محبوب کا دل نشیں تذکرہ

حضرت اُسامہ بن زیدؓ

وہ اپنے کالے رنگ اور چپٹی ناک کے باوجود اُن ۲ رخوش بختوں میں سے تھے جو کعبہ میں داخل ہوتے ہوئے آنحضورؐ کے دائیں بائیں ہوتے

حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کے اعتراض کا جواب دیا:
"اُسامہ، اللہ کے رسول ﷺ کو تجھ سے اور اُس کا والد تیرے والد سے زیادہ محبوب تھا"

ایسی خوبصورت تحریریں کم ہی لکھی جاتی ہیں

خالد محمد خالد/ ارشاد الرحمن

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب بیت المال سے مسلمانوں میں اموال تقسیم کر رہے تھے کہ آپؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کی باری آئی تو آپؓ نے ان کو بھی حصہ دیا۔

چونکہ حضرت عمرؓ بن خطاب لوگوں کے مقام و مرتبے اور اسلام میں ان کے کارناموں کے لحاظ سے انھیں مال دے رہے تھے، اس لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو خدشہ ہوا کہ کہیں میرا مقام دوسری صفوں میں نہ ہو، کیونکہ آپؓ اپنی اطاعت، جہاد اور پرہیز گاری کی بنا پر امید کرتے تھے کہ اللہ کے حضور سابقین میں سے ہوں گے۔ لہٰذا آپؓ نے فوراً اپنے والدِ گرامی سے سوال کیا ''آپؓ نے اُسامہ کو مجھ پر فضیلت دی ہے جبکہ میں تو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اتنے غزوات میں شریک ہوا ہوں کہ اُسامہ ان میں شریک نہیں تھے؟''

حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''اُسامہؓ اللہ کے رسولؐ کو تجھ سے اور اس کا والد تیرے والد سے زیادہ محبوب تھا۔''

☆☆

یہ حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اُسامہؓ ہیں! صحابہؓ میں حضرت اُسامہؓ کا لقب: الحِبّ بن الحِبّ (محبوب ابن محبوب) تھا اور صحابہ نے آپ کو یہ لقب دینے میں کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا بلکہ رسول اللہؐ کو آپؓ سے جو شدید محبّت تھی اس پر ساری دنیا رشک کرتی تھی۔

حضرت اُسامہؓ عمر میں نواسۂ رسول حضرت حسنؓ کے ہم عمر تھے اور حسنؓ اپنے حُسن و جمال اور سرخ و سفید رنگت میں اپنے نانا سے بہت زیادہ مشابہ تھے، جبکہ اُسامہؓ سیاہ چمڑی اور چپٹی ناک میں حبشی سے مشابہ تھے مگر رسول اللہؐ ان دونوں سے محبت میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ آپؐ اُسامہؓ کو اُٹھاتے اور اپنی ایک ران پر بٹھا لیتے، پھر حسنؓ کو اُٹھاتے اور دوسری ران پر بٹھا لیتے۔ پھر دونوں کو اپنے سینے سے لگاتے اور دُعا فرماتے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّھُمَا فَاَحِبَّھُمَا

''اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما!''

حضرت اُسامہؓ سے رسول اللہؐ کی محبت اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایک بار جناب اُسامہؓ دروازے کی چوکھٹ سے لغزش کھا کر گر پڑے تو چہرہ زخمی ہوگیا اور زخم سے خون بہنے لگا۔ رسول اللہؐ نے حضرت عائشہؓ کو اشارہ کیا کہ زخم سے خون پونچھ دیں مگر انھیں اچھا نہ لگا۔ رسول اللہؐ خود اُٹھے اور آگے بڑھ کر اُسامہؓ کے زخم سے خون پونچھنے لگے۔ آپؐ اس وقت محبت و شفقت بھرے الفاظ سے ان کو دلاسہ دے رہے تھے اور چُپ کرا رہے تھے۔

آپؓ کے والد رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت زیدؓ بن حارثؓ وہ شخص ہیں جس نے اپنے والدین اور خاندان پر رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دی۔ جی ہاں وہ شخص جس کو کھڑا کر کے رسول اللہ ﷺ نے تمام صحابہ کرامؓ کے سامنے یہ فرمایا تھا:

اُشْھِدُکُمْ اَنَّ زَیْدًا ھٰذَا بْنِیْ یَرِثُنِیْ وَاَرِثُہٗ

''میں تمھیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث بنے گا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔''

اس کے بعد حضرت زیدؓ کا نام مسلمانوں میں ''زید بن محمدؐ'' معروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ قرآنِ کریم نے دورِ جاہلیت کی اس ''رسم تبنیت'' کو باطل قرار دے دیا۔

یہ حضرت اُسامہؓ ان حضرت زیدؓ کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی کنیز اور آپؐ کی دایا حضرت اُم ایمن جناب اُسامہؓ کی والدہ ہیں۔

حضرت اُسامہؓ کی ظاہری شکل و صورت قطعاً اس لائق اور اہل نہ تھی کہ انھیں کوئی مقام و مرتبہ ملتا۔ مؤرخین نے آپؓ کو اسود (کالے بھجنگ)، افطس (چپٹی ناک والے) لکھا ہے۔

تاریخ نے صرف انھی دو الفاظ کے ذریعے حضرت اُسامہؓ کی شکل و صورت بیان کر دی ہے۔ مگر اسلام کب انسانوں کی ظاہری شکل و صورت کو کوئی اہمیت دیتا ہے؟ یہ دین کیسے اس چیز کو اہم قرار دے سکتا ہے جس کا رسولؐ تو یہ کہتا ہو:

اَلَا رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَہُ لَہٗ، لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ

''کچھ پراگندہ حال اور غبار آلود ایسے بھی ہیں جو دو بوسیدہ کپڑوں کے مالک ہیں اور ان کو کوئی مقام و مرتبہ نہیں دیا جاتا (لیکن) یہ اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی قسم دے دیں تو اللہ ان کی بات رد نہ کرے گا۔''

☆☆

مذکورہ بالا اصول جان لینے کے بعد ہمیں حضرت اُسامہؓ کی ظاہری شکل و صورت پر بحث کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہمیں ان کی سیاہ چمڑی اور چپٹی ناک پر بات نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ان تمام چیزوں کا اسلام کے میزان میں ذرہ بھر وزن نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام اور رسول ﷺ سے ان کی وابستگی میں کیا کچھ تھا؟

ان کی جاں سپاری میں کیا تھا؟
ان کی عفت و پاکبازی میں کیا تھا؟
ان کی استقامت و پامردی میں کیا تھا؟
ان کی پرہیزگاری اور بے نمائی میں کیا تھا؟
ان کے نفس کی عظمت اور زندگی کے شب و روز میں کیا تھا؟

آپؓ کی انھی تمام صفات نے آپؓ کو رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت اور عزت افزائی سے اتنا کچھ دلا دیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

وَاِنَّہٗ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَ اَبِیْہِ وَاِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ یَّکُوْنَ مِنْ صَالِحِیْکُمْ، فَاسْتَوْصُوْا بِہٖ خَیْرًا۔

''یقیناً اس کے والد کے بعد یہ مجھے محبوب ترین لوگوں میں سے ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ تمھارے نیک لوگوں میں سے ہوگا لہٰذا تم اس کے ساتھ بھلا معاملہ کرو۔''

حضرت اُسامہؓ ان تمام عظیم صفات اور خوبیوں کے مالک تھے جنھوں نے آپؓ کو رسول اللہ ﷺ کے دل کے قریب اور نظروں میں عظیم بنا دیا تھا۔

آپؓ قبولِ اسلام میں سبقت کا شرف پانے والے اور رسول اللہ ﷺ کی قربت میں سب سے آگے رہنے والے اوّلین مسلمانوں میں سے ۲ معزز و مکرم والدین کے بیٹے تھے۔

☆ آپؓ اسلام کے ان یکسو لوگوں میں سے تھے جنھوں نے تاریک جاہلیت کے گرد و غبار سے ذرا متاثر ہوئے بغیر اسلام کے بہار آفریں دور میں آنکھ کھولی اور اس کی صاف و شفاف فطرت کے اوّلین گھونٹ حلق سے نیچے اُتارے۔

☆ آپؓ اپنی کمسنی کے باوجود ایسے تنومند مومن اور طاقتور مسلمان تھے کہ اپنے دین و ایمان کی تمام تر ذمے داریوں کو مکمل وابستگی اور غالب آ کر رہنے والی عزیمت کے ساتھ اٹھایا۔

☆ آپؓ ذہانت و ذکاوت اور عجز و انکسار میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی راہ میں قربانی پیش کرنے کی ان کے ہاں کوئی حدود نہیں تھیں۔

☆ پھر آپؓ وہ آدمی تھے جو اس دینِ جدید میں رنگا رنگ لوگوں کی قربانیوں میں ممتاز اور افضل ٹھہرے۔

یہاں تک کہ اِس اسود و افطس نے قلبِ رسولؐ اور صفوفِ مسلمین میں بلند و بالا مقام پایا۔ کیونکہ اس دین نے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے، انسانوں کے درمیان آدمیت و انسانیت کے تمام پیمانوں کی اصلاح کر دی، فرمایا:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

''یقیناً تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی سب سے زیادہ معزز ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔''

ہم رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے روز مکہ میں داخل ہوتے دیکھتے ہیں تو یہ اسود و افطس، اُسامہ بن زیدؓ آپؐ کے پیچھے سوار دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ اکثر کعبہ میں داخل ہوتے ہیں تو حضرت بلالؓ و حضرت اُسامہؓ آپؐ کے دائیں بائیں ہوتے ہیں...... یہ ۲ آدمی جن کی چمڑی شدید ترین سیاہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جس کو یہ اپنے پاکیزہ و کبیرہ دلوں میں اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے اوپر تمام تر شرف و رفعت بہا دیتا ہے۔

☆☆

حضرت اُسامہؓ نے راہِ خدا میں فریضۂ جہاد کی ادائی کا عزم بچپن ہی سے کر لیا تھا۔ آپؓ غزوۂ اُحد میں شرکت کے لیے جانے والے ان کم سنوں میں تھے جنھیں رسول اللہؐ نے واپس بھیج دیا تھا۔ جب غزوۂ خندق پیش آیا تو حضرت اُسامہؓ اس موقع پر بھی جنگ میں شرکت کا عزم لیے اپنے ہم عمروں کے ہمراہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ آپؓ اس وقت اپنی ایڑیاں بلند کر کے اپنے قد کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ رسول اللہؐ جنگ میں شرکت کی اجازت دے دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کا یہ شوق اور منظر دیکھا تو اجازت دے دی۔

''اگر آپؓ شیر کی کچھار میں داخل ہوں تو مجھے پسند ہے کہ میں آپؓ کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤں، مگر یہ جنگ ایسا معاملہ ہے کہ میں اسے جائز نہیں سمجھتا''

(حضرت معاویہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ جنگ کے دوران اُسامہ بن زیدؓ کے نام خط سے اقتباس)

حضرت اُسامہؓ نے اس غزوہ میں شرکت کی تو آپؓ کی عمر صرف ۱۵ برس تھی۔ غزوۂ حنین کے موقع پر بھی آپؓ نے بڑی بڑی شخصیات کے جلو میں جنگ میں شرکت کی۔ معرکۂ موتہ میں بھی آپؓ شریک تھے۔ جب آپؓ کے والد حضرت زیدؓ بن ثابت مسلمان لشکر کی قیادت کرتے ہوئے رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے اور لشکر کے دوسرے ۲ کمانڈروں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں اس لشکر کو فتح نصیب ہوئی۔ اس موقع پر حضرت اُسامہؓ کی عمر ابھی ۱۸ برس مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ہجرت کے گیارھویں سال رسول اللہ ﷺ نے روم پر لشکر کشی کے لیے تیاری کا حکم صادر فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص و ابوعبیدہؓ بن الجراح جیسے بڑے بڑے صحابہ کو اس لشکر میں شامل کیا اور حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو اُن پر کمانڈر بنایا۔

کم عمری میں ہی جبکہ ابھی بیسویں برس کو بھی تجاوز نہیں کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا تو مسلمانوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر معاملے کو بڑا گمبھیر خیال کیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ ایک نوجوان اُسامہ بن زیدؓ کو ایک ایسے لشکر کا امیر بنا دیا گیا ہے جس میں بڑے بڑے انصار اور قد آور مہاجرین شامل ہیں۔

یہ سرگوشیاں رسول اللہ ﷺ تک پہنچیں تو آپؐ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا:

اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ يَطْعَنُوْنَ فِيْ اِمَارَةِ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ.....

وَلَقَدْ طَعَنُوْا فِيْ اِمَارَةِ اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ.....

وَاِنْ كَانَ اَبُوْهُ لَخَلِيْقًا لِلْاِمَارَةِ.....

وَاِنَّهُ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ بَعْدَ اَبِيْهِ.....

وَاِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ يَّكُوْنَ مِنْ صَالِحِيْكُمْ.....

فَاسْتَوْصُوْا بِهٖ خَيْرًا

"کچھ لوگ اسامہ بن زیدؓ کی امارت کے حوالے سے طعن کر رہے ہیں۔"

"اس سے قبل ان لوگوں نے اس کے والد کی امارت پر بھی طعن کیا تھا۔"

"حالانکہ اس کا والد امارت کے لائق اور اس کا اہل تھا۔"

"اس کے باپ کے بعد یہ مجھے سب سے زیادہ محبوب لوگوں میں سے ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ وہ تمھارے نیک لوگوں میں سے ہوگا۔"

"لہٰذا تم اس سے اچھا سلوک کرو۔"

ابھی لشکر تیاری میں تھا کہ رسول اللہؐ مبتلائے مرض ہوگئے۔ بیماری نے شدت اختیار کرلی تو لشکر روانگی سے رُک گیا تاکہ رسول اللہؐ کی بیماری کم ہو تو روانہ ہوا جائے۔ حضرت اُسامہؓ کہتے ہیں "جب نبیؐ کا مرض شدت اختیار کرگیا تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ بھی میرے ساتھ تھے۔ میں آپؐ کے پاس گیا تو دیکھا کہ آپؐ خاموش ہیں اور شدتِ مرض کے باعث کوئی بات نہیں کر رہے۔ آپؐ اپنا دستِ مبارک بلند فرماتے پھر میرے اُوپر رکھ دیتے۔ میں سمجھ گیا کہ آپؐ میرے لیے دُعا فرما رہے ہیں۔

☆☆

رسول اللہ ﷺ اس لشکر کی روانگی سے پہلے ہی وصال فرما گئے مگر آپؐ نے صحابہ کے لیے اپنی یہ حکمت بھری وصیت چھوڑی کہ:

اَنْفِذُوْا بَعْثَ اُسَامَةَ
اَنْفِذُوْا بَعْثَ اُسَامَةَ

"اُسامہ کی روانگی کا عمل مکمل کردینا۔"
"اُسامہ کی روانگی کا عمل مکمل کردینا۔"

خلیفۂ رسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس وصیت کو مقدس سمجھا اور ان نئے حالات کے باوجود جو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ آپؐ کے حکم اور آپؐ کی وصیت پر عمل کیا جائے۔

جب لشکر اپنے نوجوان کمانڈر کی کمان میں مدینہ سے نکلا تو خلیفۂ رسول حضرت ابوبکرؓ اس لشکر کو الوداع کرنے کے لیے باہر نکلے۔ خلیفۂ رسول پیدل چل رہے اور حضرت اُسامہؓ سواری پر سوار تھے۔ حضرت اُسامہؓ نے کہا: خلیفۂ رسول! یا تو آپ بھی سوار ہوجائیں یا میں بھی نیچے اُتر آتا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: بخدا نہ آپ اُتریں گے نہ میں سوار ہوں گا۔ کیا میں ایک گھڑی کے لیے اپنے قدموں کو راہِ خدا میں غبار آلود نہیں کرسکتا؟

پھر حضرت اُسامہؓ سے فرمایا: میں تمھارے دین و امانت اور خاتمۂ اعمال کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں تمھیں اُس کام کو کرنے کی نصیحت کرتا ہوں جس کا رسول اللہؐ نے تمھیں حکم دیا ہے۔

اسی دوران روم کا شہنشاہ ہرقل وصالِ رسول ﷺ کی خبر سنتا ہے تو ساتھ ہی اس لشکر کی روانگی کی اطلاع بھی اسے ملتی ہے جو حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں شام کی سرحدوں سے حملہ آور ہونے والا تھا۔ یہ خبر سن کر اسے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اس قدر قوت ہے کہ ان کے رسولؐ کی موت بھی ان کے منصوبوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

حضرت اُسامہ بن زیدؓ اپنے لشکر کو لے کر چل پڑتے ہیں اور اسے سرزمینِ فلسطین کے قلعہ داروم اور تخومِ بلقاء میں لے جا اتارتے ہیں۔ مسلمانوں کے دل سے رُوم کی ہیبت نکال دیتے ہیں اور ان کے سامنے شام، مصر، شمالی افریقہ حتیٰ کہ بحرِ ظلمات کی فتح کا راستہ ہموار کر دیتے ہیں۔ اس طرح روم پسپا ہوجاتا ہے اور اس کے بعد شام کی سرحدوں سے جزیرۂ عرب میں اسلام کے مرکز پر کوئی چڑھائی کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

لشکر اسلام یعنی لشکرِ اُسامہؓ کوئی قربانی دیے بغیر واپس آجاتا ہے۔ اس وقت مسلمان آپؓ کے بارے میں کہتے ہیں "ہم نے اُسامہ کے لشکر سے زیادہ محفوظ لشکر کوئی نہیں دیکھا۔"

☆☆☆

ایک روز حضرت اُسامہؓ رسول اللہ ﷺ سے درسِ حیات لیتے ہیں، ایک ایسا بلیغ درس کہ حضرت اُسامہؓ اسی کی روشنی میں زندگی کے صبح و شام اور شب و روز گزارتے رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور آپؐ کے بعد بھی جنابِ اُسامہؓ اسی طرزِ حیات اور منشورِ زندگی پر عمل پیرا رہے یہاں تک کہ خلافتِ معاویہؓ میں اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے دو برس قبل جنابِ اُسامہؓ کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا تھا جو ان بعض مشرکوں کی سرکوبی کے لیے نکلا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت اُسامہؓ امیر بنے تھے۔ بہرحال آپؓ اس مہم میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ آپؓ کی آمد سے قبل ہی آپؓ کی کامیابی کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچ گئی تو آپؐ بہت زیادہ خوش ہوئے۔

اس واقعہ کی باقی روداد ہم حضرت اُسامہؓ سے سنتے ہیں۔ حضرت اُسامہؓ فرماتے ہیں:

"میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اِدھر فتح کی خوشخبری دینے والا بھی آگیا۔ خوشخبری سُن کر آپؐ کا روئے مبارک دمک اٹھا۔ آپؐ نے مجھے اپنے قریب کیا اور فرمایا: "اب بتاؤ!"

میں نے آپؐ کو بتایا کہ جب دشمن قوم شکست کھا رہی تھی تو ایک آدمی میرے گھیرے میں آگیا۔ میں نے نیزہ اس کی طرف تانا تو اس نے فوراً کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ مگر میں نے اس کو نیزہ مار کر قتل کردیا۔

رسول اللہ ﷺ کا روئے مبارک متغیر ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا:

وَيْحَكَ يَا اُسَامَه..... فَكَيْفَ لَكَ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ؟

وَيْحَكَ يَا اُسَامَه..... فَكَيْفَ لَكَ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ؟

"اُسامہ ہلاک ہوجاؤ۔ اس کے لا الہ الا اللہ پڑھنے کے باوجود تم نے کیسے یہ کام کردیا؟"

''اسامہ ہلاک ہوجاؤ۔ اس کے لا الہ الا اللہ پڑھنے کے باوجود تم نے کیسے یہ کام کردیا؟''

آپؐ مسلسل یہی الفاظ میرے سامنے دہراتے رہے یہاں تک کہ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ میں ان تمام اعمال سے بری الذمہ ہوجاؤں جو میں نے کیے ہیں اور ازسرِنو اسلام کو قبول کروں۔ اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کی بات سننے کے بعد کسی ایسے آدمی کو قتل نہیں کروں گا جس نے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ پڑھا ہو۔''

☆☆

یہ ہے وہ عظیم درس جس نے حبیب ابن حبیب حضرت اُسامہؓ کو اس وقت سے لے کر مرتے دم تک زندگی کی ایک مخصوص سمت پر ڈال دیا۔ یقیناً یہ بڑا پُرحکمت درس تھا۔ ایسا درس جو رسول اللہ ﷺ کی انسانیت وعدل، اصولوں کی بلندی اور دین واخلاق کی عظمت سے پردہ ہٹاتا ہے۔

وہ شخص جس کے قتل پر رسول اللہ ﷺ نے افسوس کا اظہار کیا تھا، وہ ایک مشرک اور محارب تھا۔ اس نے جب لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا تو تلوار اس کے ہاتھ میں تھی جس کے ساتھ اس گوشت کا ٹکڑا لٹک رہا تھا جو اس نے مسلمانوں کے جسموں سے نوچا تھا۔ اس نے یہ الفاظ تباہ کردینے والے وار کے ڈر سے بچنے کے لیے کہے تھے یا پھر اپنے آپ کو یہ موقع فراہم کرنے کے لیے کہ وہ اپنے سامنے موجود مسلمانوں پر حملہ آور ہو اور جنگ کو ایک نئے مرحلے میں داخل کردے۔ اس کی نیت جو کچھ بھی تھی، اس نے یہ الفاظ ادا کردیے تھے۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل چکے تھے جس سے اُسی لمحے اس کا خون حرام اور زندگی محفوظ ہوگئی تھی! جی ہاں..... اس کی نیتیں خواہ کچھ بھی ہوں اور دل کے ارادے جو بھی ہوں، وہ محفوظ ہو چکا تھا۔

حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے رسول اللہ ﷺ کے کلمات سے وہ سبق حاصل کیا کہ رہتی زندگی تک اس کو دل و دماغ میں تازہ رکھا۔ جب رسول اللہ ﷺ اس موقع پر اس آدمی کا قتل محض اس بنا پر ممنوع قرار دے دیتے ہیں کہ اس نے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ کہہ دیا تھا، تو ان لوگوں کی حرمتِ نفس کا کیا حال ہوگا جو حقیقی مومن اور پکے مسلمان ہوں؟

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان بہت بڑا فتنہ رونما ہوتا ہے تو حضرت اُسامہؓ گوشہ نشین ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپؓ حضرت علیؓ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے مگر ان کی حمایت میں ایک مسلمان کو کیسے قتل کرسکتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہو اور آپؓ تو وہ آدمی ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے مشرک ومحارب کو قتل کرنے پر بھی یہ نظر تحسین نہیں دیکھا تھا جس نے شکست خوردگی اور فرار کے موقع پر لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا تھا!

آپؐ نے اس نازک موقع پر حضرت علیؓ کو یہ خط لکھا:

''اگر آپ شیر کی کچھار میں بھی داخل ہوں تو مجھے پسند ہے کہ میں آپؓ کے ساتھ اس میں داخل ہوجاؤں۔ مگر یہ (جنگ) ایسا معاملہ ہے جس کو میں جائز نہیں سمجھتا۔''

آپؓ اس نزاع اور اس جنگ کے دوران ایک عرصہ گھر پر ہی رہے۔ جب کچھ صحابہؓ آپؓ سے اس موقف کے بارے میں بحث کرنے کے لیے آئے تو آپؓ نے ان سے کہا ''میں اس آدمی سے کبھی جنگ نہیں کروں گا جس نے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا ہو۔''

اُس وفد کے ایک آدمی نے کہا ''کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

وَقَاتِلُوہُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ؟ (الانفال: ۳۹)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہوجائے۔''

آپؓ نے جواب دیا ''یہ لوگ مشرک تھے اور ان سے ہم نے جنگیں کیں حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین تمام کا تمام اللہ کے لیے ہوگیا۔''

۵۴ ہجری کو حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو ملاقاتِ الٰہی کا شوق ہوا اور آپؓ کی روح آپؓ کے پہلوؤں میں تلملائی اور اپنے رب کے حضور جا پہنچی۔

گلدستۂ رمضان

خوشخبری ہے اُن کے لیے جنھوں نے
ایمان کے ساتھ روزے رکھے،
اپنے مال کا کچھ حصہ روز اللہ کی راہ میں خرچ کیا،
اپنی زبان کو غیبت، چغلی اور فضول باتوں
سے بچایا، ذکر، دُعا اور تلاوت میں
اپنے آپ کو مصروف رکھا،
بھلائی کرنے کے موقعوں کی تلاش رکھی،
اہلِ خیر اور نیک لوگوں کے ساتھ
اُٹھنے بیٹھنے کی کوشش کی، اہلِ قبور کی
مغفرت کی دُعاؤں کے لیے
قبرستان گئے اور اللہ کی اطاعت اور
محبت کا جذبہ اپنے اندر پروان چڑھایا

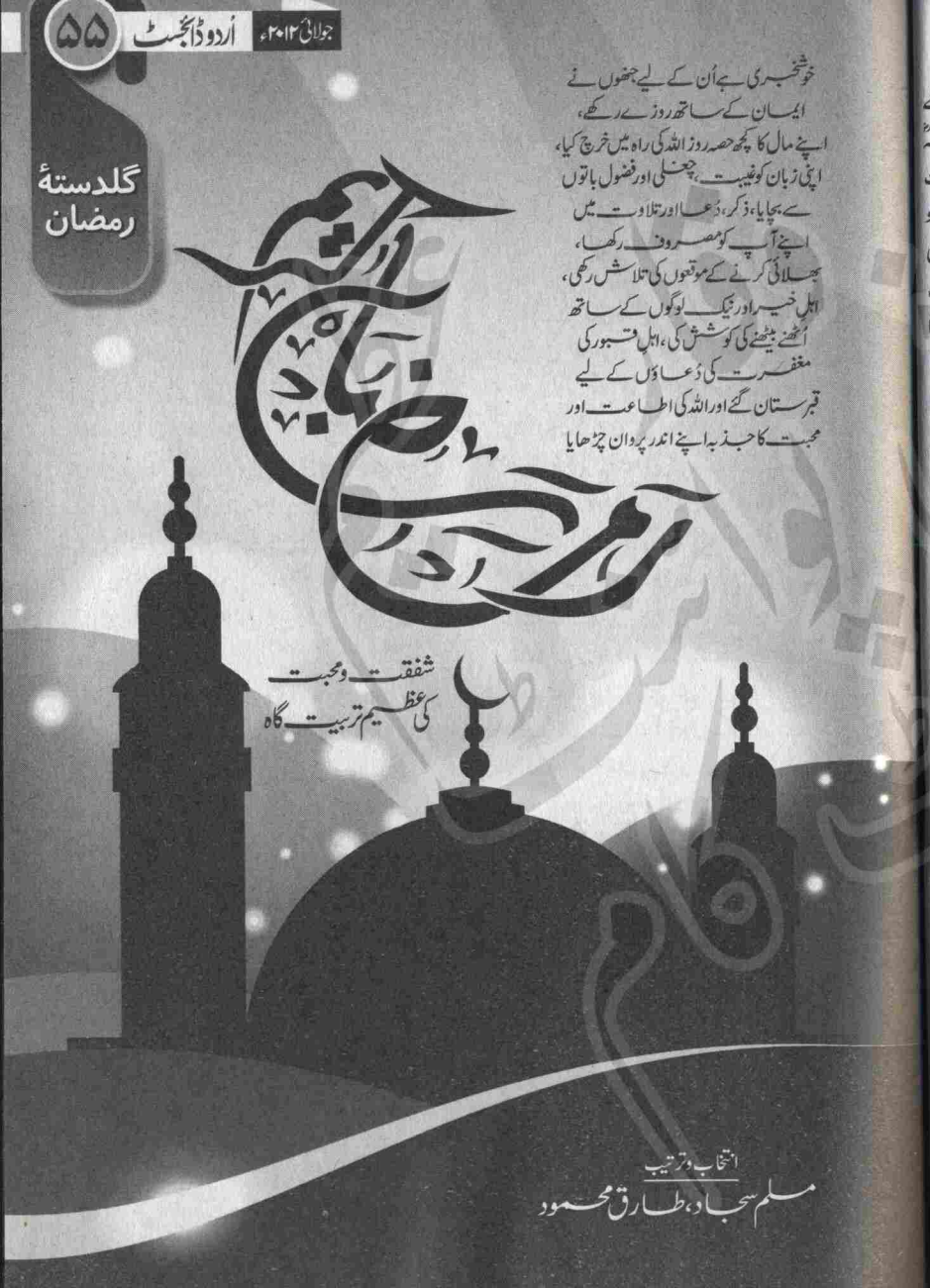

انتخاب و ترتیب
مسلم سجاد، طارق محمود

روزہ

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

روزہ اصطلاحِ شریعت میں اسے کہتے ہیں کہ انسان طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک اپنے آپ کو کھانے، پینے اور عملِ زوجیت سے روکے رکھے۔ جو روزے فرض ہیں وہ ماہِ رمضان کے ہیں۔ غیبت، فحش، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکیدیں حدیث میں آئی ہیں۔

جدید و قدیم طب اس پر متفق ہے کہ روزہ جسمانی بیماریوں کو دُور کرنے کا بہترین علاج اور جسم انسان کے لیے ایک بہترین مصلح ہے۔ پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبطِ نفس کی روح ساری اُمت میں تازہ ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے بھی مہینے بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔ روزہ تعمیل ارشادِ خداوندی میں تزکیۂ نفس، تربیتِ جسم، دونوں کا ایک بہترین دستور العمل ہے۔ اشخاص کے انفرادی اور امت کے اجتماعی ہر دو نقطۂ نظر سے..... اس سے مقصود تقویٰ کی عادت ڈالنا اور امت و افراد کو متقی بنانا ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے۔ جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے احتیاط رکھنے سے جسمانی صحت درست اور مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، بھوک خوب کھل کر لگنے لگتی اور خونِ صالح پیدا ہونے لگتا ہے، اسی طرح اس عالم میں تقویٰ اختیار کر لینے سے (یعنی جنسی عادتیں صحت روحانی و حیاتِ اخلاقی کے حق میں مضر ہیں، ان سے بچے رہنے سے) عالم آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت و استعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَاناً وَّ اِحْتِسَاباً غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

ترجمہ: جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔

خطبۂ رمضان

حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینا سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (نماز تراویح) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت (سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کا دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر ثواب ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ۷۰ فرضوں کے برابر ہے۔ یہ صبر کا مہینا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینا ہے اور یہی وہ مہینا ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزے دار کو افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے ہر ایک کے پاس تو افطار کرانے کا سامان مہیا نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی یا پانی کے ایک گھونٹ سے ہی کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے اور جو کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض (کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس ماہِ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ آتشِ دوزخ سے آزادی ہے۔ جو آدمی اس مہینے میں اپنے خادم کے کام میں تخفیف اور کمی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت اور اسے دوزخ سے رہائی دے دے گا۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

عبادت کا حقیقی تصور

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

قرآن کی رُو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (الذّٰریٰت ۵۱:۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

انبیاؑ جس غرض کے لیے دنیا میں بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان کو خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶)

"اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔"

پس ہمارے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ عبادت سے مراد کیا ہے اور اسلام میں جو عبادات ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے؟

دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر دنیوی زندگی کی ساری ذمے داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکرِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر اللہ اللہ جاری ہو بلکہ اصلی ذکرِ الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانونِ الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکّن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصل مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر ہو اور پھر خوفِ خدا تمھیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت اور مالیات اور صنعت کی باگیں سنبھالو اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو۔

ایک ایک قدم پر حرام
تمھارے سامنے ہزار
خوش نمائیوں کے
ساتھ آئے اور پھر
تمھاری رفتار میں

لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم وجھوٹ ودغا، فریب اور بدکاری کے راستے تمھارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادی لذتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی بازپرس کا خوف تمھارے لیے بندِ پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان ومال کا زیاں نظر آئے اور خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین وآسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہوجائے، پھر بھی تمھارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمھاری جبین عزم پر شکن تک نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت، اس کا نام ہے یادِ خدا، اسی کو ذکرِ الٰہی کہتے ہیں اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (الجمعۃ ۶۲:۱۰)

"پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہوجائے۔"

روزہ۔ ایک تربیتی کورس

اسلام انسان کی دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے کے ساتھ یہ بات لازم آجاتی ہے کہ اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی سی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دیا جاتا ہے مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے۔ مضبوط کردار پیدا کیا جائے۔ عادات اور خصائل کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کرلیا جائے بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اصلی عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں۔ یہ اس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انھی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس مخصوص کردار کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات وخصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادتِ الٰہی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ان ۴ چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

رمضان: شفقت ومحبت کی تربیت گاہ

(شیخ صالح بن حمید، خطیب مسجدِ حرام)

رمضان کا مہینا رحمت وشفقت کی تربیت کا مہینا ہے۔ جو شخص یہ تربیت حاصل کرتا ہے وہ اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس نے بچوں کی اچھی تربیت کی، یا اچھا کھانا تیار کیا ہے۔ جو اس تربیت گاہ سے گزر جاتا ہے اس کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ اپنے والدین کا ماتھا چومے اور ان پر ثابت کرے کہ اسے ان سے کتنی محبت ہے۔

جو شخص رمضان میں رحمت وشفقت کی تربیت گاہ میں شریک ہوتا ہے وہ عید کے دن اپنے ملازمین کو مبارکباد بھی دے سکتا ہے۔ جو شخص رمضان کا کورس مکمل کرلیتا ہے وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ فون اٹھا کر اُن لوگوں سے معذرت کرے جن کو اس نے تکلیف پہنچائی اور وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ جنھوں نے اسے اذیت دی، اُن سے درگزر کرے۔

جو شخص اس تربیت گاہ سے گزرتا ہے وہ اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دیتا ہے۔ وہ ان کی باتیں سنتا ہے، ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پر غور کرتا اور بڑے بڑے خوابوں کے بارے میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ایک لمحے کے لیے رک کر جائزہ لیں کہ ہم نے اس تربیت گاہ سے کیا پایا؟ کیا ہم اس تربیت گاہ کی شرائط پر پورے اترتے ہیں یا یہ کہ ہمیں ایک مہربان دل کی تلاش میں اس طرح کی مزید تربیت گاہوں میں شرکت کرنی ہوگی۔

(وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ) (المومنون ۲۳:۱۱۸)

اے نبی ﷺ کہو، میرے رب درگزر فرما اور رحم کر، اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔ (ترجمہ: گل زادہ شیرپاؤ)

رمضان اور ہماری ذمے داریاں

۱۔ ہم اب بات کو جان لیں کہ اللہ رب العالمین روزوں میں ہمارے ایمان کی آزمایش کر رہے ہیں تاکہ روزوں کے ذریعے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوسکے۔

۲۔ نیت کرکے روزہ رکھیں اس لیے کہ بے شک بغیر نیت روزہ رکھنے کا کوئی اجر نہیں۔

۳۔ اپنا سارا دن نیند میں ضائع نہ کریں۔

۴۔ اللہ رب العالمین سے توبہ کی تجدید کرلیں۔

۵۔ رمضان میں کثرت سے دعائیں، استغفار اور تضرع (عاجزی، گریہ وزاری) کریں۔

۶۔ روزہ رکھیں او رتمام اعضا کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے روکیں۔ (ترجمہ: ساجد انور)

ماہِ عزم

(خالد عبدالرحمٰن الدرویش)

ہر مسلمان اپنے آپ کو مخاطب کرکے ان ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرے:

۱۔ میں مہینا بھر اپنی نیت کو خالص رکھوں گا، نیک کام کروں گا اور بھلائیوں کے لیے آگے بڑھوں گا۔

۲۔ میں رمضان کا چاند دیکھ کر دُعا کروں گا۔ یہ میری خوشی کا اظہار ہوگا۔

۳۔ اپنے مال کا کچھ حصہ روزانہ اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا، خواہ تھوڑا ہی ہو۔

۴۔ خشوع وخضوع

اور غور وفکر کے ساتھ قرآن کریم کا ایک حصہ روز تلاوت کروں گا۔

۵۔ میں اپنی زبان کو غیبت، چغلی، جھوٹ اور فضول باتوں سے بچاؤں گا۔

۶۔ میں تمام فرض نمازوں کے بعد سنتیں ادا کروں گا، اللہ کے ہاں ان کی فضیلت کے پورے احساس کے ساتھ۔

۷۔ میں رمضان کا پورا مہینا اللہ کے ذکر (تسبیح، تہلیل اور تکبیرات) میں گزاروں گا۔

۸۔ نمازِ فجر کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک جتنا ممکن ہو سکے میں ذکر، دُعا اور تلاوتِ قرآن کریم کے لیے مسجد میں قیام کروں گا۔

۹۔ میں اپنے تمام رشتے داروں کے گھر جا کر انھیں اس مہینے کی آمد کی مبارک باد دوں گا۔

۱۰۔ میں پانچوں نمازیں مسجد میں جماعت کے ساتھ اور تکبیر اولیٰ کے ساتھ ادا کروں گا۔

۱۱۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق جوڑوں گا اور اپنی آنکھ، کان اور تمام اعضا کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچاؤں گا۔

۱۲۔ میں قیام اللیل کے ثواب کی نیت سے پوری نمازِ تراویح باجماعت ادا کروں گا۔

۱۳۔ میں اپنے آپ سے پوچھوں گا کہ میں رمضان میں کتنی بھلائیاں کر سکتا ہوں، پھر جواب کے مطابق ایک قابل عمل پروگرام ترتیب دوں گا۔

۱۴۔ میں اس مبارک مہینے میں ہر وقت بھلائی کے کسی موقع کی تلاش اور تاک میں رہوں گا، کیونکہ اس مہینے میں بھلائی کا اجر کئی گنا ہو جاتا ہے اور یہ وقت بڑی جلدی گزر جاتا ہے۔

۱۵۔ میں اس مہینے میں مسجد کی سطح پر، ملازمت کی سطح پر اور سفر کے دوران نئے تعلقات بنانے کی کوشش کروں گا۔

۱۶۔ میں اس ماہِ مبارک میں پوری دنیا میں موجود اپنے مسلمان بھائیوں کے حالات سے آگاہی حاصل کروں گا اور ان کے لیے دعائیں کروں گا۔

۱۷۔ میں اپنے گھر، دفتر اور گاڑی میں ایسی ایمان افروز کتابیں، رسائل اور سی ڈیز رکھوں گا جنھیں میں اس مبارک مہینے میں اپنے مسلمان بھائیوں کو ہدیہ کر سکوں۔

۱۸۔ میں اپنے امام مسجد کو ایسی عملی تجاویز پیش کروں گا جنھیں اہل محلّہ کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اپنایا جا سکے۔

۱۹۔ میں دن بھر خاص طور پر سحر و افطار کے وقت شوق سے دعائیں کروں گا اور اس کی پوری پابندی کروں گا۔

۲۰۔ میں محلے کی مسجد میں افطاری کے انتظامات میں اپنا مالی اور جسمانی حصہ ڈالوں گا اور اپنے مہمان بھائیوں کی پوری خدمت کروں گا۔

۲۱۔ میں خاندانی اور دوستانہ ملاقاتوں میں فلاحی، دعوتی اور اصلاحی تجاویز پیش کروں گا اور نیکی کے اس موسم میں وہ ضرور انھیں قبول کریں گے۔ انھیں ان اہم کاموں کے لیے تیار کروں گا۔

۲۲۔ میں درج ذیل عبادتوں کا خاص خیال رکھوں گا:

۱۔ افطار میں جلدی کرنا

۲۔ سحری ضرور کھانا اور اس میں تاخیر کرنا

۳۔ دوسروں کو کھانا کھلانا

۴۔ طاق عدد کھجوروں سے افطار کرنا

۵۔ جو مجھے گالی دے، یا کوئی بدسلوکی کرے، اس سے یہ کہنا کہ ”میں روزے سے ہوں۔“

۶۔ فضول باتوں اور لایعنی مشغلوں سے اجتناب کرنا

۷۔ لیلۃ القدر کی تلاش کرنا

۲۳۔ نمازِ تراویح میں امام قرآن کا جو حصہ پڑھتا ہے، میں اسے غور سے سنوں اور اسے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا ثواب بھی ملے گا۔

۲۴۔ میں اس ماہِ مبارک میں اہل خیر، داعیانِ دین اور نیک لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی کوشش کروں گا تاکہ میں ان کی برکت اور علم سے مستفید ہوں۔

۲۵۔ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتے ہوئے اس بابرکت مہینے میں اپنے دل اور زبان کو لفظ الحمدللہ کا عادی بناؤں گا۔

۲۶۔ میں اپنے اہل وعیال اور ملنے جلنے والوں کو اس بات پر آمادہ کروں گا کہ وہ رمضان سے شعوری طور پر استفادہ کریں۔

۲۷۔ میں اس مہینے اپنی آمدنی کا ایک حصہ رمضان کے پروگرامات کے لیے مخصوص کروں گا۔

۲۸۔ میری زبان سے ہر وقت دعائیں جاری ہوں گی۔ والدین، مسلمان مرحومین اور غلبۂ اسلام کے لیے وقت مقرر کروں گا تاکہ ناغہ نہ ہو۔

۲۹۔ میں سحری کے بعد اور افطاری کے وقت اپنے گھر میں ذکر و دعا کے لیے ایک مختصر مجلس منعقد کروں گا۔

۳۰۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مہینے اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ملازمت کے ساتھیوں سے مسلسل رابطہ رکھ کر اور انھیں بھلائی کے کاموں کی ترغیب دے کر ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کروں کہ ان میں میرا کردار سب سے فعال اور نمایاں ہو۔

۳۱۔ میں اس مہینے بھلائی کے کاموں کے حوالے سے اپنے لیے ایک ڈائری ترتیب دوں گا جس میں یہ چیزیں خاص طور پر شامل ہوں گی: مریض کی عیادت، نمازِ جنازہ میں شرکت، صلۂ رحمی، دوستوں کے ہاں جانا، عوامی فلاح و بہبود اور ہر پریشان حال کو خوش کرنا۔

۳۲۔ میں بروقت ڈیوٹی پر حاضری کو اپنا معمول بناؤں گا اور سارا مہینا پوری پابندی سے کام کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی یہ عادت بنالوں گا۔

۳۳۔ میں ہمیشہ اللہ کے سامنے توبہ کروں گا۔ آئندہ رمضان سے پہلے، اس کے دوران اور اس کے بعد مستقل طور پر اسے اپنی عادت بناؤں گا۔

۳۴۔ کوشش کروں گا کہ اہل محلّہ میں کچھ سمجھ بوجھ پیدا ہو جائے تاکہ میں انھیں سیدھے راستے پر لا سکوں۔ اس طرح ان کے دلوں میں بھلائی کی محبت پیدا ہو جائے گی۔

۳۵۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں کو دعوتی مقاصد کے لیے مختصر موبائل پیغامات (SMS) ارسال کروں گا جس میں انھیں اس بابرکت مہینے میں بھلائی کے کاموں کی طرف متوجہ کروں گا۔ اس طرح میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے اللہ کی اطاعت کا کام لیتے ہوئے روزانہ کم از کم ۱۰ ایس ایم ایس ارسال کروں گا۔

۳۶۔ میں اپنے اہل خاندان کو اپنے گھر افطار کی دعوت دوں گا، اس شعور کے ساتھ کہ روزہ کھلوانا اور صلۂ رحمی کا خیال رکھنا مسلمان ہونے کا تقاضا ہے۔

۳۷۔ ایسی گفتگو کروں گا جو کسی بھلائی کو آگے بڑھائے اور کسی برائی کے راستے میں رکاوٹ بنے، کسی کو شرح صدر عطا کرے، یا کسی کے دل پر کوئی

سفرنامہ

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

سفر ہے شرط

اُردن، سویڈن، جرمنی اور فرانس کے کاروباری دوروں کا دلچسپ احوال

طیب اعجاز قریشی

جہاز

نے جیسے ہی عمان ہوائی اڈے کے رن وے کو چھوا تو میری نظریں بے تابی سے جہاز کی کھڑکی سے اُردن کی سرزمین کو دیکھنے لگیں۔

عمان کا ہوائی اڈہ چھوٹا تھا مگر وہاں جہاز اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ عمان میں داخل ہوتے ہی ہمارا اشتیاق اس کے تاریخی مقامات کی سیر کے لیے بڑھتا گیا۔

اردن اسلامی تاریخ کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ بلکہ یہ جزیرہ نمائے عرب کے بعد پہلا علاقہ ہے جہاں اسلام پہنچا۔ رسول کریمؐ کے کئی صحابہؓ کی قبریں یہاں موجود ہیں، جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں کھپایا اور دینِ حق کو ہم تک پہنچایا۔ ان صحابہؓ کبار میں حضرت زیدؓ بن حارث (ان کو حضرت خدیجہؓ نے نبی کریمؐ کو شادی کے موقع پر ہبہ کیا اور آپؐ نے

شب قدر سال بھر کی سب سے بہترین رات ہے جس میں ایک نیک عمل ہزار مہینوں کے عمل سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں، وہ رات سلامتی ہے طلوع فجر تک۔'' (سورۃ القدر)

امام بخاری نے ابوہریرہؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے شب قدر میں ایمان اور خود احتسابی کی حالت میں قیام کیا تو اللہ رب العالمین اس کے پچھلے تمام گناہ معاف فرمادیں گے۔''

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ''شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں۔'' (صحیح بخاری)

انفاق فی سبیل اللہ

کیا آپ اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہیں؟
کیا آپ جنت میں اعلیٰ درجات کی خواہش رکھتے ہیں؟
کیا آپ جنت میں نبی کریم ﷺ کے قرب کے طلب گار ہیں؟
کیا آپ جسمانی صحت چاہتے ہیں؟
کیا آپ توشۂ آخرت جمع کرنا چاہتے ہیں؟
تو پھر اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور کمی سے نہ گھبرائیں.....!

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کردے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی۔ اور اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔'' (البقرۃ ۲: ۲۴۵)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں:

''لوگوں کو اس بات کا خیال کرکے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔'' (النساء ۴: ۹)

کیا آپ چاہتے ہیں کہ فرشتے آپ کے لیے دعا کریں کہ اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو مزید عطا فرما.....! تو پھر اللہ کے راستے میں دل کھول کر خرچ کیجیے۔

انفاق کا منافع

☆ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکیوں سے بھرا خزانہ
☆ جنت میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ
☆ رزق میں برکت
☆ آپ کی ضروریات پوری ہوں گی
☆ اللہ رب العالمین آپ پر خرچ کریں گے

(ترجمہ: حافظ ساجد انور)

انھیں اسی وقت آزاد کردیا۔ حضرت زیدؓ حضور ﷺ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کردیا اور حضور ﷺ نے آپؓ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے غزوہ موتہ میں آپؓ کو لشکر اسلام کا امیر مقرر کیا اور اسی جنگ میں آپ شہید ہو گئے)، حضرت شرجیلؓ بن حسن (آپؓ کا شمار اسلام قبول کرنے والے السابقون الاوّلون میں ہوتا ہے۔ آپؓ نے نبی کریمؐ کے ساتھ تقریباً تمام غزوات میں شرکت کی)، حضرت معاذؓ بن جبل (آپؓ انصار مدینہ سے تعلق رکھتے تھے اور عقبہ ثانیہ کے موقع پر آپ نے اسلام قبول کیا۔ آپؓ کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت میں حلال وحرام کا سب سے بڑا عالم معاذؓ بن جبل ہے۔ رسول اللہ نے آپؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔) حضرت جعفرؓ بن ابی طالب (آپؓ نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور اولین اسلام لانے والوں میں شامل تھے۔ آپؓ نے اسلام کی خاطر پہلی مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت اور نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کی ترجمانی کی۔ آپؓ نے بھی غزوہ موتہ میں شہادت پائی) اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح (امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح اسلام قبول کرنے والے السابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ غزوۂ بدر میں اپنے سگے کافر باپ عبداللہ بن جراح کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ امانت داری حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کی اہم ترین خوبی تھی۔ غزوۂ اُحد میں آپؓ نے نبی کریم ﷺ کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی اور حضور ﷺ کے چہرہ مبارک میں گھسی ہوئی لوہے کی کڑی نکالتے وقت آپؓ کے سامنے کے دونوں دانت ٹوٹ گئے۔ آپ کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جنھیں نبی کریمؐ نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی) شامل ہیں۔ اسلامی تاریخ کی کئی اہم جنگوں کے مقامات بھی یہاں ہیں۔

میں جب پیارے رسول ﷺ کے ان جانثار صحابہؓ کی قبور پر پہنچا تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اور دل سکون کی دولت سے مالا مال تھا۔ رسول پاکؐ کی زبان مبارک سے نکلا تھا ''اصحابی کالنجوم'' میرے صحابہؓ ستاروں کے مانند ہیں یعنی راستہ دکھانے والے۔ یہاں ہر صحابیؓ کی قبر جسے یہاں مقامی لوگ مقام کہتے ہیں کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ جن میں نوافل ادا کرنے کے بعد اپنے ملک اور بزرگوں کے لیے اس تصور کے ساتھ دعائیں کیں کہ جہاں اللہ کے نیک اور مومن بندے ہوں وہاں اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے ایک دن میں اتنے جلیل القدر صحابہؓ کی قبور کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

عمان اردن کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ اسے ملک کا سیاسی، ثقافتی اور تجارتی مرکز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کے قدیم ترین اور مسلسل آباد رہنے والے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شہر کی آبادی ۲٫۸ ملین کے قریب ہے۔ یہاں پر بے شمار بڑی کمپنیوں کے علاقائی دفاتر ہیں۔ کم وبیش ۵ ہزار سال پرانا ہونے کی وجہ سے اسے خطہ کا ایک اہم سیاحتی مقام سمجھا جاتا ہے۔

عمان کے قریب موجود آثارِ قدیمہ میں سے ایک اہم جگہ ایک پرانا قلعہ (Citadel) تھا، یہاں ہونے والی کھدائی سے قدیم رومی اور اسلامی ادوار کے حوالے سے اہم باقیات سامنے آئی ہیں۔ رومی دور کا تھیٹر بھی توجہ کا مرکز تھا۔ تھیٹر کے سامنے ستونوں کی ایک لمبی قطار اب بھی

مرکز تھا۔ تھیٹر کے سامنے ستونوں کی ایک لمبی قطار اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

عمان کے قریب ایک مشہور جگہ اصحابِ کہف سے منسوب غار ہے۔ اس غار کا ذکر قرآنِ پاک میں سورۂ کہف میں آتا ہے۔ خدائے واحد کے ماننے والے ان نیک افراد نے ظالم حکمرانوں سے بچنے کے لیے اس غار میں پناہ لی تھی۔

ہمیں عمان کے قریب ہی صحرا میں واقع ایک فیکٹری کا دورہ کرنا تھا۔ حکومت اس علاقے کو صنعتی لحاظ سے ترقی دینا چاہتی تھی وہ لوگوں کو آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ان علاقوں میں فیکٹریاں لگائیں اگرچہ حکومت کی طرف سے ابھی یہاں بجلی، گیس اور دوسری سہولتیں مہیا نہیں کی گئیں۔ میرے کاروباری دوستوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے اس فیکٹری کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ فیکٹری بھی اُن تمام مراحل اور مشکلات سے گزر رہی تھی جن کا سامنا ہم پاکستان میں کر رہے ہیں۔ ان سے سیکھ کر ہم اپنے ہاں بہت سی مثبت تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔

عمان ہوائی اڈے پر واپس جاتے ہوئے ایک خوبصورت مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا تجربہ بھی ایک یادگار لمحہ تھا۔ ہمارے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گئی لیکن جمعہ کی اذان میں ابھی وقت باقی تھا۔ اکثر نمازی قرآن کی تلاوت میں مشغول تھے۔ اذان کے بعد امام صاحب نے خطبے کا آغاز کیا۔ کیا فکر انگیز خطبہ تھا! وہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان تو ایک ملتِ واحد ہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم کتنے تقسیم در تقسیم ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مساجد کی بنیاد بھی مسالک اور تفرقہ پر رکھتے ہیں جو کہ ہمارے نبی ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ امام صاحب نے حصول علم کے حوالے سے بھی اسلامی نقطۂ نظر بڑے احسن انداز میں بیان کیا۔ امام صاحب کی تلاوت اتنی خوبصورت تھی کہ دل چاہتا تھا کہ وہ تلاوت کرتے ہی جائیں۔ نماز کے فوراً بعد ایک میت امام کے سامنے رکھی گئی تو سب نمازیوں نے مل کر نمازِ جنازہ ادا کی۔ ہمارے ہاں بالعموم مسجد میں میت نہیں لائی جاتی۔ خانۂ کعبہ اور مسجدِ نبویؐ کے بعد میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ میت کو مسجد کے اندر رکھا گیا اور نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نمازیوں کے حلیے اور لباس ایک دوسرے سے مختلف لیکن وہ ملتِ واحد کے تصور کی عملی شکل بنے ہوئے تھے۔

رات کو ہوٹل میں قیام تھا۔ وہیں سے بحیرۂ مردار (Dead Sea) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے گریس نما پانی میں تیرنے کا تجربہ بھی ناقابل فراموش رہا۔ اس کا پانی

ایسا ہے کہ اس میں کوئی بھی شے ڈوبتی نہیں۔ بحیرۂ مردار اصل میں ایک بند جھیل ہے جس میں دریائے اردن کا پانی آ کر جمع ہوتا ہے اور اس پانی کا نکاس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس میں نمکیات کی بہت زیادہ مقدار جمع ہوگئی ہے جو کہ ایک کلوگرام پانی میں ۳۵۰ گرام تک ہے جبکہ دنیا کے دوسرے سمندروں میں یہ مقدار ۴۰ گرام تک ہوتی ہے۔ نمکیات کی بہتات کی وجہ سے اس میں کوئی بھی زندہ شے نہیں پائی جاتی اسی لیے اس کا نام بحیرۂ مردار پڑ گیا۔ بحیرۂ مردار کا پانی ایسا گاڑھا سیال ہے کہ آپ اس کی سطح پر لیٹ کر اخبار یا کتاب بینی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ۷۵ کلومیٹر طویل اور ۶ سے ۱۶ کلومیٹر تک چوڑا ہے۔ ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ نہاتے وقت اس بات کی احتیاط کریں کہ پانی کی کوئی چھینٹ آنکھوں میں نہ پڑے لیکن بے احتیاطی پر میری آنکھوں میں ایک چھینٹ پڑ گئی جس کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ یہاں کی مٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جلدی بیماریوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اسی لیے پانی سے باہر نکل کر ہم نے وہاں کی مٹی کو جسم پر اچھی طرح ملا۔ اس مٹی کو وہاں سے ساتھ لانے کی اجازت نہیں۔ وہاں کی مقامی ادویہ ساز کمپنیاں اس مٹی اور بحیرۂ مردار کے پانی سے بہت سی ادویات اور کاسمیٹکس کا سامان بنا رہی ہیں جو پوری دنیا میں مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے۔

بحیرۂ مردار کے اردگرد کے علاقے میں قومِ لوط آباد تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبیح عادت کی وجہ سے زمین پر اُلٹا دیا۔ یہاں کی زمین کی ساخت دیکھ کر عذاب الٰہی کے آثار نظر آتے ہیں اور شاید بحیرۂ مردار بھی اسی عذاب کی یادگار ہے۔ یہاں کا علاقہ زمین کے سب سے نچلے درجے (Point) کے طور پر بھی جانا جاتا ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ۴۰۰ میٹر نیچے ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا درجہ حرارت باقی علاقوں سے نسبتاً زیادہ ہے۔ یہاں سے ارضِ فلسطین کی روشنیاں بھی نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر قبلۂ اول کو دیکھنے کی تڑپ دل میں پیدا ہوتی ہے۔

عمان میں پانی کی شدید قلت ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی منصوبہ بندی قابلِ رشک ہے۔ آپ کو یہاں کئی ایسے علاقے دیکھنے کو ملیں گے، جہاں بڑے بڑے قطعات پر جدید زراعت کے اصولوں پر مبنی ٹنل فارمنگ اور ڈرپ اری گیشن کے نظام کے ذریعے سبزیاں اور پھل اُگائے گئے ہیں۔

اُردن کے بعد ہماری اگلی منزل جرمنی کے شہر ڈسلڈارف (Dusseldorf) میں پرنٹ اور میڈیا کی صنعت سے تعلق رکھنے والے ڈروپا کے عالمی میلے میں شرکت تھی۔ ڈروپا پرنٹنگ اور پیکنگ کی مشینری کے حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی نمائش سمجھی جاتی ہے۔ جو ہر ۴ سال بعد ہوتی ہے۔ جس میں پوری دنیا سے لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں اور نئی ٹیکنالوجی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ کمپنیاں بڑے فخر سے اپنی نئی مشینری اور پروڈکٹس لوگوں کے جائزے کے لیے پیش کرتی ہیں۔ بڑی مشینوں کو یہاں تقریباً ۱۵ دن تک روز چلا کر دکھایا جاتا ہے تاکہ کسٹمرز ان کی پرفارمنس اچھی طرح دیکھ کر فیصلہ کر سکیں۔ بلاشبہ اس نمائش پر ان کمپنیوں کے لاکھوں یورو خرچ آتے ہوں گے۔ اپنی مصنوعات متعارف کروانے کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ پرنٹنگ کا آغاز آج سے ۵۰۰ سال پہلے جرمنی ہی سے ہوا تھا۔ یہاں یہ خبر بھی افسردہ کر گئی کہ Man Roland جیسی پرانی اور بڑی کمپنی دیوالیہ ہوگئی ہے۔ یہ اخبارات اور کتابوں کی چھپائی کے لیے پرنٹنگ مشینیں بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی تھی۔ جس کے دیوالیہ ہونے سے ہزاروں کام کرنے والوں کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ کسی زمانے میں اُردو ڈائجسٹ کی پرنٹنگ بھی اسی کمپنی سے ہوتی تھی۔ جرمنی کی ایک اور بڑی کمپنی Heidelberger Druck بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہے۔ اس کی فروخت میں بھی کمی ہو رہی ہے۔ یہ پرنٹنگ پریس بنانے والی دنیا کی بڑی کمپنی ہے۔ اسے پچھلے ۳ سال میں ۶۶۷ ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔

ڈیجیٹل پرنٹنگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے بھی ان ۲ر بڑی آف سیٹ کمپنیوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

یورو ۱۰ر سال میں اس وقت انتہائی دباؤ کی حالت میں ہے۔ یورپ میں پیداواری لاگت بڑھنے کی وجہ سے انڈسٹری چائنا اور انڈیا کی طرف شفٹ ہو رہی ہے۔ اقتصادی حوالے سے یورپ کو ۲ر حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ سپین، یونان، پرتگال، آئرلینڈ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان ممالک کے ذمے بینکوں کے قرضے بہت زیادہ ہیں اور یہ ان کو ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس سے یورپی یونین کمزور ہو رہی ہے۔ دوسری طرف سویڈن، ڈنمارک اور جرمنی جیسے ممالک ہیں جن کا بینکوں پر انحصار کم ہے۔

ماہرینِ یورپ بحران کے ۲ر ممکنہ حل بتاتے ہیں۔ ایک حل تو یہ ہے کہ یورو کرنسی کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے لیکن اس کے کئی سیاسی اور معاشی مضمرات ہو سکتے ہیں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ یورپ کے تمام ممالک کے وسائل اور دولت کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے اور تمام ممالک اپنی خود مختاری اور حدود سے دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ اب الگ ہو جاؤ یا سپر سٹیٹ بن جاؤ جیسے ۲ر حل پیش کیے جا رہے ہیں۔

ایک بات واضح ہے کہ یہاں پر بہر حال انفراسٹرکچر موجود ہے۔ معاشی مشکلات کے باوجود لوگوں کے رویے ہم سے بہتر ہیں۔ کاروبار اور تجارت میں ایمان داری اور دیانت داری نظر آئے گی۔ جبکہ ہم احتجاج کے ایسے طریقے اپناتے ہیں کہ اپنا انفراسٹرکچر ہی تباہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ ہم نے یہاں ۲ر دن گزارے۔ اس مرتبہ یہاں وزیٹرز کی تعداد کافی کم محسوس ہوئی۔ معیشت کی سست روی یہاں بھی دیکھنے کو ملی۔

ڈسلڈارف سے بذریعہ ہائی سپیڈ ٹرین فرینکفرٹ پہنچے۔ یہاں سے ایس اے ایس کی پرواز کے ذریعے سٹاک ہوم کے ہوائی اڈے (Arland) پہنچے۔ یہاں سے ہماری منزل بذریعہ سڑک ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر واقع سویڈن کا شہر اورے برو (Orebro) تھا۔ جہاں ہمیں اپنی فیکٹری کی مشینری کے انتخاب کے لیے یورپ کی ایک کمپنی میں پہنچنا تھا۔

ہم جس کمپنی سے ملاقات کے لیے گئے وہاں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہمارے آنے پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ میرے ہم سفر اور چھوٹے بھائی ذکی اعجاز کے مسرت بھرے انداز سے پوچھنے پر میزبانوں نے بتایا کہ ہم ہر نئے آنے والے کسٹمر کے ملک کا جھنڈا اپنے ملک اور کمپنی کے جھنڈوں کے ساتھ لہراتے ہیں اور یہ ہماری پُرانی روایت ہے۔ شہر ریل کوری ڈورز (Corridors) کے ذریعے سٹاک ہوم سے جڑا ہوا ہے۔ یہاں میٹرو بس اور ٹرام کی سہولت موجود ہے۔ یہاں پبلک ٹرانسپورٹیشن (Transportation) کا نظام بہت عمدہ ہے۔ سویڈن کے لوگ اکثر اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ سویڈن اپنے زرمبادلہ کے ذخائر کے حوالے سے بھی خاصا مضبوط ہے۔ سویڈن میں جس کے پاس تین V ہوں اسے خوشحال سمجھا جاتا ہے۔ یہ تین V ہیں: Villa یعنی گھر، Volvo یعنی کار اور Vovve یعنی کتا۔ عورتیں بھی مردوں میں یہی تین V تلاش کرتی ہیں۔

سویڈن کے لوگ بہت ملنسار اور پاکستان کے حوالے سے مثبت خیالات رکھتے ہیں۔ سویڈن کی معیشت کا انحصار لکڑی (Timber)، ہائیڈرو پاور، لوہے کی کچ دھات پر ہے۔ اہم صنعتوں میں موٹر سازی، ٹیلی کام، فارماسوٹیکل، گھریلو مصنوعات، لکڑی، لوہا اور سٹیل کی مصنوعات شامل ہیں۔ سویڈن نے ۲۰۰۳ء میں یورو کو مسترد کر دیا تھا اور اپنی کرنسی کو اختیار کیے رکھا۔ فرنیچر بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی آئی کیا (IKEA) کی بنیاد بھی سویڈن میں رکھی گئی۔ یہ کمپنی ۶ء۲۵ بلین ڈالر کی مصنوعات سالانہ فروخت کرتی ہے۔ دنیا میں انجینئرنگ کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک سویڈن کی ABB ہے۔ یہ Robotics پاور اور آٹومیشن ٹیکنالوجی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا دائرہ کار ۱۰۰ر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ سویڈن کی کرنسی کرونے SEK ہے جو تقریباً ۱۵ر روپے کے

مساوی ہے۔

اورے برو کے بعد ہمارا اگلا پڑاؤ فرانس کا شہر Lyon تھا، جو پیرس سے ۴۷۰ کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ فرانس میں اس وقت صدارتی انتخاب ہو چکے تھے اور سوشلسٹ پارٹی کے فرانسس ہالینڈ فرانس کے ۲۴ ویں صدر منتخب ہو چکے تھے۔ یہ صدر فرانس متراں کے بعد دوسرے صدر تھے جن کا تعلق سوشلسٹ پارٹی سے ہے۔ دورانِ سفر ایک فرانسیسی خاتون سے سرکوزی کی شکست پر بات ہوئی۔ وہ خاتون سرکوزی کی شکست پر افسردہ تھی لیکن اس نے مجھے اس شکست کی چند وجوہات بیان کیں ان میں سرفہرست سرکوزی کی اپنی شخصیت اور ذاتی زندگی تھی۔ اس کی ایک مثال صدر بننے کے بعد اپنے دوستوں کے لیے ایک مہنگے ترین ریستوران میں ایک ضیافت کا اہتمام تھا۔ خاتون سرکوزی کی شکست کی وجہ بیان کر رہی تھی کہ اس نے صدر بننے کی خوشی میں ضیافت کا اہتمام کیا جس پر خاصی رقم خرچ ہوئی۔ دوسری مثال صدر کی پارلیمنٹ کے ذریعے اپنی تنخواہ میں کئی گنا اضافے کی منظوری لینا تھا۔ فرانس کے عوام کو یہ دونوں حرکتیں بڑی ناگوار گزریں کیونکہ عوام کا خیال تھا کہ فرانس ایک تاریخی اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے اور ان کا حکمران کسی اور طبقہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ صدر سرکوزی کی شکست کا تیسرا اہم فیکٹر مسلمان رائے عامہ کا سرکوزی کے خلاف ہونا بھی تھا۔ فرانس میں الجزائر، مراکش اور دیگر افریقی ملکوں کے مسلمان خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ حجاب کے معاملے پر سرکوزی حکومت کے سخت موقف کی وجہ سے مسلمان ووٹ منظم ہو کر سوشلسٹ پارٹی کو ملا جس کی وجہ سے سرکوزی کو شکست ہوئی اور سوشلسٹ پارٹی ایک لمبے عرصے کے بعد برسراقتدار آئی۔ صدر سرکوزی کی مقبولیت کا گراف اسی دن سے گرنا شروع ہو گیا تھا جب اس نے الیکشن جیتنے کی رات ایک مہنگے ترین ریستوران Fouquet میں درجن بھر مشہور کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز کے لیے ضیافت کا اہتمام کیا۔ یہ ریستوران پریس ایونیو دی چیمپس ایلسز پر واقع ہے۔ ضیافت کے اختتام پر تمام شرکا ایک کشتی میں بیٹھ کر مالٹا کے ساحلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسری بڑی وجہ اپنی بیوی Cecilia کو طلاق دے کر ایک ماڈل کارلا بروئی سے شادی کرنا تھا۔ یہ سرکوزی کی تیسری شادی تھی۔ فرانس کی تاریخ میں کسی صدر کا اپنی صدارت کے دوران بیوی کو طلاق دینے کا پہلا واقعہ تھا۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بورڈنی میں پوز بنوا کر تصاویر اُتراتے رہے۔ سرکوزی کو اپنی غلطیوں کا ادراک ہو چکا تھا۔ جس کا اس نے اعتراف بھی کیا۔ ابتر معاشی حالات اور بیروزگاری بھی اہم وجوہات میں شامل تھی۔ صدر سرکوزی نے چند معاشی اصلاحات بھی کیں جن میں ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال سے بڑھا کر ۶۲ سال کرنا شامل ہیں۔ اس نے یونان، پرتگال جیسے ملکوں کو معاشی پیکیج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

شروع شروع میں سرکوزی، چارلس ڈیگال جو دوسری جنگ عظیم کا ہیرو تھا، کے بعد سب سے زیادہ مقبول ہونے والا لیڈر تھا۔ لیکن جب اس نے دوبارہ الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو فرانس کی تاریخ کا سب سے غیر مقبول لیڈر تھا جو دوبارہ الیکشن کا امیدوار بنا۔ اس کا ایک مشیر فیبرک سیمن کہا کرتا تھا کہ فرانسیسی لوگ بادشاہوں کے سر قلم کرتے ہیں لیکن وہ ایک بادشاہ بھی چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ بادشاہ کی طرح ہی زندگی گزارے۔ دنیا بھر کی اسٹاک مارکیٹس سوشلسٹ صدر کی جیت پر بری طرح متاثر ہوئیں۔

میرے خیال میں عوام کے احتساب کی یہ شکل بہت متاثر کن ہے۔ کاش ہمارے ہاں بھی وہ حکمران جو اپنی نمود و نمائش پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں ایسے ہی عوامی احتساب کا سامنا کریں۔ ہم Bobst کمپنی بھی گئے۔ یہ پیکجنگ کمپنیوں کو مشینری اور دوسری خدمات دینے والی دنیا کی بڑی کمپنی ہے۔ یہاں بھی سکرین پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس استقبال نے بہت لطف دیا۔

سفر کے آخری مرحلے میں مشہور اور بارونق سٹریٹ

شانزے لیزا (Champs Elysees) میں ڈنر کیا۔ رئیل اسٹیٹ دنیا کا سب سے مہنگا علاقہ ہے۔ اپنے سینماؤں، کیفے (Cafe)، آسایشات کی دکانوں کے سبب دنیا بھر کے سیاحوں کا پسندیدہ مرکز ہے۔ کاروبارِ زندگی رات کو جلد بند ہو جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں رات کو مارکیٹ ۸ بجے بند ہونے کے اعلان پر شور مچایا جاتا ہے۔

ٹرین کے ذریعے واپس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے تو ٹرین ٹھیک ساڑھے دس بجے رُک گئی حالانکہ اس کی مقررہ منزل ابھی دُور تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہاں کا نظام ایسا ہے کہ ٹرین مقررہ وقت پر رُک جاتی ہے چاہے ابھی مقررہ منزل دور ہی کیوں نہ ہو۔ سارے مسافر اس سے آگاہ تھے۔ ہماری پریشانی اس وقت ختم ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ اسٹیشن سے باہر ایک بس ہماری منتظر ہے جو ہمیں اپنی منزل تک لے جائے گی۔ یہ حکومتیں اپنے نظاموں کی نگرانی بھی کرتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوام کا خیال بھی رکھتی ہیں۔

سفر سے واپسی پر جب بھی کبھی والدِ محترم یا اختر صاحب سے اپنے مشاہدات و تجربات کا ذکر ہوتا تو دونوں ہی کا آخری فقرہ بلکہ تقاضا یہ ہوتا کہ اب ان کو لکھ دیں تاکہ ہمارے قارئین ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ ایک تو میں لکھاری نہیں دوسرا دورانِ سفر مصروفیات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ میں نوٹس وغیرہ بھی نہیں لے پاتا اور یادداشت کے معاملے میں بھی کافی کمزور واقع ہوا ہوں۔

لیکن اب کی بار اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود والدِ محترم اور دیگر احباب کے اصرار پر اپنے مشاہدات آپ تک پہنچانے کی جسارت کر رہا ہوں۔

میرے زیادہ تر سفر کاروباری نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ بیرونِ ملک نمائش، کانفرنس اور ورکشاپس کے لیے بھی جانا پڑتا ہے اور اپنی کمپنی اور ملک کی نمائندگی کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ہر بار نئے لوگوں اور نت نئے تجربات کا سامنا ہوتا ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم لوگ دنیا سے کتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ لوگ، یہ ممالک کم وسائل اور بہت سی مشکلات اور جنگوں کے باوجود ہم سے کہیں زیادہ ترقی کر گئے۔ سفر سے وطن واپسی پر ایک خوشی تو ہوتی ہے لیکن ہوائی اڈے پر اُترتے ہی وہ خوشی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ یہ وطن ایک عظیم وطن ہے۔ اس کے پاس بے شمار وسائل ہیں اور اس کی جغرافیائی اہمیت سے اب کسی کو انکار نہیں۔

اس بار ڈروپا (ڈوزلڈاف) میں بھی شرکت کرنا تھی اور اس کے بعد ایک مختصر وزٹ، سویڈن کے شہر اورے بروا اور پھر فرانس کے شہر لیون جانا تھا تاکہ پرنٹنگ اور پیکجنگ کے شعبے میں متعارف کروائی جانے والی نئی مشینری اور خام مال کا انتخاب کر سکیں جس کے ذریعے ہم اپنے کسٹمرز کو کم قیمت میں نئی اور بہتر پراڈکٹس فراہم کر سکیں۔

تین

ہزار سال پہلے کی بات ہے جب یونان کئی شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے مابین جنگ و جدل روز کا معمول تھا۔ ایک ریاست کا حکمران آئے دن کی جنگوں سے تنگ آ گیا۔ اُسے پریشان دیکھ کر ایک یونانی دانشور نے بادشاہ کو تجویز دی کہ ریاستوں کے مابین کھیلوں کے مقابلے کراؤ۔ ان مقابلوں میں ہر ریاست سے کھلاڑی حصہ لیں۔ یوں ریاستوں کے مابین امن اور افہام و تفہیم کی فضا جنم لے گی۔ بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ یوں ۳/ہزار سال پہلے اولین اولمپک کھیل منعقد ہوئے۔

حیرت انگیز طور پر یہ کھیل واقعی امن کے سفیر ثابت ہوئے کیونکہ جب بھی کھیل منعقد ہوتے تو شہری ریاستوں کے مابین جنگیں رک جاتیں۔ امن کی یہ فضا پھر مقابلے ختم ہونے تک برقرار رہتی۔ جنگ روک دینے کی خصوصیت ہی نے قدیم یونان میں اولمپک کھیلوں کو بہت مقبول بنا دیا۔ حتیٰ کہ ۷۷۶ق م تک اولمپیا نامی یونانی شہر میں باقاعدگی سے اولمپک کھیل منعقد ہونے لگے۔ ان کھیلوں میں ایتھلیٹک مقابلے سرفہرست تھے۔

ڈھائی ہزار سال قبل رومی سلطنت کو عروج حاصل ہوا اور رومیوں نے یونان پر قبضہ کرلیا۔ رومی یونانیوں سے نفرت کرتے تھے لہٰذا وہ ان کی تہذیب و ثقافت مٹانے کے درپے ہوگئے۔ یونانی قوم پرستی ختم کرنے کی خاطر ۳۹۳ق م میں رومی بادشاہ، تھیوڈوسیس نے اولمپک کھیل ختم کرا دیے۔ یوں قدیم اولمپک مقابلوں کی تاریخ اختتام کو پہنچی۔

اولمپکس کا احیا

قدیم اولمپک مقابلوں کو زندہ کرنے کی پہلی جدید کوشش فرانس میں ہوئی۔ وہاں ۱۷۹۶ء تا ۱۷۹۸ء ہر سال کھیلوں کا قومی میلہ ''ایل اولمپیڈ ڈی لا ریپبلک'' منعقد ہوا۔ اس سپورٹس میلے میں کئی کھیل قدیم یونانی اولمپکس میں بھی کھیلے جاتے تھے۔

اس کے بعد ۱۸۵۰ء میں اولمپک کھیلوں کی طرز پر سپورٹس میلہ لگانے کا خیال برطانوی ڈاکٹر، ولیم پینی بروکس کو آیا۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ سمجھتا تھا کہ بیماریاں دور رکھنے کی خاطر نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ ورزش کریں اور مختلف کھیل کھیلیں۔ چنانچہ وہ برطانوی قصبے مچ وین لاک میں وین لاک اولمپک گیمز منعقد کرنے لگا۔ یہ سپورٹس میلہ آج بھی جاری ہے۔

۱۸۹۰ء میں کھیلوں کا شائق ایک امیر فرانسیسی، بیرن پیری ڈی کو برٹن بھی وین لاک اولمپک گیمز دیکھنے آیا۔ وہ ان کھیلوں سے اَزحد متاثر ہوا۔ اُسے خیال آیا کہ کھیلوں کا یہ میلہ عالمی سطح پر بھی منعقد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسی برس ایک تنظیم، انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی قائم کردی۔ کوبرٹن پھر مختلف ممالک میں موجود کھیلوں کے امیر و بااثر شائقین سے رابطہ کرنے لگا۔ تب تک یونان آزاد ملک بن چکا تھا۔ چنانچہ یونانی امرا اور حکومت، دونوں نے خصوصاً کوبرٹن کے منصوبے میں دلچسپی لی۔ اس کی تمنا تھی کہ ہر ۴/سال بعد ایسے اولمپک کھیل منعقد ہوں جن میں پوری دنیا سے کھلاڑی شرکت کریں۔

جدید اولمپک کھیل پہلی بار ۱۸۹۶ء میں یونان کے شہر ایتھنز میں منعقد ہوئے اس میں ۱۴/ممالک کے ۲۴۱/کھلاڑی شریک ہوئے

پہلے اولمپک کھیل ۱۸۹۶ء

آخر کوبرٹن کی محنت و کوشش رنگ لائی اور انٹرنیشنل

اولمپک کمیٹی کے زیرِ اہتمام ۱۸۹۶ء میں ایتھنز، یونان میں پہلے اولمپک کھیل منعقد ہوئے۔ ان کھیلوں میں ۱۴ ممالک کے ۲۴۱ کھلاڑی شریک تھے۔ انھوں نے ۴۳ مقابلوں

۲۷ روزہ میلے کے دوران کھلاڑی ۲۳۲ ٹن آلو اور ۳۳۰ ٹن سبزیاں کھا جائیں گے

میں ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلی اولمپکس میں طلائی تمغے کا وجود نہیں تھا۔ اول اور دوم آنے والوں کو بالترتیب چاندی اور تانبے کے تمغے دیے گئے۔

پہلے اولمپک گیمز کو قبولیت عامہ ملی اور یوں کھیلوں کا یہ میلہ ہر ۴ سال بعد لگنے لگا۔ یہ یاد رہے، اولمپک کمیٹی ملک نہیں شہر کی بنیاد پر اس جگہ کا انتخاب کرتی ہے جہاں اگلا میلہ لگنا ہوتا ہے۔

آج اولمپک گیمز کرۂ ارض پر کھیلوں کا سب سے بڑا میلہ بن چکا۔ یہ پچھلے ۱۰۰ برس کے دوران کئی انقلابی تبدیلیوں سے بھی گزرا ہے۔ مثلاً شروع میں صرف غیر پیشہ ور کھلاڑی ہی کھیلوں میں حصہ لے سکتے تھے۔ لیکن پھر بیسویں صدی کے نئے تقاضے مدِنظر رکھ کر پیشہ ور کھلاڑیوں کو بھی حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ مزید برآں اشتہارات اور اسپانسرشپس کے باعث تجارت بھی اولمپک کھیلوں میں در آئی۔ تاہم اب بھی ان کھیلوں کی اصل روح برقرار ہے یعنی یہ میلہ امن کا فرستادہ سمجھا جاتا ہے۔

اولمپک کھیلوں کے جھنڈے پر بنے پانچ حلقے دراصل ۵ براعظموں..... افریقہ، ایشیا، یورپ، جنوبی و شمالی امریکا اور اوشینکا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیز ان کے رنگ..... نیلا، زرد، سیاہ، سبز اور سرخ کسی نہ کسی ملک کے جھنڈے میں شامل ہیں۔ یہ واضح رہے کہ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے زیرِ اہتمام ہی سرمائی (ونٹر) اولمپک، معذوروں کے لیے پیرا اولمپک اور نوجوانوں کے یوتھ اولمپک مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ تاہم کمیٹی کا سب سے مشہور میلہ گرمائی (سمر) اولمپک گیمز ہی ہے۔

اب تک منعقد ہونے والے تمام گرمائی اولمپکس میں سب سے زیادہ امریکی کھلاڑیوں نے تمغے جیتے۔ ان کی تعداد ۲۲۹۸ ہے۔ پاکستان نے ۱۹۴۸ء سے گرمائی اولمپک گیمز میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ اب تک ۱۰ تمغے جیت چکا جن میں ۳ طلائی، ۳ نقرئی اور ۴ کانسی کے تمغے شامل ہیں۔ تینوں طلائی تمغے ہماری ہاکی ٹیم نے جیتے اور پاکستانیوں کا سر فخر سے بلند کیا۔ دیکھیے حالیہ اولمپکس میں ہماری ہاکی ٹیم کیسی کارکردگی دکھاتی ہے۔

لندن اولمپکس ۲۰۱۲ء

۲۷ جولائی تا ۱۲ اگست لندن میں کھیلوں کا سب سے بڑا عالمی میلہ لگنے والا ہے۔ اس دوران رنگ و نور کا سیلاب بھی لندن کو اپنی لپیٹ میں لے گا۔ اس میلے میں منعقد ہونے والے مقابلوں کو دنیا بھر میں اربوں انسان دیکھیں گے۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں لندن، ماسکو، نیویارک، میڈرڈ اور پیرس کے مابین یہ مقابلہ ہوا تھا کہ تیسویں (XXX) اولمپک مقابلے کہاں منعقد ہوں؟ لندن یہ مقابلہ جیتنے میں کامیاب رہا۔ تب سے برطانوی حکومت اولمپک مقابلوں کے انتظامات کرنے میں مصروف ہے۔

برطانوی حکومت اب تک انتظامات پر تقریباً ۸ ارب پونڈ خرچ کر چکی جو پاکستانی کرنسی میں تقریباً ۱۰ کھرب روپے سے زائد بنتے ہیں۔ یہ اولمپک مقابلے دیکھنے لاکھوں افراد برطانیہ آئیں گے۔ چنانچہ شہر میں زبردست معاشی سرگرمیاں جنم لیں گی۔ ایک اندازے کے مطابق اولمپک مقابلوں کے باعث برطانوی معیشت کو ۲۱ ارب پونڈ کا فائدہ ہوگا۔ نیز ۵۰ ہزار نئی مستقل ملازمتیں پیدا ہوں گی۔

کھیلوں کا یہ عالمی میلہ مختلف تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو باہم میل ملاپ کا موقع دیتا ہے۔ ان میں امن و محبت کے مثبت جذبے پروان چڑھاتا ہے نیز کھیلوں کے ذریعے جوش و جذبے کو فروغ دیتا ہے۔

قبل ازیں لندن میں ۱۹۰۸ء اور ۱۹۴۸ء کے اولمپک مقابلے بھی منعقد ہو چکے۔ گویا اب لندن دنیا کا پہلا شہر بن جائے گا جہاں ۳ اولمپک منعقد ہوئے۔ لندن اولمپکس ۲۰۱۲ء سے متعلق دیگر دلچسپ اور حیرت انگیز حقائق پیشِ خدمت ہیں۔

اولمپک سٹیڈیم

لندن اولمپکس کی خاص بات نیا تعمیر کردہ اولمپک سٹیڈیم ہے۔ یہ مشرقی لندن میں ایک ایسی جگہ تعمیر کیا گیا جہاں پہلے کارخانے قائم تھے۔ لہٰذا وہاں کی مٹی آلودہ اور ناپاک تھی۔ سب سے پہلے وہاں سے ۲۰ لاکھ ٹن آلودہ مٹی ہٹائی گئی۔ اس کے بعد وہاں ۳ لاکھ پودے اور ۴ ہزار درخت لگائے گئے۔

یوں ویران و بنجر علاقے میں تقریباً ڈھائی کلومیٹر رقبے والا ایک پارک وجود میں آگیا۔ اسے "اولمپک پارک" کا نام دیا گیا۔ اسی پارک کے وسط میں اولمپک سٹیڈیم تعمیر ہوا۔ اس کی تعمیر میں بھی کئی جدتیں اور ندرتیں اپنائی گئیں۔ اس کا رقبہ ۲۰۰ ہیکٹر ہے۔

اولمپک سٹیڈیم کی خاص بات اس کے ۲/۳ حصے ہیں۔ بیرونی حصے کی تعمیرات مثلاً سیڑھیاں اور دیگر اشیا عارضی جبکہ اندرونی حصے کی تمام تعمیرات مستقل ہیں۔ فی الوقت سٹیڈیم کے دونوں حصوں میں ۸۰ ہزار تماشائی بیٹھ سکتے ہیں لیکن مقابلے ختم ہونے کے بعد بڑے سٹیڈیم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ چنانچہ بیرونی حصے کی تعمیرات ختم کر دی جائیں گی۔ تب سٹیڈیم میں ۲۵ ہزار تماشائی ہی بیٹھ سکیں گے۔

سٹیڈیم کے متعلق ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی چھت کنکریٹ یا اسٹیل نہیں بلکہ اُس مواد سے تعمیر ہوئی جس سے پی وی سی پائپ بنتے ہیں۔ مدعا یہ تھا کہ اول اخراجات کم کیے جائیں، دوم بعد ازاں دوسرے حصے کو ہٹانا آسان رہے۔ نیز یہ مواد کنکریٹ کے مقابلے میں

ماضی کے لندن اولمپکس

۱۹۰۸ء کے لندن اولمپک مقابلے کئی لحاظ سے یادگار ثابت ہوئے مثلاً اسی اولمپک میں پہلی بار ہاکی کے مقابلے منعقد ہوئے۔ آج اولمپک ہاکی ٹورنامنٹ اس کھیل کے بڑے ٹورنامنٹوں میں سے ایک ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ ۱۹۰۸ء کے اولمپک روم میں ہونے تھے، لیکن وہاں ویسویس آتش فشاں پھٹ گیا، چنانچہ مقابلے لندن میں منعقد کرنے پڑے۔

۱۹۰۸ء میں لندن کے اولمپک اسٹیڈیم کی تعمیر پر "۶۰ ہزار پونڈ" لاگت آئی تھی۔ جبکہ ۲۰۱۲ء کے اولمپک سٹیڈیم کی تعمیر پر "۵۰ کروڑ پونڈ" خرچ ہوئے۔ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ مہنگائی کہاں جا پہنچی ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۰۸ء کے اولمپک مقابلوں کے لیے ہی پہلی بار باقاعدہ سٹیڈیم تعمیر کیا گیا تھا۔

ماحول دوست بھی ہے۔

یہ اسٹیڈیم اردگرد موجود دیگر عمارتوں سے ۴۰ر فیصد کم پانی استعمال کرے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی چھتوں میں بارش کا پانی صاف کرنے والا پلانٹ نصب ہے۔ یہی جمع شدہ پانی مختلف کاموں مثلاً فلش اور صفائی کرنے میں کام آئے گا۔

لندن اولمپک کی دیگر دلچسپ باتیں

☆ مقابلے کی کوریج کے لیے تقریباً ۲۰ر ہزار صحافی اور فوٹو گرافر آئیں گے۔ ان کی مساعی سے تقریباً ۴ر ارب انسان اپنے گھروں میں ٹی وی دیکھتے ہوئے مقابلوں کے سنسنی خیز لمحات سے لطف اندوز ہوسکیں گے۔

☆ ان مقابلوں میں ۲۰۴ر ممالک کے ساڑھے دس ہزار کھلاڑی حصہ لیں گے۔ یہ کھلاڑی ۲۶ر مختلف کھیلوں کے ۳۰۲ر مقابلوں میں باہم ٹکرائیں گے۔

☆ اس بار کھلاڑیوں کو سب سے زیادہ اور بھاری طلائی تمغے دیے جائیں گے جو اولمپکس کی تاریخ کا ریکارڈ ہوگا۔

☆ مقابلوں کے لیے ایک کروڑ ٹکٹ برائے فروخت پیش ہوئے۔

☆ ۷۰ر ہزار رضاکار مقابلوں کے دوران مختلف انتظامات کرنے پر مامور ہوں گے۔

☆ مختلف مقابلوں کے لیے ۳۲ر چھوٹے بڑے نئے مرکز تعمیر ہوئے ہیں۔

☆ ۲۷ر دن کے دوران کھلاڑی تقریباً ۲۳۲ر ٹن آلو اور ۳۳۰ر ٹن سبزیاں چٹ کر جائیں گے۔

☆ برطانیہ کے ۱۹ر مختلف علاقوں میں دیوہیکل ٹی وی سکرینیں نصب ہوں گی۔ وہاں ہزارہا لوگ براہِ راست مقابلے دیکھ سکیں گے۔

☆ منتظمین کھلاڑیوں اور ان کی ٹیموں کے دیگر ۶۰ر ہزار ارکان کو روزانہ کھانا پیش کیا کریں گے۔

☆ اولمپک اسٹیڈیم کے نزدیک ہی ویسٹ ویلیج شاپنگ سینٹر واقع ہے۔ یہ یورپ میں سب سے بڑا ہے۔

☆ امریکا کی فاسٹ فوڈ کمپنی، میکڈونلڈ نے اولمپک ویلیج میں اپنا سب سے بڑا مرکز تعمیر کیا ہے۔

☆ اولمپک مقابلوں کا نعرہ (Motto) ہے:
''انسانی نسل کی حوصلہ افزائی/ بیداری''
(Inspire a Generation)

☆ اولمپک ویلیج میں ۲۸۱۸ر گھر تعمیر کیے گئے ہیں (کھلاڑی اولمپک ویلیج ہی میں قیام کرتے ہیں۔)

☆ لندن کی مقامی حکومت نے جاولین نامی انتہائی تیز رفتار ٹرین ریل چلائی ہے۔ یہ اولمپک ویلیج سے مہمانوں کو صرف ۷ر منٹ میں وسطی لندن پہنچا دے گی۔ یوں انھیں اتنا وقت مل جائے گا کہ عجائب گھر، تھیٹر، آرٹ گیلریاں وغیرہ دیکھ سکیں۔

☆ اولمپک پارک کی تعمیر سے قبل صنعتی علاقے میں ۴ر ہزار چھپکلیاں اور ۱۰۰ر مینڈک موجود تھے۔ انھیں پہلے پکڑ کر محفوظ مقامات تک پہنچایا گیا۔ پھر جب اولمپک پارک بن گیا، تو ان حیوانات کو وہاں چھوڑ دیا گیا۔

☆ ایک برطانوی کمپنی نے خصوصی لکڑی، خاص جیومیٹریکل ڈیزائن اور بلند اندرونی درجہ حرارت کی مدد سے سائیکل دوڑ کے لیے تیز ترین راستہ (ٹریک) بنایا ہے۔ اُمید ہے کہ اس راستے پر سائیکل دوڑ کے نئے ریکارڈ قائم ہوں گے۔

☆ اولمپک مقابلوں میں پہلی بار یہ دھیان رکھا گیا کہ تماشائی عوامی ٹرانسپورٹ، پیدل یا سائیکل کے ذریعے سٹیڈیم تک پہنچ سکیں۔ مدعا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پٹرول بچایا جاسکے۔

☆ افتتاحی تقریب سے قبل ہی یعنی ۲۵ر جولائی کو خواتین کے فٹ بال مقابلے شروع ہو جائیں گے۔ یہ لندن اولمپکس کے پہلے مقابلے ہوں گے۔

☆ لندن اولمپکس میں پہلی بار خواتین باکسروں کے بھی مقابلے منعقد ہوں گے۔

جوش جذبہ جنون
طاقت مہارت
دلچسپ اور اہم ریکارڈز
کھیل کھلاڑی

اولمپک کے مقابلے

رانا محمد شاہد

دُنیا

بھر میں بہت سے کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے ہیں مگر ان سب میں زیادہ مقبول اولمپک مقابلے ہیں۔ اولمپک کھیلوں کی ابتدا ۷۷۶ر قبل مسیح یونان کے شہر اولمپیا سے ہوئی۔ ابتدا میں یہ مقابلے ۱۰۰ر گز کی دوڑ تک محدود تھے۔ اس دوڑ کو یونانی زبان میں ''اسٹیڈ'' کہتے تھے۔ اس وجہ سے میدان کا نام ''اسٹیڈیم'' پڑ گیا۔ اولمپک مقابلے تقریباً ۱۲۰۰ سال تک بلاناغہ ہر چار سال بعد منعقد ہوتے رہے۔ ان کھیلوں کے تمام قوانین یونانیوں نے خود بنائے تھے۔ کھیل سے محبت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ان مقابلوں کو مذہبی تہواروں کا درجہ دیا اور ان کے انعقاد کے لیے ادوار مقرر کیے۔

زمانۂ قدیم میں اولمپک کھیلوں کا جشن صرف ایک دن ہوتا تھا۔ پھر اس کے لیے ۵ر دن مقرر ہوئے۔ یہ کھیل پوری ۱۲ر صدیوں تک ہر ۴ر سال بعد منعقد ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ عیسائی رومی شہنشاہ تھیوڈس نے اولمپک کھیلوں پر پابندی لگا دی۔ اس کے بقول یہ کھیل وحشیانہ تھے۔ ۱۲ر صدیوں تک جاری رہنے والے ان اولمپک مقابلوں میں یونان کی تمام آزاد ریاستوں کے علاوہ ہر اس ملک کے لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی جہاں یونانی زبان بولی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کھیل یونان کے سیکڑوں شہریوں کو ایک رشتے میں جوڑنے کا باعث بنتے تھے۔ ان کھیلوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کھیلوں کا انعقاد ہوتا تھا تو تمام ریاستیں اپنی جنگیں تک ملتوی کر دیتی تھیں تاکہ کھلاڑی ان کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے جاسکیں اور پُرامن ماحول میں ان کھیلوں کا انعقاد ہوسکے۔

رومی شہنشاہ کے ان کھیلوں پر پابندی لگانے کے صدیوں بعد تک یہ کھیل صرف یادداشتوں تک محدود رہے۔ پھر ایک فرانسیسی بیرن پیری ڈی کوبرٹن نے ان کھیلوں کے انعقاد کے لیے ایک بھرپور تحریک چلائی، جو کامیاب رہی اور ۱۸۹۶ء میں اولمپک مقابلے دوبارہ شروع ہوگئے اور سوائے جنگِ عظیم اول اور دوم کے اُس وقت سے مسلسل ہر ۴ر سال بعد منعقد ہوتے ہیں۔

پہلی جدید اولمپکس سے قبل اولمپکس کے بانی بیرن پیری ڈی کوبرٹن نے اپنے دوست برئیل کے ہمراہ یونان کا تفصیلی دورہ کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ پہلی اولمپکس میں کم از کم ۲ر ایسے مقابلے ضرور شامل کیے جائیں جو قدیم یونان میں کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مائرن کے مشہور عالم مجسمے ''ڈسکوبولس'' کو دیکھ کر ڈسکس تھرو کو اولمپکس میں شامل کیا گیا اور میراتھن جنگ کا حال تاریخ کی کتب میں پڑھ کر اور میراتھن سے ایتھنز تک کا فاصلہ دیکھ کر برئیل نے ایک دلچسپ افسانہ تراشا جو اولمپکس میں میراتھن دوڑ کی

اولمپک کی سب سے مہنگی یادگار

اولمپک کے میراتھن مقابلوں میں سب سے پہلی ٹرافی یونان کے سائپرس لیمس نے ۱۸۹۶ء میں جیتی تھی۔ سائپرس کے اہلِ خانہ نے لندن اولمپک سے پہلے اس ٹرافی کو بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی ریکارڈ بولی نے اولمپک یادگاروں کی بولی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ٹرافی کی بولی ایک لاکھ ساٹھ ہزار پاؤنڈ سے شروع ہوئی اور ۴ لاکھ ۵۰ ہزار پاؤنڈ پر ختم ہوئی۔ اس سے پہلے اولمپک کی کسی بھی یادگار کی زیادہ سے زیادہ بولی ۲ لاکھ ۹۰ ہزار یورو تھی۔

شمولیت کی بنیاد بنا۔ افسانہ یوں ہے کہ جب میراتھن کے مقام پر ۴۹۰ ق م میں اہلِ ایتھنز نے حملہ آور پرشین فوج کو زبردست شکست دی تو فتح کی خوشخبری سنانے کے لیے فائیڈی پیڈیز نامی سپاہی کو ایتھنز کی طرف دوڑایا گیا۔ اس نے ایتھنز پہنچ کر اہلِ شہر کو فتح کا مژدہ یوں سنایا ''جشن مناؤ، ہم جیت گئے۔'' خوشخبری سناتے ہی وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ چنانچہ اس کی یاد میں میراتھن سے ایتھنز اسٹیڈیم تک دوڑ کو اولمپکس میں شامل کرلیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بشمول ہیروڈوٹس کے کسی تاریخ نویس نے یہ واقعہ بیان نہیں کیا۔ نہ ہی مشہور شعرا ہومر یا ورجل نے اپنی نظموں میں فائیڈی پیڈیز نامی پیغام رساں کا ذکر کیا ہے۔ میراتھن کے پیغام رساں کا ذکر پہلی مرتبہ جنگِ میراتھن کے ۵۶۰ سال بعد پلوٹارک نے کیا ہے۔ جبکہ فائیڈی پیڈیز نامی پیغام رساں کا ذکر میراتھن کی جنگ کے ۴۰۰ سال بعد تاریخ کی کتب میں ملتا ہے، جس نے ایتھنز سے اسپارٹا تک تقریباً ۱۳۶ میل کا فاصلہ پیدل دوڑ کر طے کیا تھا۔ اولین میراتھن کا فاصلہ ۴۰ کلومیٹر تھا جبکہ اس دوڑ کا موجودہ فاصلہ ۱۹۲۴ء کی لندن اولمپکس میں مقرر کیا گیا جو ۴۲ء۱۹۵ کلومیٹر ہے۔

اولمپکس میں پاکستان ہاکی ٹیم کی کارکردگی

اولمپکس کے مقابلوں میں پاکستانی ہاکی کا ماضی انتہائی شاندار ہے جبکہ اولمپکس کے میگا ایونٹ میں ہماری ٹیم کی کارکردگی بتدریج تنزلی کا شکار ہے۔ ۲۰۰۸ء کے بیجنگ اولمپکس میں قومی ہاکی ٹیم کی پوزیشن آٹھویں تھی جو اولمپک کی تاریخ میں قومی ہاکی ٹیم کی بدترین کارکردگی تھی۔

قومی ہاکی ٹیم نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء کے لندن اولمپکس میں اور اس کے بعد ۱۹۵۲ء کے اولمپکس میں مسلسل چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء کے میلبورن اولمپک میں ٹیم نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء کے روم اولمپک میں ۲ روایتی حریفوں پاکستان اور بھارت کے درمیان فائنل میچ کھیلا گیا۔ یہ مقابلہ انتہائی سنسنی خیز، دلچسپ اور سخت ثابت ہوا، جس میں پاکستان نے بھارت کو ایک صفر سے شکست دے کر پہلی مرتبہ اولمپک چمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ میچ کا واحد گول نصیر بندہ نے کیا۔ ۱۹۶۴ء کے ٹوکیو اولمپک میں بھی پاکستان اور بھارت کی ٹیمیں ہی فائنل میں آمنے سامنے تھیں، اس مرتبہ بھارت کامیاب رہا۔ ۱۹۶۸ء کے میکسیکو اولمپکس میں پاکستان نے آسٹریلیا کو دو ایک سے شکست دے کر دوسری مرتبہ اولمپک چمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔

۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپک میں پاکستان مغربی جرمنی کے ہاتھوں فائنل میں ایک صفر سے ہار گیا۔ ۱۹۷۶ء کے اولمپک مقابلوں میں پاکستان نے ہالینڈ کو ہرا کر تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء کے ماسکو اولمپک کا پاکستان نے بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس میں ہونے والے اولمپک گیمز میں پاکستان نے ۱۶ سال بعد تیسری مرتبہ اولمپک چمپئن بننے کا کارنامہ انجام دیا۔ فائنل میں جرمنی کو دو ایک سے شکست دی۔ ۱۹۸۸ء کے سیول اولمپک میں قومی ٹیم پانچویں پوزیشن کی حق دار ٹھہری۔ ۱۹۹۲ء کے بارسلونا اولمپک میں شہباز سینئر کی قیادت میں قومی ہاکی ٹیم نے ہالینڈ کو شکست دے کر کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔

۱۹۹۶ء کے اٹلانٹا اولمپک میں گول کیپر منصور احمد کی قیادت میں قومی ٹیم کو آخری یعنی چھٹی پوزیشن پر اکتفا کرنا پڑا۔ ۲۰۰۰ء کے سڈنی اولمپک میں ٹیم کی پوزیشن چوتھی رہی۔ ۲۰۰۴ء کے ایتھنز اولمپک میں پوزیشن پانچویں ہوگئی جبکہ ۲۰۰۸ء کے بیجنگ اولمپکس میں یہ پوزیشن مزید تنزلی کا شکار ہوکر آٹھویں ہوگئی۔

اب تک پاکستان نے اولمپک مقابلوں میں ۲۷۰ گول کر رکھے جبکہ اس کے خلاف ۱۱۷ گول ہوئے ہیں۔ ۱۵ اولمپکس مقابلوں میں ۱۴ کپتانوں نے قومی ہاکی ٹیم کی قیادت کی۔ عبدالحمید (حمیدی) واحد کپتان ہیں جنھوں نے ۲ اولمپک مقابلوں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۰ء میں قومی ٹیم کی قیادت کی۔

لندن اولمپکس.....۲۰۱۲ء

۲۰۱۲ء.....اولمپکس کا سال ہے۔ یہ کھیلوں کی دنیا کا سب سے بڑا میلہ ہے۔ اس سال اولمپکس کا میزبان یورپ کا قدیم ترین شہر لندن ہے۔ منتظمین اس عظیم ترین میلے کے انعقاد کے لیے بھرپور تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں برطانیہ کی ایک فیکٹری میں اولمپکس ۲۰۱۲ء کے لیے ۸ ہزار مشعلیں تیار کی جا رہی ہیں جس کے لیے ۱۵۰ افراد کا گروپ دن رات ایک کیے ہوئے ہے۔ روزانہ ۱۰۰ کے قریب مشعلیں تیار ہو رہی ہیں۔ ہر مشعل کا وزن ۸۰۰ گرام ہے اور اس کے لیے خصوصی المونیم کا استعمال ہوا ہے۔ یہ اب تک کے اولمپکس کی سب سے کم وزن مشعل ہے۔ مشعل بردار ریلی کے لیے ۸ ہزار مشعلیں تیار کی گئی ہیں۔ اس سال ان تاریخی گیمز میں ۲۰۰ ممالک کے ۱۰ ہزار سے زائد کھلاڑی ایکشن میں نظر آئیں گے۔ کھیلوں کے مقابلے میں مدد کے لیے ۷۰ ہزار رضاکار اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف برطانیہ کے کروڑوں افراد ان گیمز کے شرکا کے استقبال کے لیے بے چین ہیں۔ صرف برطانیہ کے ۸۰ لاکھ سے زائد شائقین نے مقابلوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ٹکٹ بھی حاصل کر لیے ہیں۔

لندن اولمپکس آرگنائزنگ کمیٹی (ایل او سی او جی) نے باضابطہ اعلان کیا ہے کہ گیمز کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ۲۷ جولائی کو شہرہ آفاق ''ریڈ ایروز'' رائیل ایئر فورس کی ایروبیٹک ٹیم اپنے فن کا مظاہرہ کرے گی اور ایسی فارمیشن بنائی جائے گی جس سے یہ تاثر ملے گا کہ شرکا کا شاہانہ استقبال کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ گیمز کے تمام ایونٹس کے آغاز سے اختتام اور افتتاحی تقریب کی کوریج کے لیے بھی تیاریوں کو حتمی شکل دے دی گئی ہے۔

۲۰۱۲ء کے اولمپک گیمز میں ۳۸ ڈسپلن (گیمز) شامل ہیں۔ ان میں تیراندازی، ایتھلیٹک، بیڈمنٹن، باسکٹ بال، بیچ والی بال، باکسنگ، کنوئی سلالم، کنوئی سپرنٹ، سائکلنگ پی ایم ایس، ماؤنٹین بائیک، روڈ سائکلنگ، ٹریک سائکلنگ، ڈائیونگ، گھڑسواری ڈریسج، گھڑسواری ایوننگ، گھڑسواری جمپنگ، شمشیر زنی، فٹبال، آرٹسٹک جمناسٹک، ردھم جمناسٹک، ٹرمپولین

متفرق معلومات

(۱) جدید اولمپک مقابلے ۱۸۹۶ء میں شروع ہوئے۔ صرف ۱۲ ممالک نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔

(۲) اولمپک مقابلوں میں پہلی بار خواتین نے ۱۹۰۰ء کے فرانس اولمپک میں شرکت کی۔ ان کھیلوں میں ۱۱ خواتین نے حصہ لیا۔

(۳) ایشیا میں سب سے پہلے اولمپک مقابلے جاپان کے شہر ٹوکیو میں ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوئے۔ ان مقابلوں میں کل ۹۳ ممالک کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔

(۴) سب سے طویل اولمپک مقابلے ۱۹۰۰ء میں پیرس میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ مقابلے تقریباً ۵ مہینے ۸ دن تک جاری رہے۔

اس مرکزی اسٹیڈیم پر ۹۲ء۸۰۷ ملین ڈالر لاگت آئی ہے جس میں ۲۷ر جولائی کو اولمپکس کی افتتاحی تقریب ہوگی۔

اولمپک کی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ

سیول اولمپک ۱۹۸۸ میں پوسان کے مقام پر کشتیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ اس وقت ۳۵ ناٹ کی رفتار سے ہوا چل رہی تھی جو کشتیوں کو بار بار پٹخ رہی تھی۔ سنگاپور کی ٹیم کے ۲ر کشتی ران جوزف جون اور شاہر کی موٹر کشتی اس دوران الٹ گئی اور انہوں نے بمشکل اس کے اوپر پناہ لی۔ کینیڈا کا لارنس لیمبوکس قریب ہی کشتی دوڑا رہا تھا، وہ ان کی مدد کو پہنچا۔ اس نے جوزف کو بچا لیا جو اپنی وزنی سیلنگ جیکٹ میں طوفان کا سامنا کرتے ہوئے ادھ موا ہو چکا تھا۔ سنگاپور کی ٹیم کی مدد کرتے کرتے لیمبوکس کشتیوں کی دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گیا۔ مصففین نے لیمبوکس کو دوسری پوزیشن کا مستحق ٹھہرایا۔ جس وقت وہ سنگاپور کے کھلاڑیوں کی مدد کو پہنچا اس وقت وہ اسی پوزیشن میں تھا۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی نے اس کی دلیری پر اسے خصوصی ایوارڈ سے نوازا۔

۱۵۲ر گھنٹے تک مسلسل چلنا

دنیا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے ایک منٹ کے لیے رُکے بغیر واکنگ کی ہے۔ ایڈورڈ جارج فریڈ ۱۳ سے ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۰ء تک مسلسل ۱۵۲ر گھنٹے ۴۰ر منٹ پیدل چلتے رہے۔ انہوں نے تقریباً ساڑھے تین سو میل کا فاصلہ طے کیا اور راستے میں اُنھیں کہیں آرام کرنے نہیں دیا گیا۔

اُلٹے پاؤں چلنے کا ریکارڈ

اُلٹے پاؤں چلنے کے ہیروٹیکساس کے پینی ایل وِنگورے ہیں، جنھوں نے ۲ر براعظموں کے درمیان ۸ر ہزار میل کا فاصلہ اُلٹے پاؤں چلتے ہوئے طے کیا۔ انہوں نے ۱۵ر اپریل ۱۹۳۱ء کو اپنا سفر شروع کیا اور ۲۴ر اکتوبر کو استنبول (ترکی) اپنی منزل پر پہنچے۔

۳ر طلائی تمغے جیتنے والا واحد کھلاڑی

دنیا کے واحد واکر (پیدل چلنے والا) جنھوں نے ۳ر طلائی تمغے جیتے۔ اٹلی کے یوگو فریگیریو (پیدائش ۱۹۰۱ء انتقال ۱۹۶۸ء) تھے۔ جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں ۳ر ہزار میٹر پیدل چل کر طلائی تمغہ جیتا۔ اسی سال ۱۰ر ہزار میٹر پیدل چلنے کے بعد دوسرا طلائی تمغہ جیتا۔ تیسرا طلائی تمغہ انھوں نے ۱۹۲۴ء کے اولمپک مقابلوں میں ۱۰ر ہزار میٹرز پیدل چلنے کا مقابلہ جیت کر حاصل کیا۔ اس طرح انہیں واک ریس میں سب سے زیادہ طلائی تمغے جیتنے کا اعزاز حاصل ہے۔

جمناسٹک، پنڈبال، ہاکی، جوڈو، پنٹاتھلون، روئنگ، سیلنگ، شوٹنگ، سوئمنگ، سنچرونائزڈ سوئمنگ، ٹیبل ٹینس، تائی کوانڈو، ٹینس، ٹرائی تھلون، والی بال، واٹر پولو، ویٹ لفٹنگ اور ریسلنگ میں کھلاڑی اپنی جسمانی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے۔ اتھلیٹکس کو مدر آف آل اسپورٹس سمجھا جاتا ہے۔ اولمپکس میں اتھلیٹک مقابلے شائقین کی دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔

لندن اولمپک کے ٹریک اینڈ فیلڈ مقابلوں میں مجموعی طور پر دنیا بھر سے ۲ر ہزار مرد و خواتین حصہ لیں گے۔ اس دوران ۴۷ر گولڈ میڈلز کے لیے جدوجہد کی جائے گی۔

برطانوی ماہرین نے اولمپک اتھلیٹس کی ٹریننگ کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا حامل الیکٹرک ٹریننگ سوٹ تیار کرلیا ہے۔ ٹریننگ سوٹ کھلاڑیوں کو ان کی ترتیب دی گئی درست پوزیشن کے بارے میں آگاہ کرے گا۔ لندن کے

گوشۂ ممکنات

کیا جدید ٹیکنالوجی زندگی کا ہر لمحہ ریکارڈ کر سکتی ہے؟

حساب ہر لمحے کا

- اس دلچسپ ٹیکنالوجی کا احوال جو ہماری زندگی کا ہر لمحہ ریکارڈ کر سکتی ہے
- انسان کا اپنی زندگی کا ہر لمحہ ریکارڈ کرنے کے قابل ہونا سائنس فکشن سے نکل کر جیتی جاگتی حقیقت بن رہا ہے

عاطف مرزا

عام افراد اپنے سونے کی روٹین کا باقاعدہ حساب نہیں رکھ رہے ہوتے۔ اسی طرح ایک دن میں وہ کتنا چلے یا کسی مخصوص غذا کی مقدار کیا رہی ان باتوں کو بھی ریکارڈ نہیں کر رہے ہوتے۔ لیکن کھلاڑی اور ان کے کوچ عموماً غذائیت، تربیت کے سیشن، نیند اور دوسرے معمولات کو تفصیلاً نوٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض امراض میں بھی معمولات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ جیسے ذیابیطس، کینسر، دمہ۔ وہ لوگ جو اپنا وزن کم کر رہے ہوں یا فٹنس کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہوں وہ بھی اپنے معمولات کا ریکارڈ رکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں روزمرّہ کی زندگی کا ڈیٹا اکٹھا کرنا اور اس کا تجزیہ صحت اور زندگی کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ عام طور پر جن چیزوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے ان میں خون میں شکر کی مقدار، فشارِ خون، دل دھڑکنے کی شرح، ڈائیٹ، وزن اور ورزش سے متعلق معلومات شامل ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی نے اس کام کو آسان بنا دیا ہے۔ اب ذاتی ڈیٹا کو اکٹھا کرنا اور اس کا تجزیہ کرنا اتنا مشکل نہیں رہا۔ ایسی بے شمار ایجادات سامنے آ رہی ہیں جو ہماری جسمانی مشقت، نیند، خوراک حتیٰ کہ ذہنی یا دلی کیفیت کا حساب رکھتی ہیں اور ہمیں زیادہ صحت مند اور فعال بنانے کا وعدہ کرتی ہیں۔ یہ ایجادات سیلف ٹریکنگ (Self Tracking) ٹیکنالوجی کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کا اصول یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے ڈیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس ڈیٹا پر نظر رکھ کر ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ٹیکنالوجی کی مدد سے روزمرّہ کے افعال کا ریکارڈ رکھنا ہمارا معیارِ زندگی بلند کر سکے گا؟

اگر ہم ذرا غور کریں تو ابھی بھی بہت کچھ ریکارڈ ہو رہا ہوتا ہے لیکن ہم اس پہ توجہ نہیں دیتے۔ سمارٹ فون کے ذریعے لی گئی تصویریں ہمارے پاس جمع ہوتی رہتی ہیں اسی طرح ای میل اکاؤنٹ میں موجود ای میلز کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے لیکن ہمیں نئی جگہ بنانے کے لیے پرانی تصویریں اور ای میلز ڈیلیٹ (Delete) کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے معمولات کا ریکارڈ رکھنا

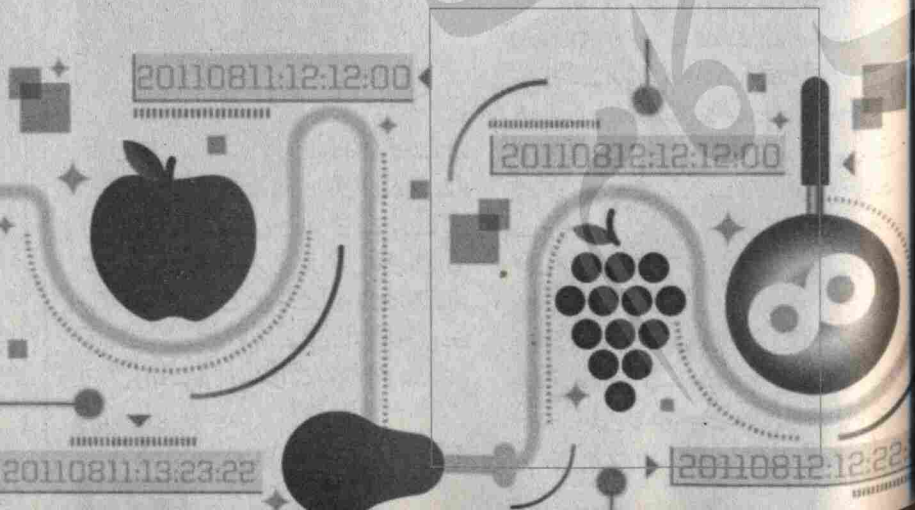

لائف لاگرز

لائف لاگرز (Life Loggers) ایسے افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی پوری زندگی یا اس کا ایک بڑا حصہ ریکارڈ کرنے کے لیے کمپیوٹر پہن لیتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں سٹیومین (Steve Mann) نامی شخص نے اپنے پورے ہفتے کی سرگرمیاں آن لائن شیئر کیں۔ اس دوران لوگ اسے پیغامات بھی بھیج سکتے تھے۔

آج عام استعمال کی چیز بن چکی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ شروع میں یہ صرف مخصوص افراد ہی استعمال کرتے تھے۔ ابھی جو لوگ Self Tracking کی ایجادات استعمال کر رہے ہیں ان میں ایتھلیٹس، خلانورد، سائنسدان، جدید ٹیکنالوجی استعمال کرنے کے شوقین افراد اور فٹنس کے چکر میں مبتلا لوگ شامل ہیں۔ اسی طرح مختلف امراض کے شکار مریض بھی اپنا ڈیٹا ریکارڈ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ان ایجادات کا استعمال ابھی ترقی یافتہ ممالک تک محدود ہے اور یہاں کھیل، صحت اور ملٹری کے شعبوں میں اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔

پرسنل کمپیوٹر نے بھی اپنا سفر اسی طرح شروع کیا۔ کمپیوٹر کا سائز آغاز میں کمرے کے سائز کے برابر تھا اور اسے عام استعمال کی چیز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آج چھوٹے بڑے سب اس کی مدد سے اپنی زندگیاں آسان بنا رہے ہیں۔ امریکا میں ۲۰۱۱ء میں کی گئی ایک سٹڈی سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انٹرنیٹ صارفین میں سے ۲۷ فیصد اپنے وزن، ڈائیٹ، ورزش کا ریکارڈ آن لائن مرتب کر رہے ہیں۔

یہ ٹیکنالوجی بہت دلچسپ ہے اور اس کی ایجادات بہت حیرت انگیز ہیں۔ مارکیٹ میں ایک ایسا آلہ (Device) موجود ہے جو دمے کے Inhaler کے ساتھ منسلک ہوجاتا ہے اور دمے کے مرض کو کنٹرول کرنے کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے۔ یہ اس ماحول کی نشاندہی کرتا ہے جس میں مرض کی شدت بڑھ جاتی ہے جیسے کسی خاص پودے کے قریب موجودگی۔ ان معلومات سے مریضوں اور تحقیق کرنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ مختلف مریضوں سے حاصل ہونے والا ڈیٹا ایک جگہ پر اکٹھا بھی کیا جارہا ہے۔

اب ماہر امراض قلب دور بیٹھے ہوئے اپنے مریض کو چیک کرسکتا ہے۔ اس کے لیے گھر پر موجود مریض کو ایک جیکٹ پہنا دی جاتی ہے۔ یہ جیکٹ دل کی کارکردگی جانچنے کے لیے ڈاکٹر کو ضروری معلومات فراہم کردیتی ہے۔

آسان ہو رہا ہے۔ اب سینسر (Sensor) چھوٹے اور سستے ہوچکے ہیں۔ سمارٹ فون ورزش کرنے والے کو ورزش کے دورانیے اور دل کی دھڑکن کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دوڑ، چہل قدمی، تیراکی، سائیکلنگ کرنے والے شخص کو طے کردہ فاصلے، وقت اور رفتار کے بارے میں آگاہ رکھتے ہیں۔ اس ٹیکنالوجی سے امراض کی روک تھام اور زندگی کے معیار کو بہتر بنانے میں بھی مدد لی جارہی ہے۔

آپ کسی بھی ایسی ایجاد کے آغاز پر نظر دوڑائیں جو

Zeo آلہ ہماری مدد کرتا ہے کہ نیند کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ یہ آلہ سر پر باندھنے والی پٹی پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ روشنی اور موسم جیسے عوامل سے نیند کیسے متاثر ہوتی ہے۔ یہ دماغ کی سرگرمی کو پٹی میں موجود ایک سنسر کی مدد سے جانچتی ہے۔ یہ ڈیٹا پوری رات قریب پڑے الارم کلاک تک جاتا رہتا ہے۔

Basis ایک دلچسپ گھڑی ہے جو روزانہ کی گئی ورزش کا حساب رکھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ گھڑی جلد کا ردِعمل نوٹ کرتی ہے۔ اس سے صارف اپنی کارکردگی فیس بک پر بھی شیئر کرسکتا ہے۔

Self Tracking آلات کی مدد سے بڑے پیمانے پر ڈیٹا بھی اکٹھا ہو سکے گا اور صحت کے میدان میں نئی تحقیقات سامنے آسکیں گی۔ عام طور پر ۸ گھنٹے کی نیند کو بہتر

Quantler ایک ویب سائٹ ہے جہاں لوگ آپس میں یہ شیئر کر سکتے ہیں کہ وہ آج کتنا دوڑے ہیں۔ Health Month ایک آن لائن گیم ہے جسے کھیلنے کے لیے آپ حقیقی زندگی میں اپنا ماہانہ ہدف مقرر کرتے ہیں کہ آپ مہینے میں اتنے دن ورزش کریں گے۔ گیم میں پوائنٹس یعنی بہتر کارکردگی اُسی صورت میں سامنے آتی ہے جب آپ اپنی ورزش کے معمول کا خیال رکھتے ہیں۔ اس گیم میں آپ دوستوں اور دیگر اجنبیوں سے مقابلہ کررہے ہوتے ہیں۔

ایسی ویب سائٹس بھی موجود ہیں جہاں ہزاروں مریض اپنے امراض سے متعلقہ علامات (Sympotms) اور علاج کی تفصیل شیئر کرتے ہیں۔ Petient Like Me اور Cure Together ایسی ہی ۲ ویب سائٹس ہیں۔ ماہرین کے مطابق یہ رجحان بیماریوں کو کنٹرول کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہوگا۔

Pedometers، Actigraph، Fitbit جیسی ایجادات بتاتی ہیں کہ آپ کتنے قدم چلے اور کتنی توانائی صرف ہوئی۔ نائیکی (Nike) کمپنی نے Nike پلس (Nike +) فیول بینڈ متعارف کروایا ہے۔ کلائی پر پہنی جانے والی یہ پٹی دن بھر کی جانے والی جسمانی مشقت کے بارے میں بتاتی ہے۔ ایک ایسی ٹی شرٹ بھی سامنے آچکی ہے جو دل اور سانس کی رفتار، جسم کے درجہ حرارت، جسم کے آکسیجن کے استعمال پر نظر رکھتی ہے۔

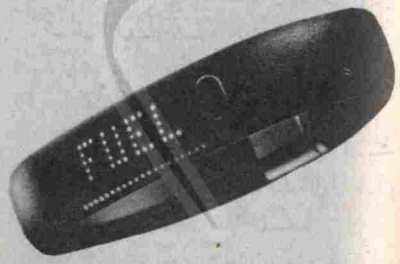

جو چیز ایک عمارت جتنی جگہ گھیرتی تھی اب وہ میری جیب میں سما جاتی ہے اور جو چیز اب میری جیب میں سما جاتی ہے اگلے ۲۵ برسوں میں خون کے ایک خلیے میں سما جائے گی

(رے کرزویل۔ موجد اور ماہر مستقبلیات)

سمجھا جاتا ہے۔ نیند کے بارے میں بڑے پیمانے پر ڈیٹا کی موجودگی میں طب وصحت کے ماہرین ہمیں مزید مفید معلومات دینے کے قابل ہوں گے۔

ایک فرانسیسی کمپنی جو وزن کرنے والی مشینیں اور فشارِخون کے لیے مانیٹرز (Monitors) بناتی ہے لوگوں کو یہ سہولت بھی دیتی ہے کہ وہ اپنا وزن سوشل میڈیا پر دوسروں سے شیئر کرسکیں۔ اس طرح ان پر اپنے ڈائیٹ پلان پر عمل کرنے کے لیے سماجی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔

Green Gorse نامی کمپنی نے چھوٹے چھوٹے سینسر متعارف کروائے ہیں جن کو روزمرّہ استعمال کی چیزوں کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک ٹوتھ برش سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس طرح آپ یہ جان سکتے ہیں کہ آپ نے کتنی مرتبہ برش کیا ہے۔ ایک سینسر پودوں کو پانی دینے والے برتن سے منسلک کیا جا سکتا ہے جس سے آپ کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہفتے میں پودوں کو کتنی مرتبہ پانی دیا گیا۔

بڑی ٹیکنالوجی کمپنیاں بھی اس ٹیکنالوجی پر توجہ دے رہی ہیں۔ ان میں فلپس، ووڈافون (Vodafone) اور Intel شامل ہیں۔ فلپس نے ایپل کی مصنوعات کے لیے ایک ایپلی کیشن بنائی ہے جو اپنے کیمرے کے ذریعے صارف کے دل اور سانس کی شرح بتا سکتی ہے۔ Intel نے موبائل تھراپی کے نام سے ایک ایپلی کیشن متعارف کروائی ہے جو کسی بھی وقت صارف سے دلی کیفیت ریکارڈ کرنے کے لیے کہتی ہے۔ اس سے صارف یہ جان سکتا ہے کہ پورے ہفتے میں اس کا موڈ کیسا رہا۔

سیلف ٹریکنگ کی ایجادات نے اداروں اور کمپنیوں کا رخ بھی کرلیا ہے۔ ان کی مدد سے ملازمین کی کارکردگی کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے کام سے کس حد تک خوش ہیں۔

سٹے فوکسڈ (Stay Focused) ایک سافٹ ویئر ہے جو آپ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ آپ فیس بک کے استعمال کی مقرر کی گئی اپنی حد سے تجاوز کرنے لگے ہیں۔ اس طرح آپ اپنے کام پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں۔

ملازمین اگر خوش ہوں تو زیادہ بہتر کام کرتے ہیں۔ موڈ سکوپ (Mood Scope) سافٹ ویئر کے ذریعے ملازمین دن کے مختلف اوقات میں اپنے موڈ اور کام پہ اپنی توجہ کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس سے اداروں کو معلومات ملتی ہیں کہ کام کو کیسے زیادہ خوشگوار بنایا جائے۔

لائف اپ (Life up) آئی فون کی ایپلی کیشن ہے جو آپ کو اپنے کام کی کارکردگی بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس میں آپ دن کے اختتام پر یہ نوٹ کرتے ہیں کہ مختلف سرگرمیوں (Tasks) کے دوران آپ کی ذہنی اور دلی کیفیت کیا رہی۔

اس ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم اپنے ماضی کے بارے میں بہتر معلومات اکٹھی کرسکتے ہیں۔ اس سے دلچسپ لمحوں کی یاد تازہ کی جا سکتی ہے۔ ماضی سے سیکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں اچھی منصوبہ بندی بھی کی جا سکتی ہے۔

انسان کا اس قابل ہونا کہ وہ اپنی زندگی کے معمولات ریکارڈ کرسکے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس کا جواب بھی شاید مستقبل میں تلاش کرلیا جائے گا لیکن ٹیکنالوجی عام اور سستی ہونے کی بدولت انسان کا اپنی زندگی ریکارڈ کرنے کے قابل ہونا ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

ہم میں سے کچھ لوگ دوسروں کی نسبت جلد اور کھلے دل کے ساتھ ان ایجادات کو اپنا لیں گے لیکن آخرکار ہم سب اس ٹیکنالوجی کی طرف بڑھنے لگیں گے۔

آئیے بات کرتے ہیں

میری زندگی میں آنے اور حیران کرنے والی کتاب

پائیلو کوئیلو کی ''دی الکیمسٹ''

یوں تو بہت سی بہترین اور حیران کن کتابوں سے واسطہ پڑا ہے مگر تازہ بہ تازہ کتاب ''دی الکیمسٹ'' (The Alchemist) ہے جسے سپین کے عیسائی ادیب پائیلو کوئیلو نے تحریر کیا ہے۔ کئی سال سے یہ کتاب میرے ذخیرۂ کتب میں شامل تھی مگر پڑھنے کا موقع نہ ملا، پھر بھی میں اتنا جانتی تھی کہ یہ کتاب بین الاقوامی پذیرائی کی حامل ہے۔ چنانچہ ایک سوال بار ہا ذہن میں اُبھرا کہ کیا قرآنی موضوعات وتعلیمات سے ہٹ کر بھی کوئی ایسا موضوع اور تعلیم ہے جو زندگی بدل دے؟ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے ازحد خوشی ہوئی کہ یہ اُنہی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انسان کی روحانی طاقت کی جو قوت ادیب نے بیان کی ہے، اس کی جھلکیاں ہمیں اسلامی تصوف کی تاریخ میں بھی نظر آتی ہیں۔

اس کتاب نے میری سوچ کیسے بدل دی؟

بہت عرصے سے یہ عادت پختہ ہو چکی تھی کہ زندگی کی یکسانیت سے گھبرا کر شکوہ کرنے لگتی۔ مگر یہ کتاب مجھے شکوہ سے شکر کی راہ پر لے آئی اور فکر سے عمل کی طرف راغب کیا۔ سفر کی اہمیت کو مجھ پر اجاگر کیا۔ انسان کی قوتِ ارادی اور قسمت میں اُس کا کس حد تک عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ بھی مجھے اسی کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا۔

اس کتاب کی کون سی بات ابھی تک یاد ہے؟

اس کتاب کے کچھ فقروں نے مجھے بہت متاثر کیا اور اب تک میری یادداشت کا حصہ ہیں ''جن لوگوں کا ہر دن گزرے دن جیسا ہوتا ہے وہ قدرت کی اُن مہربانیوں اور فیاضیوں کو سمجھ ہی نہیں پاتے جو ہر نئے سورج کے ساتھ اُن پر طلوع ہوتی ہیں۔''

(عائشہ بتول احمدانی۔ کوٹ ادو)

حکیم سعید کی ''شاہراہِ زندگی''

یوں تو ہر اچھی کتاب سوچ کے نئے دَر وا کرتی اور انسان کو عمل اور حرکت پر اُکساتی ہے۔ میری زندگی کو بھی بنانے میں اچھی کتابوں نے اہم کردار ادا کیا۔ حکیم محمد سعید شہید کی مؤلف شدہ کتاب ''شاہراہِ زندگی'' کے مضامین میرے ذہن سے ابھی تک محو نہیں ہوئے۔ حکیم صاحب نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو نہایت دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے قرآنی حوالوں کے ساتھ اپنے واقعات کو پیش کرکے قارئین کے دِلوں میں توکل علی اللہ کا احساس اُجاگر کرکے عمل کے لیے متحرک کیا ہے۔ یہ کتاب اکثر میرے مطالعے میں رہتی ہے۔

(غلام حسین میمن۔ کھاتہ چوک، حیدرآباد)

گوشۂ خاص

لالہ صحرائی

کور خصت ہوئے ۱۲ سال ہونے کو آئے لیکن
اُنھیں محبت کرنے اور محبت سے یاد رکھنے والے اب بھی بہت ہیں
ہاں ان کے بہت سے احباب اپنا سفرِ زندگی مکمل کر کے ان تک جا بھی پہنچے ہیں
جولائی نے ان کی یادوں کو دہرانے کا موقع دیا ہے کہ یہ ان کے جانے کا مہینا تھا

ایک سادہ، بامروّت، مخلص نثر نگار اور سچے عاشقِ رسولؐ شاعر کا دل افروز تذکرہ

مشتاق یوسفی کی ''زرگزشت''

قرآن پاک سے بڑھ کر زندگی میں تبدیلی لانے والی تو کوئی دوسری کتاب نہیں البتہ ''انسانوں'' کی تحریر کردہ کتب میں سے مجھے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی معرکتہ الآرا تصنیف ''زرگزشت'' نے بے انتہا متاثر کیا۔ یہ کتاب مشتاق احمد یوسفی کی سوانح حیات بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ فاضل مصنّف کی داستانِ عزیمت و استقلال بھی ہے۔ اس میں اُن کی پاکستان کے ساتھ والہانہ محبّت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کتاب پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ یہ درجہ اول فلسفے کی اعلیٰ سند کا حامل نوجوان جو صوبہ راجستھان (بھارت) میں ڈپٹی کمشنر بھی تھا، وہ کس طرح اس اعلیٰ ملازمت کو ترک کر کے پاکستان آیا اور ایک بینک میں جونیئر افسر ہوا لیکن اُسے قدرت نے اس خلوص کا انعام کچھ اس طرح دیا کہ وہ بینکاری کی تاریخ میں بھی نمایاں ترین مقام رکھتا ہے۔ کبھی میری سوچ مایوسانہ تھی۔ محنت کے بجائے میں سفارش یا رشوت پر یقین رکھتا تھا لیکن اس کتاب کو پڑھ کر اللہ کی رحمت پر میرا ایمان مضبوط ہوا اور میں نے بھی محنت اور رحمت خداوندی کے بل پر اپنے شعبہ میں اعلیٰ درجات حاصل کیے۔ یعنی معمولی مُدرس سے ترقی کرتا ہوا تقریباً ایک لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا پروفیسر بن گیا۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مصنّف کو اپنی تحریر پر قادرانہ گرفت حاصل ہے۔ وہ جب چاہے قہقہے لگاتے ہوئے قاری کی آنکھوں سے اشک جاری کرا دے۔ اس کتاب میں ''اَجرک'' کے عنوان سے اُن کی تحریر پڑھ کر سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی اپنے آنسو نہیں روک سکتا۔ اس حوالے سے ممتاز شاعر پروفیسر انور مسعود نے یہ شعر غالباً اپنے سوا مشتاق احمد یوسفی کے لیے بھی کہا ہے۔

انور کی سرِ بزمِ سخن آئی ہے باری
کیا جانیے یہ شخص ہنسا دے یا رُلا دے

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

محمد یونس پانپوی کی ''بکھرے موتی''

بکھرے موتی کہنے کو ایک کتاب ہے مگر اوصاف کے اعتبار سے ایک سمندر ہے جس میں نہایت نایاب اور بیش قیمت ہیرے جواہرات حقیقتاً بکھرے پڑے ہیں۔ اس کتاب کے مصنّف مولانا محمد یونس پانپوی صاحب ہیں جو اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ قرآن و حدیث کے مطالعے میں ہمہ وقت مستغرق رہتے۔ اُن کی ساری زندگی اسلام کے لیے وقف تھی۔ یہ کتاب دراصل مولانا صاحب کی ذاتی ڈائری جو کہ ان کی زندگی میں آنے والی کتب کی چیدہ چیدہ باتوں، جنھیں اُنھوں نے نہایت قیمتی جان کر نوٹ کر لیا تھا، پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہ کتاب انسان کی راہنمائی کا سارا مواد لیے ہوئے ہے۔ کون سا ایسا موضوع یا مسئلہ ہے جو ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتا ہے اور وہ اس میں موجود نہ ہو۔ ہماری چھوٹی بڑی خامیاں، غلط فہمیاں، توہمات ہر چیز سے خبردار کرتے ہوئے اصلاح کا طریقہ بھی بتاتی ہے۔ پند و نصائح قدم قدم پر اصلاح کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کا ایک عنوان ہے ''۹/ باتوں کا حکم۔''

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے ۹/ باتوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ ظاہر اور پوشیدہ حالت میں اللہ سے ڈرنے کا۔ ۲۔ غصے اور ناراضگی کی حالت میں راست و درست بات کہنے کا۔ ۳۔ غریبی اور مال داری کی حالت میں درمیانہ روی اختیار کرنے کا۔ ۴۔ جو میرے ساتھ بدسلوکی کرے اس کے ساتھ میں نیک سلوک کروں۔ ۵۔ جو مجھے محروم رکھے اس کو دادودہش سے نوازوں۔ ۶۔ جو مجھ پر ظلم کرے اس سے درگزر کروں۔ ۷۔ میری خاموشی فکر ہو۔ میرا بولنا ذکر ہو۔ ۸۔ میرا دیکھنا عبرت ہو۔ ۹۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں نیکی کی تلقین کرتا رہوں۔

(زرنگار۔ منڈی فاروق آباد، ضلع شیخوپورہ)

ہماری ۶۰ سالہ رفاقت میں کبھی سیاسی اختلافات کا ذکر بھی نہیں آیا

احمد ندیم قاسمی

ابتدا

محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ یہ کوئی ۶۰ برس پہلے کی بات ہے مسلسل بیروزگاری سے تنگ آکر مجھے ایک ایسے سرکاری محکمے سے منسلک ہونا پڑا جس کا ماحول اور جس کے فرائض میری افتادِ طبع سے صد فیصد مختلف تھے مگر اس ملازمت کا صد فیصد کھرے سونے کا سا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے چودھری محمد صادق کی دوستی اور ہم نشینی نصیب ہوگئی۔ میں ملتان میں سب انسپکٹر آبکاری تھا۔ چند ماہ کے بعد میرا تبادلہ خانیوال کردیا گیا۔ صادق صاحب سے میرا تعارف خانیوال میں ہوا۔ میری شاعری اور افسانہ نگاری کے آغاز کے دن تھے مگر صادق صاحب کی ادبی دوستی نے اسی کو غنیمت سمجھا اور ہم دیر دیر تک باہمی گفتگو اور ادبی و دینی معلومات کے تبادلے میں مصروف رہنے لگے۔ اس محبت کی معراج خانیوال میں میرا قیام تھا۔ وہاں مجھے دو نعمتیں حاصل ہوئیں۔ صادق صاحب اور ساتھ ہی ایک نہایت پیارے دوست نندلال اہنجہ کا قُرب۔ محمد صادق جہانیاں سے تشریف لاتے تھے۔ نندلال خانیوال ہی میں اپنے ایک قریبی عزیز کے ہاں مقیم تھے۔ جب میرے یہ دونوں جگری دوست میرے گھر میں اکٹھے ہوتے تو میں اپنی خوش بختی پر اس درجہ نازاں ہوتا کہ انھیں گھنٹوں اپنے گھروندے میں بٹھائے رکھتا تھا۔ یوں محمد صادق اور نندلال کے درمیان بھی محبت کا رشتہ استوار ہوگیا۔ ہم تینوں آپس میں اتنے محو ہوتے تھے کہ گزرتے ہوئے وقت کو بار بار شکست پر شکست دے ڈالتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ جب بھی میں اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنے کے لیے دورے پر نکلتا تو میرا پہلا پڑاؤ جہانیاں میں ہوتا جہاں میں محمد صادق کے ہاں ٹھہرتا۔ ان کے والد گرامی محکمہ انہار کے ٹھیکے دار تھے اور نہر کنارے ان کا مختصر سا کوارٹر ہماری آماجگاہ تھا۔ اس کوارٹر میں ہم نے نظیر اکبر آبادی سے غالب اور اقبال تک اور پھر مجدد الف ثانی سے لے کر جمال الدین افغانی اور مولانا مودودیؒ تک اتنی طویل گفتگوئیں کیں کہ ہم دونوں پر سرشاری کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

محمد صادق نہایت درجہ خوشخط تھے۔ انھوں نے ایک بار اس شوق کا اظہار کیا کہ وہ میرا پورا کلام اپنے خوبصورت خط میں لکھیں گے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ تب میری شاعری قطعات اور چند قومی و ملّی نظموں پر مشتمل تھی۔ چودھری صادق نے سارا کلام اپنے قلم سے لکھا۔ بعد میں جب مجھے فنی بلوغت حاصل ہوئی تو میں نے ان کے لکھے ہوئے بیاض کی بیشتر چیزیں اپنا مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' مرتب کرتے ہوئے مسترد کردیں مگر میں اپنے اس نہایت پیارے دوست کی نگارش کے نمونے ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔ میرے پرانے کاغذات کے انبار میں اس کے چند صفحات آج بھی محفوظ ہوں گے۔

ایک بار پھر میرا تبادلہ ملتان ہوگیا تو یہاں میری ملاقات ایک نہایت عزیز دوست خان حمید اللہ خان نیازی پولیس سب انسپکٹر سے ہوئی جو علی گڑھ کے گریجوایٹ اور شعروادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ میں نے اپنے قطعات کا مجموعہ ''رم جھم'' انہی کے نام معنون کر رکھا ہے۔ چودھری صادق کا ان سے تعارف ہوا تو ان کے درمیان محبت کا گہرا تعلق پیدا ہوگیا۔ اس کے بعد حمید نیازی بحیثیت سپرنٹنڈنٹ پولیس ریٹائر ہوکر ضلع میانوالی میں اپنے گاؤں منتقل ہوگئے۔ اس دوران میں حمید نیازی اور چودھری صادق کے درمیان باہمی محبت کا ایسا رشتہ قائم ہوچکا تھا جو حمید اللہ نیازی کے انتقال تک پوری شدت اور خوبصورتی سے جاری رہا۔ حمید اللہ نیازی کو خط لکھنے میں مجھ سے تو کوتاہی ہو جاتی تھی مگر مجال ہے جو حمید نیازی کو چودھری صادق کی طرف سے اس طرح کی بھی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔

میں ۱۹۴۱ء میں آبکاری کی سب انسپکٹری سے مستعفی ہوکر لاہور بھاگ گیا اور وہاں بچوں کے ہفتہ وار اخبار پھول، خواتین کے ہفت روزے تہذیبِ نسواں اور مشہور ادبی ماہنامے ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالی۔ اس دوران چودھری صادق سے میرا گہرا تعلق مستقلاً استوار رہا۔ پھر میں ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو پشاور میں سکرپٹ رائٹر کی ملازمت کرنے لگا۔ اگلے سال اگست میں پاکستان قائم ہوا اور ساتھ ہی مسلم غیر مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ میرے ۲/نہایت درجہ پیارے ہندو دوست منوہر لال اور نندلال تھے۔ منوہر لال تو ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی کلکتہ میں کسی فرم سے وابستہ ہوگیا تھا مگر جب آزادی کے ساتھ ہی دونوں طرف مار دھاڑ شروع ہوئی تو مجھے اپنے پیارے دوست نندلال کی فکر لاحق ہوگئی۔ مجھے اور کوئی راہ نہ سوجھی تو میں نے چودھری صادق کو تار بھیجا کہ فوراً ایک ٹرک لیجیے اور کبیر والا میں نندلال اور ان کے والد کو ریفیوجی کیمپ میں بحفاظت پہنچانے کا بندوبست کیجیے۔ میرا تار ملتے ہی محمد صادق نے ایک ٹرک کرائے پر لیا۔ ۲/بندوق بردار ساتھی ہمراہ لیے اور کبیر والا پہنچ گئے مگر ان کے کبیر والہ پہنچنے سے ایک روز پہلے ہی نند اور اس کے والد ریفیوجی کیمپ میں منتقل ہوچکے تھے۔ بہرحال محمد صادق نے اپنے خلوص کا مظاہرہ کردیا تھا۔

میں نے اپنے درویش صفت دوست کو ایک اور ایسی ہی تکلیف دی۔ بمبئی سے مجھے سعادت حسن منٹو نے لکھا کہ ڈاکٹر نے میرے نسخے میں خالص گھی بھی لکھا ہے کہ اس کے استعمال سے تمھاری صحت بحال ہوگی۔ یہاں پورے جنوبی ہند میں خالص گھی کا کوئی سراغ نہیں ملا اور اگر خالص گھی کہیں ملتا بھی ہے تو میں اس سے بے خبر ہوں اس لیے تم میرے لیے خالص گھی کے ایک کنستر کا بندوبست کرو اور مجھے بمبئی بھجوا دو۔ میں ان دنوں نروس بریک ڈاؤن کا مریض ہوکر لاہور سے اپنے پہاڑی گاؤں منتقل ہوچکا تھا۔ سو میں نے منٹو کی یہ فرمائش پوری کرنے کے لیے چودھری صادق کو لکھا۔ انھوں نے ایک کنستر خالص گھی کا بمبئی بھجوا دیا۔ منٹو نے اس پر اپنے اخبار میں ایک دلچسپ کالم لکھا تھا اور چودھری صادق کی عنایت کو بڑے شگفتہ انداز میں سراہا تھا۔

آزادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے، چودھری صادق فوج میں بحیثیت کلرک بھرتی ہوکر لکھنؤ چلے گئے۔ ادھر میرا بھانجا، ظہیر بابر بھی، جس نے بعد میں ایک صحافی کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی، فوج میں کلرک بھرتی ہوا اور اس کی تعیناتی بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ یوں مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا کہ میرے پیارے بھانجے کو میرے ایک بہت پیارے بھائی کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ ان دونوں کا وقت اچھا گزرا مگر پھر یکایک دونوں ہی اکتا گئے اور دونوں آگے پیچھے مستعفی ہوکر واپس آگئے اور خدا کا شکر ہے کہ واپس آگئے کہ ایک بھرپور مستقبل ان کے انتظار میں تھا۔

ان ننھے ننھے واقعات سے بآسانی اندازہ ہوجاتا ہے کہ چودھری محمد صادق کے مزاج و کردار میں کتنی بے شمار خوبصورتیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ ان دنوں جب ہماری پے درپے ملاقاتیں ہوتی تھیں، مولانا مودودیؒ کی تصانیف ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ انھوں نے ان تصانیف میں سے بعض مجھے بھی عنایت کیں جو میرے پاس محفوظ ہیں اور اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ یہ ان تصانیف کے پہلے اڈیشن تھے۔ بعد کے اڈیشنز میں ترامیم اور اضافے کردیے گئے اس لیے اولین اڈیشنز کی اہمیت واضح ہے۔ محمد صادق نے یہ کتابیں کبھی واپس طلب نہ کیں۔ یہ بھی ان کی بڑائی ہے۔

میں جماعت اسلامی کی سیاسیات سے کبھی متفق نہ ہو سکا اور چودھری صادق کو اس کا علم تھا مگر ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی بھولے سے بھی گفتگو نہ ہوئی۔ ہم دونوں کے ضمیر شفاف اور منزّہ تھے اور محبت میں استقامت کا سارا معاملہ ہی ضمیر کی اصلاح کا ہوتا ہے۔

صرف ایک بار میرے سامنے چودھری صادق کے لبوں پر جماعت کا ذکر آیا۔ لاہور میں جماعت کا ایک بڑا اجتماع ہوا جسے حکومت وقت روکنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک لاٹھی چارج کے دوران جماعت کا ایک کارکن زخموں کی تاب نہ لاسکا۔ محمد صادق اس اجتماع میں موجود تھے۔ میں نے فنون کی اشاعت شروع کردی تھی اور میرا دفتر انارکلی میں بائبل سوسائٹی کے سامنے تھا۔ جب محمد صادق اس دفتر میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر جلی حروف میں شدید دکھ درج ہے۔ انھوں نے مجھے لاٹھی چارج اور کارکن کی رحلت کا حال سنایا۔ میں نے بھی حکومت کی اس غیرانسانی کارروائی کے خلاف احتجاج کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ محمد صادق نے محض اپنی کیتھارسس کے لیے بھرائی ہوئی آواز میں اس مسئلے پر گفتگو کی۔ اس کے سوا ہمارے پورے ۶۰ برس کی رفاقت میں کبھی کسی سیاسی اختلاف کا ذکر نہ آیا بلکہ جب میں اپنے افسانوں کے مجموعے ''گھر سے گھر تک'' کا چودھری صادق کے نام انتساب لکھنے لگا تو اس سیاسی اختلاف کا ہلکا سا اشارہ ضرور کردیا جس سے وہ شکوہ سنج ہونے کے بجائے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

کوئی ہفتہ عشرہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے مجھے خط نہ لکھا ہو یا ٹیلی فون نہ کیا ہو۔ ہر خط اور ہر ٹیلی فون کے آخر میں ان کا ارشاد ہوتا تھا کہ میرے لیے دعا کیجیے۔ میں ان کا دل رکھنے کے لیے یہ تو کہہ دیتا تھا کہ میں آپ کے لیے سراپا دعا ہوں مگر دراصل وہ خود اتنے نیک سیرت اور نیک خصلت انسان تھے کہ جن سے دعا کرائی جائے تو وہ بارگاہ خداوندی میں یقیناً قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہوگی۔

پھر ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ چودھری صادق نعت نگاری کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعۂ نعت کا مسودہ مجھے بھجوایا اور میں نے چند مبتذیانہ فروگزاشتوں کی نشاندہی کردی۔ اس کے بعد نعتیں ان کے باطن میں سے سیلاب کی طرح اُمڈ پڑیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جس والہیت اور شیفتگی کا اظہار کیا وہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ انھوں نے حضورؐ کے بڑے چھوٹے غزوات تک کو نظم کرڈالا۔ اس مجموعے کا مسودہ بھی میری نظر سے گزرا اور میں نے اس کا پیش لفظ بھی لکھا۔ سوچا شاید یہ ان کی نعت نگاری کا اختتامیہ ہے مگر نعت نگاری تو ان کی روزانہ کی عبادت کا ایک حصہ بن گئی تھی سو وہ آخری دم تک نعتیں تخلیق کرتے رہے اور ان کے لائق فرزندوں نے ان کا ایک مجموعۂ نعت ان کے انتقال کے بعد بھی مرتب کرلیا ہے۔

یہ تھے چودھری محمد صادق..... لالہ صحرائی..... جو محبت اور نیکی کے معاملے میں استقامت کے ایک معجزے سے کم نہیں تھے۔ وہ ان اِکا دُکا اصحاب میں شامل ہیں جن کے دم سے یہ دنیا قائم ہے ورنہ اس کو تہس نہس کرنے میں ہم میں سے کسی نے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور یہ کہ محمد صادق مرحوم اور ان جیسے چند دیگر بندگان خدا تھے جن کا وجود اس امر کی ناقابل تردید شہادت تھا کہ روزِ ازل اگر اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا تو ٹھیک کیا تھا۔

◆◆◆

لالہ صحرائی

کا ذکر پہلے پہل میں نے جناب احمد ندیم قاسمی سے سنا اور بکمال محبت، ایک عزیز دوست کی حیثیت سے سنا۔ بعدازاں بعض اور حلقوں میں بھی اسی ذکرِ خیر کی بازگشت سنائی دی جس میں ان کی شخصیت کی نفاست، پاکیزگی، اعتدال اور اخلاص اُبھر کر سامنے آتے تھے۔ افسوس کہ مجھے خود کبھی ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہوسکا۔

جناب لالہ صحرائی نے برصغیر کی ادبی روایت کو بہت دیر تک قریب سے دیکھا۔ لڑکپن ہی سے ان کی طبیعت کلاسیکی ادب کی طرف مائل ہوگئی جس میں ان کا استغراق تازندگی باقی رہا۔ انھوں نے ہر مکتبِ فکر کے ادب کو انہماک سے پڑھا مگر ان کا اپنا ادبی مسلک ان کی مضبوط دینی واخلاقی تربیت پر استوار رہا۔

لالہ صحرائی اگرچہ جوانی میں بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تھے مگر طبیعت جلد ادھر سے ہٹ گئی اور نثر ہی ان کے قلم کی جولاں گاہ رہی اور اسی حوالے سے پہچانے گئے۔ انہوں نے مضامین، خاکہ، رپورتاژ، افسانہ، طنز و مزاح، ترجمہ، تبصرہ، ڈراما، سفرنامہ جیسی متنوع اصناف میں بہت کچھ لکھا۔ پیرانہ سالی میں جب کئی بار حج وعمرہ کی سعادت پائی اور روضہ رسولؐ پر حاضری نصیب ہوئی تو نعت گوئی کی آرزو دل میں چٹکیاں لینے لگی اور پھر ایسے بھرپور انداز میں پوری ہوئی کہ اس کا فیضان آخری وقت تک جاری رہا۔ ان کے اپنے ہی الفاظ میں:

اک نعت مسلسل ہے مری روح پہ طاری
جب سے کہ ہوا ہوں میں فقط نعتیہ شاعر
یہ سب مری نعتیں ہیں اسی نعت کے ٹکڑے
اس نعت کا مقطع میں کہوں گا دمِ آخر

۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء تک..... (جو اُن کا سالِ وفات ہے) نعت گوئی کا تسلسل جاری رہا جس کے نتیجے میں ۱۵؍ نعتیہ مجموعے مرتب ہوگئے..... لالہ صحرائی کی نعت بنیادی

محبت اور نیکی کے معاملے میں ان کی استقامت معجزے سے کم نہیں

نعت نگاری ان کی روزانہ کی عبادت کا حصہ بن گئی تھی

ڈاکٹر خورشید رضوی

طور پر جذبے کے وفور سے عبارت ہے۔ وہ آرایشِ فن کا دعویٰ نہیں رکھتے مگر ان کا یہ انکسار اس وقت کھل جاتا ہے جب ہم غالبؔ کی متعدد غزلیہ زمینوں میں ان کی نعتیں دیکھتے ہیں۔ یوں بھی سادگی اور برجستگی جب احساس کی صداقت سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے تو مہارتِ فنی سے آگے کی چیز بن جاتی ہے:

اے خدا شہر نبیؐ میں مجھے گھر مل جائے
جس سے کھلتا ہے نصیبہ وہی در مل جائے

.....

حُبِ نبیؐ سے دل مرا سرشار ہوگیا
خوابیدہ تھا جو بخت وہ بیدار ہوگیا

لالہ صحرائی نے نعت گوئی میں ہیئت کے تجربے بھی کیے چنانچہ پابند نظم کے علاوہ آزاد نظم کو بھی برتا اور مخمس، مسدس، دوبیتی اور قصیدہ کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ پنجابی میں بھی نعت لکھی اور اردو نعت میں پنجابی ماہیے کے آہنگ کا بھی تجربہ کیا جسے ''نعتیہ ہائیکو'' بھی کہا جاتا ہے۔

نعت کے علاوہ اُنھوں نے حمدیہ شاعری بھی کی۔ احادیث کے مضامین اور غزوات کے واقعات کو نظم کیا اور قومی وملی موضوعات اور شخصیات پر عمومی نظمیں بھی کہیں۔ نظم ونثر کا یہ سارا سرمایہ ایک طرف قرطاس وقلم سے ان کے مضبوط رشتے کا عکاس ہے اور دوسری طرف ان کے ایمانِ راسخ کا آئینہ دار۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

◆◆◆

ان کی نگارشات ادبِ اسلامی کا گراں قدر سرمایہ ہیں

ڈاکٹر جاوید احمد صادق

والد محترم اپنے والدین کے محدود مالی وسائل کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن مطالعے کے شدید شوق کی بنا پر اُنھوں نے مختلف موضوعات پر کتب، جرائد، اخبارات کا باقاعدہ مطالعہ جاری رکھا۔ مجھے یاد ہے جب ہمارے شہر میں بجلی کے قمقمے روشن نہ ہوئے تھے تو مٹی کے تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی میں روزانہ رات کو پابندی سے دو تین گھنٹے تک مطالعہ ان کا معمول تھا۔ یوں حیرت انگیز طور پر وسیع المطالعہ ہونے کی بنا پر مختلف موضوعات پر اُنھوں نے بے پناہ معلومات حاصل کر لیں۔ اس طرح مسلسل مطالعہ اور لگاتار محنت سے ان میں ایک خاص علمی ذوق پیدا ہوگیا۔ اُنھوں نے خود بھی لکھنا شروع کر دیا اور ان کی نگارشات ملک کے مؤقر اور معتبر رسائل و اخبارات میں چھپنے لگیں۔ وہ ایک منفرد اور حسین و رعنا اسلوبِ نگارش رکھتے تھے۔ لہجے کا باوقار دھیما پن، قوتِ استدلال، شگفتگی، دلفریبی، منظر نگاری، جزئیات نگاری، جذبات و احساسات کا برجستہ اور مسحور کن اظہار ان کی تحریر کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ افسانہ نگار، ڈراما نویس، سوانح نگار اور مترجم بھی تھے۔ منکسر المزاجی کا یہ عالم کہ بے مثل علمی و ادبی صلاحیتوں کو اپنی درویش منش فطری انکساری اور نام و نمود کے جائز اظہار سے بھی طبعی بے نیازی کی بنا پر اُنھوں نے اصل نام کے بجائے ''لالہ صحرائی'' کا قلمی نام اختیار کر لیا۔

اُن کی نگارشات اسلامی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اُنھوں نے نثر نگاری اس وقت شروع کی جب اسلام کے حق میں لکھنے والے کم تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی قدروں کی اشاعت اور تخریبی عناصر کے مقابلے اور سدباب کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ ادب کے صحرا میں پھول بن کر مہکے۔ جب بھی ملکی بقا پر کوئی اُفتاد پڑی اُن کا قلب تڑپ اٹھا۔ مختلف سیاسی تحریکوں کے مواقع پر ان کا قلم ناموسِ وطن کی حفاظت کے لیے رواں دواں ہوگیا۔ مرحوم و مغفور وضع دار، متواضع شخصیت کے ساتھ ساتھ بردباری، اخلاص جیسے اوصاف حمیدہ سے آراستہ تھے۔ سراپا محبت اور سراپا شرافت تھے، وہ پاکیزہ سیرت عجز و انکسار، خلوص و محبت کا جیتا جاگتا شاہکار تھے، قول و فعل کے اعتبار سے ''صادق'' تھے۔ حق بات کے اظہار میں کبھی مصلحت کوشی اختیار نہ کرتے۔ حق اور سچ کی گواہی سے کبھی گریز نہ کیا۔ ذاتی رنجش کا ان کے ہاں تصور ہی نہ تھا۔ ان کا اختلاف اگر کسی سے ہوتا تو وہ اسلام اور پاکستان کے حوالے سے ہوتا۔ وہ توحید پر کاربند رہے، بندوں کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب نہ ہوتے۔ جہانیاں جیسے دور افتادہ قصبہ میں مقیم ہوتے ہوئے احباب سے تعلقات نبھانا انھی کا خاصہ تھا۔ مولانا ماہر القادری، مشفق خواجہ، نعیم صدیقی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، شاہ مصباح الدین شکیل، محمد صلاح الدین شہید، حفیظ تائب، پروفیسر عاصی کرنالی، الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمان شامی، مصطفیٰ صادق اور متعدد دیگر علم دوست اصحاب سے ان کا تعلق خاص تھا۔ اسی رشتے کی بدولت ۱۹۶۲ء میں جہانیاں میں کل پاکستان مشاعرہ کا انعقاد انھی کی کاوشوں سے ممکن ہو سکا۔ مرحوم والد گرامی نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔

یقیناً ایسے انسان اب اس معاشرے میں خال خال ہی ملتے ہیں کہ جن سے کسی کو کبھی معمولی سی بھی تکلیف نہ پہنچی ہو اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا ہو چنانچہ یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز اور ایمان افروز ہے کہ ایک شخص ۸۰ سال کی عمر گزارے اور بلا مبالغہ کسی کو شکایت کا موقع نہ دے۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک موقع پر ٹھیک ہی کہا تھا ''یہ وہ صاحب ہیں جنھیں دیکھ کر زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے''۔

◆◆◆

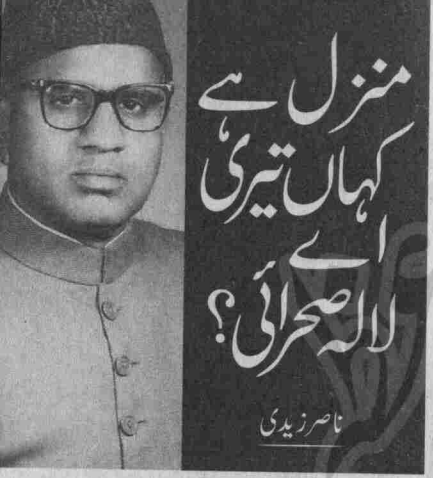

منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی؟

ناصر زیدی

رہے نام اللہ کا..... جہانیاں ضلع خانیوال کی ایک انتہائی علمی، دینی، سیاسی شخصیت کے حامل چودھری محمد صادق لالہ صحرائی نے ۸۰ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ وہ نصف درجن مطبوعہ کتابوں کے مصنّف، مؤلف تھے۔ نظم و نثر دونوں اصناف ادب میں رواں تھے مگر ان کی بنیادی شناخت ایک عاشقِ رسولؐ نعت گو کی تھی۔ ان سے غائبانہ تعارف محبِّ گرامی قدرت اللہ چودھری کی وساطت سے مدتوں پہلے سے تھا۔ وہ اپنی ہر تصنیف بھی براہِ راست کبھی قدرت اللہ چودھری کے ذریعے اس خاکسار کو بھجوا دیتے تھے۔ جن پر حسبِ مقدور میں ریڈیو سے اور پھر اخبار کے کالموں میں تبصرہ بھی کر دیتا تھا۔ ملاقات کا شرف صرف ایک بار حاصل ہوا۔ غالباً وہ اسلام آباد میں منعقدہ ''سیرت کانفرنس'' میں اپنا ایوارڈ لینے آئے تھے، مختصر ملاقات ہوئی اور بے ساختہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کا مصرع دہرایا۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی؟

اس اوّلین ملاقات کے بعد میرا پہلا تاثر یہی تھا بقول جوش ملیح آبادی ؎

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں، کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

چودھری محمد صادق پیرانہ سالی اور بینائی کی کمزوری کے باوجود کسی اعتبار سے ۸۰ برس کے نہ لگتے تھے۔ مجھے تو وہ چاق و چوبند اور ہر لحاظ سے چست نظر آئے مگر موت کو بہر حال کوئی بہانہ تو چاہیے۔ ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے بندۂ بے چارہ کا کیا چارہ ہے۔

بلاشبہ ان کی نعت گوئی میں اخلاص کا عنصر حاوی تھا۔ فنی طور پر اور شعری محاسن کی باریکیوں کے لحاظ سے ان کے کلام میں ممکن ہے نظرِ ثانی کی گنجائش موجود ہو لیکن جہاں تک ان کے خلوص اور عقیدت و محبت کے والہانہ پن کا تعلق ہے، وہ ان کے نعتیہ مجموعوں میں قاری کو ہر مصرع میں ملتا ہے۔ ان کے مطبوعہ نعتیہ، حمدیہ مجموعوں میں ''لالہ زارِ نعت''، ''بارانِ نعت'' اور ''قلم سجدے'' (حمدیں)۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جبکہ ''نورِ منارہ'' مولانا سیّد مودودیؒ کے بارے میں ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''چمن میری امیدوں کا'' مختلف خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ''نئے پھول، پرانی خوشبو'' میں انہوں نے تفہیم القرآن سے منتخب اقتباسات یکجا کیے ہیں۔ ان کی زیرِ طباعت کتابوں میں ''نعت ستارے''، ''نعت صدف''، ''نعت دھنک'' اور ''نعت سویرا'' کے نام سے ۴ کتابوں کی اشاعت جلد متوقع ہے۔ آخری مطبوعہ مصولہ کتاب ''غزوات رحمۃ اللعالمینؐ'' (منظوم) تھی جس کی ''تقریظ'' جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھی۔ ''ایک زندہ کارنامہ'' کے عنوان سے میرزا ادیب مرحوم نے لالہ صحرائی کی اس کاوش کو بے حد سراہا۔ ''ایک نیا لالہ زار'' کے عنوان کے تحت عاصی کرنالی نے اور ''پیشوائی'' کے عنوان سے حفیظ تائب نے اس کارنامے کی حد درجہ پذیرائی کی۔

عمر کے آخری ۸ سال میں لالہ صحرائی نے شعر و ادب کے دامن کو اس قدر مالا مال کر دیا جتنا اکثر شعراء بچپن سے شاعری کا آغاز کر کے مرتے دم تک نہیں کر پاتے۔

ایک زندہ کارنامہ

لالہ صحرائی نے غزوائی کوائف کو منظوم کردیا

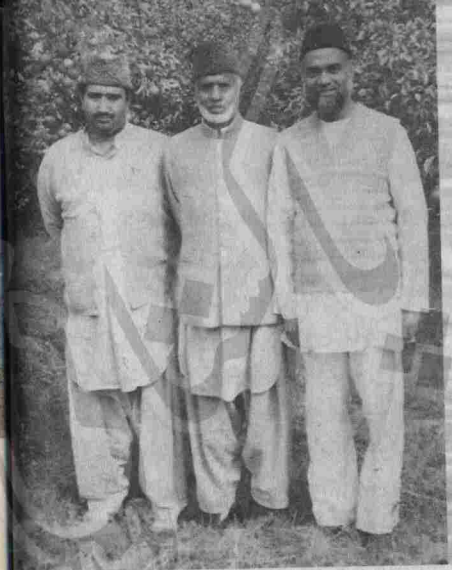

میرزا ادیب

حضرت عائشہؓ سے کسی صحابیؓ نے استفسار کیا تھا کہ حضور مکرمؐ کی سیرت کیسی ہے؟ حضرت عائشہؓ نے ایسا جواب دیا تھا کہ اس سے بہتر جواب تصور میں آ ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے فرمایا تھا ''وہ زندہ قرآن ہیں''، یعنی ان کا ہر عمل، ہر سرگرمی، ہر قول، قرآنِ مجید کے مطابق ہے۔ اللہ نے حضورؐ کو تمام ابنائے آدم کے لیے ایک مثالی رسول بنا کر بھیجنا تھا۔ اس لیے آپؐ کا ہر قول، ہر فعل ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپؐ گھر میں ہوں، گھر سے باہر ہوں، امن و سکون کی تلقین کر رہے ہیں یا خدا کے احکام کی تبلیغ میں مصروف یا خدا کے احکام کا انکار کرنے والوں سے مشغولِ جنگ ہوں، آپؐ ہر حال میں، ہر جگہ، ہر لمحہ اسوۂ حسنہ ہی کے مظہر ہوں گے۔

لالہ صحرائی کا یہ قابلِ صد قدر کارنامہ، حضورؐ کی مقدس زندگی کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو غزوات میں گزرا تھا۔ حضورؐ رحمۃ اللعالمین تھے۔ کافروں سے جنگ آزمائی میں بھی وہ رحمۃ للعالمینؐ ہی تھے۔ اس لیے لالہ صحرائی نے اپنی اس تخلیقی کوشش کو غزواتِ رحمۃ للعالمینؐ کا نام دیا ہے۔

جو نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ رحمۃ للعالمینؐ کی رحمۃ للعالمینی ہر مقام پر زندگی کے ہر ہر شعبے میں نمایاں تھی مکمل طور پر واضح تھی۔ لالہ صحرائی نے غزوائی کوائف کو منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔

مصنف نے ہر غزوے کا پس منظر، دورانِ جنگ حضورؐ کا طریقِ عمل، آپؐ کے فرمودات، ہدایات اور پالیسی سب کچھ پیشِ نظر رکھا اور یہ سب کچھ شعری محاسن کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنا، خاص تقاضوں کے ہمراہ تخلیقی سفر کرنے کے مترادف ہے اور پھر شاعری کے اپنے مخصوص تقاضے ہیں۔ ان کو بھی مرکزِ توجہ بنائے رکھنا، دوگونہ صلاحیتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں بڑی مسرت سے اس اَمر کا اعتراف کرتا ہوں کہ لالہ صحرائی نے ان صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیا ہے اور اپنی کاوش کو تخلیقیت کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

یہ ایک زندہ کارنامہ ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گا!

قرارِ جاں کا نسخہ

لالہ زارِ نعت کی ۱۰۰ نعتوں نے گل و گلزار کا سماں پیدا کر دیا

مشفق خواجہ

ممتاز نثر نگار اور میرے محترم محمد صادق ادبی حلقوں میں ''لالۂ صحرائی'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب کبھی میں ان کے ادبی نام کا تصور کرتا ہوں تو معلوم نہیں کیوں اقبالؒ کا یہ مصرع خود بخود زبان پر آجاتا ہے۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

اور اب اُن کا مجموعۂ نعت میرے سامنے ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اقبالؒ کے اس مصرعے کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ یہ مجموعہ لالۂ صحرائی کے ادبی سفر کی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔

جناب محمد صادق زندگی بھر نثر کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ اس کا گمان نہ انھیں تھا اور نہ ان کے مجھ جیسے نیازمندوں کو کہ ان کے ادبی سفر کی منزل شاعری ہے اور شاعری بھی وہ جسے حاصلِ شاعری کہنا چاہیے۔ ان کی نعت گوئی کو اگر ایک ادبی معجزہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک عرصے سے اس کے خواہش مند تھے کہ ان کے دل میں عشقِ رسولؐ کے جو جذبات موجزن ہیں، انھیں لفظوں کی زبان مل جائے۔ یہ دعا قبول ہوئی اور صرف ۶ مہینے میں ان کے دلی جذبات نے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر ۱۰۰ نعتوں کی صورت میں گل و گلزار کا سماں پیدا کر دیا ''لالہ زارِ نعت'' اسی گل و گلزار کا مرقع ہے۔

محمد صادق کا خیال ہے کہ وہ ''باقاعدہ'' شاعر نہیں ہیں، اس لیے ان کی نعتوں میں شعری حُسن یا فنی خوبیاں نہیں ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ وہ ''باقاعدہ'' شاعر کون ہیں؟ جن کے ہاں شعری حُسن اور فنی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر ہمارے ہاں محمد صادق جیسے ''بے قاعدہ'' شاعر سامنے آتے رہیں تو ادبی صورتِ حال بہتر ہو سکتی ہے۔ مجھے تو زیرِ نظر مجموعے میں وہ سچی شاعری نظر آتی ہے جو شعری حُسن اور فنی خوبیوں کا بدل نہیں بلکہ نعم البدل ہوتی ہے۔ اسی سچی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ جہاں ایک طرف عشقِ رسولؐ کا آئینہ دار تو دوسری طرف پڑھنے والے کو ادبی مسرت سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔

جناب مصنف نے اپنی نعت گوئی کے بارے میں فرمایا ہے۔

عجیب نسخہ ملا ہے قرارِ جاں کا مجھے
میں نعت کہنے لگا، جب بھی بے قرار ہوا

پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ مجموعہ ان شاء اللہ قرارِ جاں کا نسخہ ثابت ہوگا۔

◆◆◆

اُن کی تحریریں بڑے پُختہ اَدبی اسلوب کی حامل تھیں

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

علامہ اقبال کے کلام میں لالہ ٔ صحرا کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے۔ یہ ان کا سب سے پسندیدہ پھول ہے۔ لالہ، ان کی شاعری میں ایک علامت بھی ہے کہیں تو یہ اقبال کے مثالی انسان (مردِ مومن) کی نمائندگی کرتا ہے، کہیں یہ امت مسلمہ کے لیے استعارہ بنتا اور کہیں یہ نور اور روشنی کی علامت ہے۔ لیکن جس حیثیت میں بھی لالہ کا ذکر ہو، اس سے اقبال کی پسندیدگی کا اظہار اور اس کے لیے اقبال کی ایک اپنائیت اور قربت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی نظم ''لالہ ٔ صحرا'' کا ایک شعر ہے ؎

بھٹکا ہوا راہی تُو، بھٹکا ہوا راہی میں
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ ٔ صحرائی

مرحوم دوست چودھری محمد صادق نے علامہ اقبال کی اس ترکیب ''لالہ ٔ صحرائی'' کو اپنے قلمی نام کے طور پر اختیار کیا، یوں تو ایک لکھنے والا کوئی بھی قلمی نام اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارے بعض نامور ادیبوں اور صحافیوں نے طرح طرح کے قلمی نام اختیار کیے مثلاً سندباد جہازی (چراغ حسن حسرت)، عنقا (احمد ندیم قاسمی)، اسرار بصری (شورش کاشمیری) وغیرہ۔ مگر غور کیجیے تو ہر قلمی نام کے پیچھے کسی طرح پسندیدگی، لگاؤ یا ذہنی رجحان کی جھلک نظر آئے گی۔ لالہ ٔ صحرائی کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ نام اختیار کرنے والا روشنی اور نور کو پسند کرتا ہے۔ مردِ مومن کا دلدادہ ہے اور امت مسلمہ کا عروج و زوال اس کی زندگی کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری نے انہیں صرف ان کا قلمی اور ادبی نام (لالہ ٔ صحرائی) ہی نہیں دیا بلکہ اس شاعری کے جادو نے، انہیں اپنا اسیر بنا لیا...... اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مطالعہ ٔ اقبال کے سلسلے میں اُنھیں ''زبورِ عجم'' مطلوب تھی مگر ان دنوں ان کی مالی استطاعت اتنی نہ تھی کہ وہ کتاب خرید سکتے۔ چنانچہ اُنھوں نے کسی دوست سے ''زبورِ عجم'' کا پہلا اڈیشن (۱۹۲۷ء) مستعار لیا اور چند دنوں میں اسے اپنے ہاتھ سے پورے کا پورا نقل کر لیا۔ ان کا تیار کردہ یہ دست نوشت قلمی نسخہ مرحوم کے بیٹوں کے پاس بطور ان کی یادگار کے محفوظ ہے، جس پر ۱۵/ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔

مرحوم لالہ ٔ صحرائی کو میں نے اپنے سکول کے زمانے سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کے افسانے، مضامین، ڈرامے اور ترجمے وغیرہ۔ ایک تو ''لالہ ٔ صحرائی'' کی ندرت ہی توجہ کو کھینچتی تھی، دوسرے ان کی تحریریں بڑے پختہ ادبی اسلوب کی حامل ہوتی تھیں۔ سکول سے کالج، پھر کالج سے یونیورسٹی پہنچا۔ اُس وقت تک ان سے میری شخصی ملاقات نہ تھی، نہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ ان کے حدود اربعے سے متعلق فقط یہ پتا چلا کہ جناب احمد ندیم قاسمی کے ہم جماعت یا ہم مکتب رہے اور ان کے دیرینہ دوست ہیں۔ ندیم قاسمی نے اپنے ایک افسانوی مجموعے کا انتساب با الفاظ ذیل لالہ ٔ صحرائی کے نام کیا ہے:

''چودھری محمد صادق کے نام جو مولانا مودودیؒ کے بڑے معتقد ہیں۔''

◆◆◆

حمد

ہے [illegible] معبودِ حاکمیں، تُو ہے
خالق و ربِّ عالمیں، تُو ہے

تُو سمیع و علیم و قادر ہے
جس جگہ ہو دُعا، وہیں تُو ہے

تیری تخلیق ساری موجودات
کیا ہی مخلوق آفریں تُو ہے

کب چھپیں گے مرے گنہ تجھ سے
جب کہ شہ رگ سے بھی قریں، تُو ہے

تُجھ پہ ایمان ہے مری دولت
میرا سرمایۂ یقیں تُو ہے

اوروں نے مجھ کو زیست سے بیزار کر دیا
تیری ثنا نے کیف سے سرشار کر دیا

موتی پروئے تُو نے تخیّل میں یا خدا
میرے قلم کو ابرِ گہر بار کر دیا

تُو نے جگایا شوق، کہ پاؤں تری رضا
یُوں میرے بختِ خفتہ کو بیدار کر دیا

برقِ گنہ نے میرا اُجاڑا تھا باغِ زیست
ابرِ کرم نے پھر گل و گلزار کر دیا

توبہ کے در پہ آیا تھا مَیں ایک بار ہی
وا تُو نے اس کو رحم سے سَو بار کر دیا

لالۂ صحرائی کی تصانیف

۱۔ لالہ زارِ نعت
۲۔ نور منارہ (مضامین)
۳۔ چمن میری امیدوں کا (خاکے)
۴۔ نُور پارے (قرآن مجید سے انتخاب)
۵۔ بارانِ نعت
۶۔ قلم سجدے (حمدیں)
۷۔ گلہائے حدیث (منظوم)
۸۔ قصیدۂ نعتیہ
۹۔ نعت ستارے
۱۰۔ نعت دھنک
۱۱۔ نعت سویرا
۱۲۔ نعت چراغاں
۱۳۔ نعت کہکشاں
۱۴۔ نعت چمن
۱۵۔ نعت شفق
۱۶۔ نعت ہلارے
۱۷۔ حرمت قلم
۱۸۔ نعت صدف
۱۹۔ نئے پھول، پُرانی خوشبُو (تفہیم القرآن سے اقتباسات)
۲۰۔ پھُولوں کے لیے پھُول (بچوں کے لیے نعتیں)
۲۱۔ غزواتِ رحمۃ اللعالمینؐ (منظوم) صدارتی ایوارڈ یافتہ

نعت

نعت کہنے کا مجھے کاش کہ فن آ جائے
میرے اعمال کی ظلمت میں کرن آ جائے

فقرِ احمدؐ کے سوا میں نہ کسی کو دیکھوں
خواہ کیسا ہی کوئی شاہِ زمن آ جائے

غالب آئے گی مدینے کی ہوا کی خوشبو
ہاتھ میں میرے اگر شاخِ سمن آجائے

روح لپٹی ہوئی رہ جاتی ہے، مقصورہ سے
جب مدینے سے کوئی اپنے وطن آجائے

آبلے پاؤں کے کردیں گے چراغاں سرِ راہ
سفرِ طیبہ میں گر رات کٹھن آ جائے

خیال دل میں یہی صبح و شام آیا ہے
سنوں حضورؐ سے ''میرا غلام آیا ہے''

صبا کی موجوں پہ یثرب کا نام آیا ہے
مئے حیات کا رقصندہ جام آیا ہے

نبی امیؐ کا گرچہ ملا لقب ان کو
کہا شعور نے علمِ تمام آیا ہے

رسُول اور تھے بس اپنے وقت ہی کے امام
مرے حضورؐ کے حق میں دوام آیا ہے

سپرد کردوں مَیں خود کو خدائے واحد کے
طفیلِ ہادیٔ عالمؐ پیام آیا ہے

اُجلا پاکستان...... پیارا پاکستان

مہر دین حق کی ضیا سے اجلا پاکستان
حبِ پیمبرؐ کی خوشبو سے مہکا پاکستان
ملتِ بیضا کی نظروں میں پیارا پاکستان
عظمتِ رفتۂ مسلم کا ہے جلوہ پاکستان

اس کا پرچم چاند ستاروں کی کرنوں سے تاباں
ہے اسلام کے حق میں یہ پیغامِ صبحِ خنداں
نکہتِ مسلم کے صحرا میں، ہے یہ ایک گلستاں
تشنہ لبانِ دینِ حق کا چشمہ پاکستان

رکھتا ہے یہ ساری ملت سے الفت کا رشتہ
اس کے باعث ہر سُو بجتا ہے اسلام کا ڈنکا
رب نے جب چاہا دنیا میں اپنے دین کا غلبہ
نقشۂ عالم کے سینے پر ابھرا پاکستان

لالہ صحرائی کے کلام سے انتخاب

0302-6515012 فون: 2511845

مختصر مگر مؤثر

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خوبصورت تحریر

اسلامی تہذیب و تمدن کو شدید نقصان پہنچانے کی ذمے دار

وراثت

سوچ کے بند دروازوں پر دھیمی دھیمی مدلل دستک۔ آپ بھی سنیے

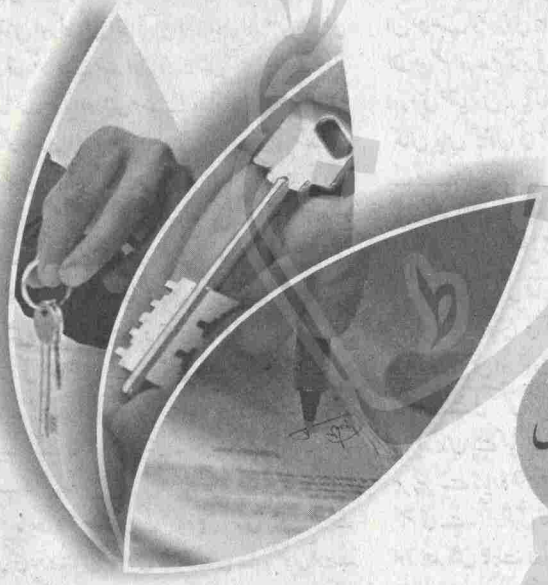

رواج کی آڑ سب سے بے اصل اور بودی آڑ ہے

ایک

مہلک مرض جو مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو گھن کی طرح کھا گیا اور کھائے جا رہا ہے ''وراثت'' کا مرض ہے۔ سب سے پہلے اس نے ہمارے نظامِ سیاست کو خراب کیا۔ اس کے بعد یہ گھانس تلے کے پانی کی طرح ہمارے نظمِ ملت کے ہر شعبے کی جڑوں میں پھیلتا چلا گیا اور ہماری قوت کے جتنے مرکز تھے، ان سب کو اس نے فاسد کردیا۔ اسلام میں تو نبی کا بیٹا بھی وراثت میں نبوت نہیں پاتا مگر یہاں وراثت کا قانون ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ عالم کا بیٹا عالم ہے، مرشد کا بیٹا مرشد، قاضی کا بیٹا قاضی، امام کا بیٹا امام اور سپہ سالار کا بیٹا سپہ سالار۔ ہر شخص جس نے اپنے فضل و کمال سے جماعت میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کیا، اس کی ایک باقاعدہ مسند بن گئی اور اس کے بعد اس کے

بیٹوں اور پوتوں کا اس مسند پر بیٹھنا لازمی ٹھہر گیا خواہ اس کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔

وراثت کے اس غلط اور جاہلانہ طریقے نے اتنا زور پکڑا کہ جوہرِ کمال بے قیمت ہوگیا اور اکثر و بیشتر دینی و اجتماعی خدمات جن کی بجا آوری پر تمام ملت کی اصلاح و فلاح کا انحصار ہے، محض نسبی استحقاق کی بنا پر نا قابل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علما کا اصلی کام علمِ حق کا پھیلانا تھا مگر جب علم کے خانوادے بن گئے تو علما حق کے بے علم جانشینوں نے جہالت کی تاریکی پھیلائی اور مسلمانوں کو گمراہ کردیا۔ مرشدوں کا اصلی منصب تزکیہ نفوس اور فضائل اخلاق کی اشاعت اور خلقِ اللہ کی ہدایت تھا، مگر جب مسند ارشاد ورثہ میں منتقل ہونے لگی تو ارشاد غائب ہوگیا اور اس مسند کے وارثوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ دست و پا کو بوسے دلوائیں، مریدوں، معتقدوں اور زائروں سے نذرانے وصول کریں اور استحواں فروشی سے جو مال حاصل ہو، اس کو فسق و فجور کی نذر کردیں۔

قضاۃ اس لیے تھے کہ شریعت کی حدود قائم کریں، مگر جب منصب قضا مال و جائیداد کی طرح باپ سے بیٹے کو ترکے میں ملنا شروع ہوا تو قاضیوں کا کام یہ ہوگیا کہ بزرگوں کی معاشوں سے دادِعیش دیں اور اقامتِ حدود کے لیے سعی کرنا تو درکنار، خود اپنے کرتوتوں سے شریعت کی ایک ایک حد کو توڑ ڈالیں۔ یہی انجام دوسرے اہم مناصب کا بھی ہوا۔

مساجد کو مسلمانوں کی آبادیوں میں جو مرکزیت حاصل تھی، وہ نالائق اماموں اور متولیوں کے ہاتھوں قریب قریب فنا ہوگئی۔ اوقاف اسلامی جو کبھی خیرات وحسنات کے منبع تھے، اسی منحوس وراثت کی بدولت تباہ ہوگئے۔ اسلام کا عسکری نظام جس کی ہیبت و جبروت سے روئے زمین کانپ اٹھتی تھی، اسی وجہ سے غارت ہوا کہ امارت و قیادت کے اہم مناصب خاندانوں کی میراث بن گئے۔ غرض اسلامی تہذیب وتمدن کو اس چیز سے جتنے شدید نقصانات پہنچے اور پہنچ رہے ہیں، ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

جدھر نظر کی جاتی ہے، دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے بڑے بڑے وسائل پر ایسے لوگ قابض پائے جاتے ہیں جو خود فساد کے سرچشمے اور مفاسد کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اس سدِ راہ کو پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔

آخری دور کے بادشاہوں اور امراء و حکام نے کچھ تساہل، کچھ ناعاقبت اندیشی اور کچھ بے جا فیاضی کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علما، مشائخ، قضاۃ، ائمہ اور دوسرے اہلِ مناصب کے لیے جاگیریں اور معاشیں مقرر کیں اور ان مناصب کو موروثی بنادیا۔ اس دور کے عام مسلمان بھی فقدانِ علم اور عدم تدبر کی وجہ سے اس غلطی میں مبتلا ہوتے اور اپنی عقیدتوں کو باکمال بزرگوں کے بعد ان کے بے کمال جاں نشینوں کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ اس کے بُرے نتائج کو انہوں نے نہ سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن آج وہ نتائج بے نقاب ہوکر سامنے آگئے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص شریعت یا رسم ورواج کی آڑ لے کر اس غلط قاعدے کی حمایت کرتا ہے تو اس کی عقل پر ہزار افسوس ہے۔ رواج کی آڑ تو مسلمان کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے اصل اور بودی آڑ ہے۔ کوئی غلطی محض اس بنا پر برقرار رہنے کی مستحق نہیں ہوسکتی کہ اس کا ارتکاب سو یا دو سو یا ہزار برس پہلے کیا گیا تھا۔ رہی شریعت تو اس کی نگاہ میں ہر چیز سے زیادہ اہم اقدام دین کی ترویج اور امت کی بہتری ہے۔ اگر شرعی قانون کے مطابق کوئی فعل کیا گیا ہو اور بعد میں ثابت ہوجائے کہ وہ فعل مصلحتِ دینی کے خلاف اور جماعت کے لیے مضر تھا تو اس فعل کے جاری رکھنے کے لیے یہ کوئی محکم دلیل نہیں کہ اصطلاحی حیثیت سے وہ فعل کے شرعی قانون کے مطابق کیا گیا تھا۔ خود شرعی قانون ہی اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے فعل کو مٹادیا جائے۔

اِس

وقت ہم زہر کے پیالے سے گھونٹ بھر رہے ہیں۔ بھارتی عدالتیں اور سیاستدان خونِ مسلم کے پیاسے ہیں اور ہم بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔ ہمارے صدر صاحب کسی منّت کے پورا ہونے پر اجمیر شریف میں ابدی نیند سونے والے ایک عظیم صوفی کی درگاہ پر فاتحہ خوانی کے بہانے چند روز قبل ہی بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ سے معانقہ و مصافحہ کرکے واپس پاکستان آئے ہیں۔ بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ سنگھ صاحب نے پاکستان کا دورہ کرنے کی ہامی بھرلی ہے۔ اس خوشی میں ہمارے عالی دماغ صدر صاحب خواجہ معین الدین چشتیؒ کے متولیوں میں ۱۰؍لاکھ ڈالر کا خطیر تحفہ بھی تقسیم کر آئے ہیں۔ یہ رقم پاکستان کے ۹؍کروڑ ۱۰؍لاکھ روپے بنتے ہیں۔ کاش یہ رقم پاکستان میں خط غربت سے نیچے ذلت کی زندگی گزارنے والے غریب عوام میں تقسیم کردی جاتی۔

جس روز صدر صاحب بھارت یاترا سے وطن واپس آئے۔ اُس سے اگلے روز بھارت کی ایک بڑی عدالت نے بھارتی مسلمانوں کے سب سے بڑے قاتل کو بے گناہ قرار دے کر اسے بھارتی متعصب ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر بنادیا۔ اس شخص کا نام نریندر مودی ہے۔ جو بھارتی ریاست گجرات کا وزیراعلیٰ بھی ہے۔ ہمیں اس شخص کے جرائم کو پھر سے یاد کرنے کی ضرورت ہے۔ ۲۷؍اور ۲۸؍فروری ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب، عین بارہ بج کر دس منٹ پر، مودی کے حکم اور سازش سے گودھرا آنے والی سابرمتی ایکسپریس کے اُس ڈبے کو نذرِ آتش کردیا گیا تھا جس کے سارے مسلمان مسافر جل کر خاکستر ہوگئے۔

مودی کے اشارے پر گودھرا میں ہونے والی واردات کے چند گھنٹوں کے اندر بھارتیہ جنتا پارٹی وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل ایسی مسلم دشمن ہندو جماعتوں نے گجراتی مسلمان آبادی پر اجتماعی ہلہ بول دیا۔ ۲؍ہزار سے زائد مسلمانوں کو تہ تیغ کردیا گیا۔ ڈیڑھ لاکھ مسلمان قتل سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ بچوں کی آنکھوں کے سامنے مسلمان والدین کو قتل کیا گیا۔

بھیڑیئے کے حق میں فیصلہ

راجو رام چدرن کمیشن نے ۲؍ہزار مسلمانوں کے قاتل نریندر مودی کے حق میں فیصلہ دے ڈالا

تنویر قیصر شاہد

"بھارتی مسلمان آنسوؤں کے دریا لیے خاموش ہیں"

ایک بھارتی انگریزی جریدے کے مطابق ۲۴۰ر درگاہوں اور ۱۸۰ر مساجد کو تباہ کر کے زمین کو ہموار کر دیا گیا۔ احمد آباد میں اُردو غزل کے بانی ولی دکنی کا مزار مسمار کر کے رات بھر میں اس کے اوپر ایک سڑک تعمیر کر دی گئی۔ موسیقار استاد فیاض علی خان کے مزار کی بے حرمتی کی گئی اور اُسے جلتے ٹائروں سے ڈھانپ دیا گیا۔ ایک ہندو ہجوم نے کانگریس کے رکن پارلیمنٹ اقبال احسان کے گھر کا محاصرہ کر لیا لیکن گھر کے نزدیک کھڑی پولیس نے کسی کو نہ روکا۔ پھر ہجوم مکان میں گھس آیا۔ انھوں نے اقبال احسان صاحب کی بیٹیوں کو برہنہ کر کے زندہ جلا دیا۔ پھر انھوں نے اقبال احسان کا سر کاٹ کر ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ انھیں یہ بھیانک سزا اس لیے دی گئی کہ انھوں نے الیکشن میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی مخالفت کی تھی۔

شہید اقبال احسان کی بیوہ محترمہ ذکیہ صاحبہ نے بھارتی سپریم کورٹ میں مودی سمیت ۵۷ر ملزموں، جنھیں بہت سے لوگ اس عظیم سانحہ کا واقعی مرکزی کردار سمجھتے ہیں، کے خلاف مقدمہ کر رکھا تھا۔ گزشتہ روز ۱۰ر برس بعد بھارتی عدالتِ عظمیٰ نے مودی سمیت سب قاتلوں کو باعزت بری کر دیا۔ سب شہادتیں جھوٹی قرار پائیں۔ ذکیہ صاحبہ نے ساڑھی کے پلّو سے ضعیف آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے محض اتنا کہا ''فیصلے سے دل کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔''

سیکڑوں بھارتی مسلمانوں کا قاتل اور گجرات کا وزیراعلیٰ نریندر مودی سوانگ رچانے میں یدطولیٰ رکھتا ہے۔ اُس کے حکم اور سازش سے ۲۰۰۲ء میں گجراتی مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کو جس وحشت سے پامال کیا گیا، مودی نے اس سانحہ کے تقریباً ۹ر سال بعد ایک نیا کھڑاگ کیا۔ محض مسلمانوں کو دھوکا دینے اور یہ سمجھ کر کہ گجراتی مسلمانوں کے دلوں سے اس وحشی کے لیے غصہ جاتا رہے، اُس نے ۳ر دن کے لیے برت (روزہ) رکھنے کا اعلان کیا تاکہ ریاست گجرات میں ''امن اور یک جہتی'' کو ''فروغ'' دیا جاسکے۔ اس موقع پر اس نے ریاستی عوام کے نام ایک خط بھی لکھا جس کے ایک ایک لفظ سے منافقت اور دوغلا پن ٹپکتا ہے۔ اسی موقع پر بھارتی میڈیا وہ خط بھی سامنے لے آیا جسے سابق وزیراعظم نے یکم جون ۲۰۰۲ء کو، جبکہ گودھرا سانحہ کو گزرے ۳ر مہینے ہوئے تھے، نریندر مودی کے نام لکھا تھا۔ اٹل بہاری واجپائی، جس کے اپنے ہاتھ بھی بھارتی مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، نے اپنے خط میں نریندر مودی پر سخت تنقید اور لعنت ملامت کی تھی اور بین السطور اُسے گودھرا سانحہ کا مرکزی ملزم قرار دیا تھا۔ واجپائی کے اس خط سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت نے سانحہ گودھرا کا ایندھن بننے والے مسلمانوں کے وارثوں کو تالیف قلب کے لیے جو رقوم ارسال کی تھیں، ان کا بیشتر حصہ بھی نریندر مودی اور اس کے ساتھی ہڑپ کر گئے۔ سابق بھارتی وزیراعظم کے خط

چند گھنٹوں کے اندر ۲ر ہزار سے زائد گجراتی مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا

بنام مودی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گجرات کا یہ وزیراعلیٰ کس غلیظ اور گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔

اس قماش کا بھارتی سیاستدان یہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرنے والی ہندو جماعت کے پلیٹ فارم سے جلد ہی بھارت کا وزیراعظم بن جائے گا۔ مودی نے گزشتہ برس ستمبر میں جب ۳ر روزہ برت رکھنے کا اعلان کیا تو بھارتی اخبارات میں، بذریعہ ای میل، لوگوں کے جو بیانات شائع ہوئے، وہ پڑھ کر سمجھ آتی ہے کہ یہ شخص کس قدر قابلِ نفرین ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایسے ہندو بھی ہیں جو نریندر مودی کو ہیرو سمجھتے ہیں۔ میں نے ایسی میلز کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے درجنوں پرنٹ آؤٹ بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اپنے قارئین کرام کو بھی ان میں شریک کروں۔ میلز کچھ یوں ہیں ''۱۰ر سال قبل تم نے جس طرح سیکڑوں مسلمانوں کا بربریت اور وحشت سے قتل کیا، آج مسلمانوں کی قبروں پر کھڑے ہو کر تمھارا آنسو بہانا محض مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ مودی! تم ایسے ظالم شخص ہو جس نے درجنوں مساجد اور درگاہیں شہید کرائیں لیکن تمھیں شرم آئی نہ رحم آیا..... اگر مودی کبھی بھارتی وزیراعظم بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا نام ہٹلر اور چنگیز خان جیسے نسل کش حکمرانوں کے ساتھ لکھا جائے گا..... مودی کا سہ روزہ برت محض دھوکے بازی ہے..... مودی ایک قاتل ہے..... اس کے برت رکھتے ہوئے ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اُس نے ۲۰۰۲ء میں کتنے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا۔ اُسے اس اور اُس دنیا میں عذابِ الیم سے گزرنا ہوگا..... خدا نہ کرے مودی کبھی وزیراعظم ہند بن سکے۔ یہ تو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے..... مودی کی شکل میں ہٹلر نے ایک بار پھر جنم لیا ہے۔ یہ شخص موت کا تاجر ہے..... مودی فاشسٹ ہے۔ اس جنونی کو بھارت میں زراعت کی پروا نہیں ہے کیونکہ مودی کا مشغلہ انسانی گوشت کھانا اور انسانی خون پینا ہے۔''

فسطائیت کا نقش بھارت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ مودی نے بھارتی مسلمانوں کے ساتھ جو بھیانک کھیل کھیلا، اس پر نفرین ہو۔ بہت سے دیانت دار عالمی اخبار نویسوں نے گجراتی مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی نقشہ کشی کی کوشش کی لیکن اس سلسلے میں جس جرأت اور کمال سے بھارتی دانشور اُرن دھتی رائے نے بھارتی جریدے (Outlook، شمارہ ۶ مئی ۲۰۰۲ء) میں اپنے خون میں انگلیاں ڈبو کر آرٹیکل لکھا، یہ لاجواب تسلیم کیا جاتا ہے۔ ''آج'' کے ۳۶ر ویں شمارے میں جناب اجمل کمال نے اس کا ترجمہ بھی باکمال کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب سب لوگ جانتے تھے کہ وزیراعلیٰ مودی اس غارت گری کا ذمے دار ہے تو اسے گرفتار کیوں نہ کیا جاسکا؟ اس کا جواب اُرن دھتی رائے ان الفاظ میں دیتی ہیں ''بھارت میں کوئی شخص سیاستدانوں پر مقدمہ چلانے کی توقع نہیں کرتا۔ یہ مطالبہ کرنا کہ نریندر مودی کو گرفتار کر کے قید میں ڈالا جائے خود دوسرے سیاستدانوں کو ان کے گھناؤنے ماضی کی وجہ سے خطرے میں ڈال سکتا ہے؛ چنانچہ گرفتاری کے بجائے وہ پارلیمنٹ کی کارروائی میں رخنہ اندازی کرتے ہیں، زور زور سے چلاتے ہیں۔ آخرکار جو اقتدار پر فائز ہیں، وہ تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیتے ہیں۔'' بھارتی سپریم کورٹ کے بنائے گئے ایسے ہی ایک کمیشن، جس کے سربراہ راجو رام چندرن تھے، نے بھارتی خونخوار بھیڑیے نریندر مودی کو ۱۰ر اپریل ۲۰۱۲ء کو باعزت بری کر دیا۔ بھارتی مسلمان آنسوؤں کے دریا تھامے خاموش ہیں۔ اور پاکستان کے سیاستدان اور کاروباری گروہ بھارتی ہندوؤں سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ (بشکریہ ایکسپریس)

اقبال حسان کی بیوہ نے کہا

فیصلے سے دِل کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا

شاعر کی آپ بیتی

من کہ ایک شاعر

ایک شاعر کی اُمنگوں، آرزوؤں اور شعروں بھری آپ بیتی

وہ نہیں جانتا تھا کہ مشاعرے میں جب اُس کا نام پکارا جاتا ہے تو لوگ بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں

محمد مقبول حسین خان کانجو

صاحب میں ایک شاعر ہوں۔ چھپا ہوا دیوان تو خیر کوئی نہیں ہے مگر کلام خدا کے فضل سے اتنا موجود ہے کہ اگر میں مرتب کرنے بیٹھوں تو ایک چھوڑ چار پانچ دیوان تو مرتب کر ہی سکتا ہوں۔ اپنی شاعری کے متعلق اب میں خود کیا عرض کروں البتہ مشاعروں میں جانے والے حضرات اگر کسی مشاعرے میں میرا کلام سن چکے ہیں تو وہ بتائیں گے کہ میرے متعلق عام رائے کیا ہے۔ البتہ اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ جب مشاعرے میں میرے نام کا اعلان ہوتا ہے، سامعین بے قابو ہو کر اس وقت تک تالیاں بجاتے ہیں جب تک کہ میں پڑھنے کے لیے اسٹیج پر آنہ جاؤں اور جب تک میں پڑھتا رہتا ہوں داد کے شور سے مشاعرہ گونجتا ہی رہتا ہے۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرا ایک شعر آٹھ مرتبہ مجھ سے پڑھوایا گیا تھا اور پھر بھی سامعین نے یہی کہا تھا کہ سیری نہیں ہوئی۔ یہ سب کچھ میں خودستائی کے طور پر عرض نہیں کر رہا ہوں۔ میرا قول تو یہ ہے کہ ''من آنم کہ من دانم''۔ میں تو یہ سب کچھ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ مجھے اپنے متعلق تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ میں ان شاعروں میں سے نہیں ہوں جو محض ایک تخلص پال کر بیٹھ رہتے ہیں اور زندگی بھر میں بس ایک آدھ غزل کہنے کے گنہگار ہوتے ہیں۔ حضت! یہاں تو بقول شخصے ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ابھی ہوش سنبھالا ہی تھا کہ گھر میں شعروشاعری کے چرچے سُنے۔ مشاعروں کے کھیل کھیلے اور آخر پندرہ برس کی عمر ہوگی کہ پہلی غزل اس شان سے مشاعرے میں پڑھی کہ گھر پر بڑی بوڑھیوں نے نظر اُتاری اور باہر اس فن کے بڑے بڑے مشاقوں نے اعتراف کیا کہ صاحبزادے نے پالنے ہی میں پاؤں دکھائے ہیں۔ مطلب یہ کہ شاعری کی ابتدا اسی عمر میں ہوئی جس کے متعلق شاعر کہہ گیا ہے کہ ؎

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں امنگوں کے دن

داد جو ملی تو حوصلے اور بڑھ گئے۔ اب دن رات بس ایک ہی مشغلہ ہے، غزل گوئی اور غزل سرائی۔ جس مشاعرے میں پہنچ گئے جھنڈے گاڑ آئے۔ اپنے سامنے کسی کا چراغ نہ جلنے دیا۔ جس طرح میں غزل کہہ دی اس کو اپنا لیا اور خاص شہرت حاصل کی گرہ لگانے میں، قصہ کوتاہ کچھ ہی دنوں میں مقامی مشاعروں کے علاوہ دُور دُور سے بلاوے آنے لگے۔

آج یہاں مشاعرہ ہے تو کل وہاں، آج اس شہر میں ہے تو کل اُس شہر میں۔ یہ سچ ہے کہ اس طرح تعلیم ضرور ناقص رہ گئی مگر شاعر ہونا مسلّم ہوگیا۔ آواز میں قیامت کا سوز تھا اور دُھن بنانے کا سلیقہ خداداد تھا۔ پھر کلام کی لطافتیں، مختصر یہ کہ سب کچھ مل جل کر مشاعرہ لوٹنے میں مدد دیتا تھا۔ ایک نمائش کے مشاعرے میں تو تمغہ تک دیا گیا تھا۔ اخباروں میں تصویریں چھاپی گئیں۔ رسالوں کے ایڈیٹروں نے بڑی منت کے خطوط لکھے کہ میں اپنا تازہ کلام بھیجوں۔ بے شمار رسالے اور اخبار مفت آنے لگے اور ان میں میرا کلام بڑے امتیاز کے ساتھ چھپنے لگا۔ بڑے بڑے سالانہ نمبروں میں صرف میری غزل کو جلی حروف میں اور خوشنما حاشیہ کے اندر ایک پورے صفحے پر چھاپا گیا۔ مختصر یہ کہ آپ کی دعا سے شہرت اور مقبولیت کی کوئی کمی نہ رہی۔ یہاں تک کہ کچھ ہی دنوں کے بعد مشق اس قدر بڑھ گئی اور کلام میں کچھ خدا کے فضل سے ایسی پختگی پیدا ہوگئی کہ بہت سے نوجوان اپنی اپنی غزلیں اصلاح کے لیے لانے لگے اور اب ضرورت اس کی پیش آئی کہ ذرا اس فن کا مطالعہ بھی کر لیا جائے کہ یہ فاعلاتن فاعلات آخر کیا بلا ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پیدائشی اور فطری شاعروں کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ مگر شاگردوں کو سمجھانے اور استاد بننے کے لیے معلومات کا حاصل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں جتنی کتابیں دیکھیں اتنی ہی طبیعت اُلجھی کہ یہ ہیں کیا خرافات؟ آخر کتابوں کا ایک سیٹ مل گیا۔ شاعری کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب۔ ان کتابوں کو سلسلہ وار پڑھنے سے خود تو خیر کچھ سمجھ میں نہ آیا، مگر دوسروں کو سمجھانے کے لیے مواد ضرور مل گیا اور اب شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان شاگردوں کا مشاعروں میں چمکنا تھا کہ شاگردوں کی تعداد دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ یہاں تک کہ عام ہوگیا کہ ہر مشاعرے کے دن درجنوں شاگرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور میں ان کو غزلیں لکھوا رہا ہوں کہ یہ مطلع تم لکھ لو اور یہ شعر تم لکھ لو۔ شاگردوں سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ خود اپنے کو اول تو اساتذہ کی صف

میں جگہ ملتی ہے۔ دوسرے استاد کی غزل پر یہ شاگرد واہ وا کا وہ شور مچاتے ہیں کہ مشاعرہ ہی سر پر اٹھا لیتے ہیں اور اگر کبھی کوئی بدخواہ اعتراض کر بیٹھے تو یہی شاگرد مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گویا استاد کی اچھی خاصی طاقت ہوتے ہیں یہ شاگرد۔

گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وثیقہ بندھا ہوا تھا اور باپ دادا بھی اتنا چھوڑ گئے تھے کہ چار کو کھلا کر کھا سکیں۔ لہٰذا فکرِ معاش کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ لے دے کے بس فکرِ سخن ہی تھی۔ شاگردوں کو بھی کبھی کسی خدمت کا موقع نہ دیا بلکہ ان ہی کی خدمت جو ہو سکی، وہ کی۔ یعنی مفت کی غزلوں کے علاوہ اکثر کو مفت کی روٹیاں بھی مل جاتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی شاگرد رساول، مکھن، خالص دودھ، دیسی گھی یا اپنے گاؤں سے گڑ وغیرہ

اکثر شاگردوں کو میرے ہاں سے مفت کی غزلوں کے علاوہ مفت کی روٹیاں بھی مل جاتی تھیں

بھی لے آیا تو یہی فکر رہتی تھی کہ اس کا بدلہ کیونکر اُتارا جائے۔ ایک مرتبہ ایک تنومند شاگرد نے سرسوں کے تیل کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے مشاعرے میں نہ صرف نہایت زوردار غزل کہہ کر ان کو دی بلکہ ان کا ریل کا ٹکٹ بھی خود ہی خرید ا۔ غرض کہ شاعری کو تجارت یا روزگار کی صورت تو کبھی دی ہی نہیں اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کبھی۔ ان ہی حالات میں زندگی بڑے مزے میں بسر ہو رہی تھی کہ ایک دم سے وہ انقلاب آ گیا جس نے دنیا ہی زیروزبر کر کے رکھ دی۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس طرف آجانا پڑا، گھر گیا، گرہستی گئی، وثیقہ گیا، مختصراً کہ آپ ''واحد حاضر'' رہ گئے اور باقی سب کچھ ''جمع غائب'' اور تو اور کھانے پینے کے لالے پڑ گئے۔ دو روٹیوں کا سہارا تک کوئی نہ رہا۔ دل میں کہا، جان ہے تو جہان ہے۔

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مگر آخر کب تک نہ گھبراتے، پردیس میں کوئی جان نہ پہچان۔ ایک نفسانفسی کا عالم، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ آخرکار خاندانی وضع کے خلاف روزگار کی تلاش میں نکل پڑا۔ یاد آیا کہ اسی شہر سے ایک رسالہ نہایت آب و تاب سے نکلا کرتا تھا جس کے ایک سالنامہ میں انگور کی خوشہ نیل کے حاشیہ کے اندر اپنی ایک غزل چھپی تھی اور ایڈیٹر صاحب نے اس پر اپنا ایک نوٹ بھی دیا تھا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ لسان الزمن حضرت محبوب سبحانی نے اپنے تازہ رشحات سے ہمارے سالنامہ کو نوازا ہے، امید ہے کہ حضرت محبوب سبحانی آیندہ بھی ہم کو اس فخر کا موقع عطا فرماتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی رسالے کے دفتر کا رُخ کیا اور پوچھتے پوچھتے آخر اس رسالے کے دفتر پہنچ ہی گئے۔ ایڈیٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور وہ حسبِ توقع دوڑے اور چائے کا کپ اور کیک لے کر آئے۔ سگریٹ کی ڈبیا کھول کر رکھ دی۔ دیا سلائی خود جلائی اور دیر تک ہماری ہجرت پر مسرت کا اظہار کرتے رہے کہ صاحب بہت اچھا ہوا جو آپ تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد موقع دیکھ کر اور ان کو بے حد خلیق پا کر عرض کیا ''بھائی جان! آتو گیا ہوں مگر واضح رہے کہ سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں اور خاندانی وضع کے خلاف اس پر آمادہ ہوں کہ کہیں ملازمت اختیار کروں۔ وہ نہایت اطمینان سے بولے، ملازمت؟ بہرحال اب تو آپ آئے ہیں، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ آپ کے ایسے قابل آدمیوں کے لیے ملازمت کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ بہرحال آپ نے یہ تو فیصلہ کر ہی لیا ہوگا کہ آپ کس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا پسند کریں گے۔ عرض کیا، بھائی اپنا شعبہ تو ظاہر ہے کہ زندگی بھر سوائے ادبی خدمت کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب تک ادبی خدمت کو ذریعۂ آمدنی بنانے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ مگر اب حالات نے مجبور کر دیا ہے۔

تعلیم ضرور ناقص اور نامکمل رہ گئی ہاں شاعر ہونا مسلّم ہو گیا

وہ بولے، یہ تو درست ہے۔ مگر ادبی سلسلے میں ملازمت کا کیا سوال ہو سکتا ہے؟ آپ کے خیال میں کون سا محکمہ ایسا ہے جو آپ کے ایسے ادیبوں کے لیے جگہ نکال سکے گا؟ کم سے کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں رہا۔

عرض کیا، آپ محکموں پر نظر نہ ڈالیے۔ میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ مثلاً آپ کا ادارہ ہے۔ اسی میں کوئی خدمت میرے سپرد کر دی جائے۔

ایڈیٹر صاحب نے دم بخود رہ جانے کے بعد فرمایا، قبلہ اصل میں بات یہ ہے کہ ضرورت تو مجھ کو بھی ہے اپنے یہاں چند لوگوں کی۔ مگر معاف کیجیے گا میں نے آج تک سوائے غزلوں کے اور کوئی چیز آپ کی نہیں دیکھی ہے۔

عرض کیا، اور کیا چیز آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ شجرہ موجود ہے، وہ میں دکھا سکتا ہوں۔ خود مجھ کو آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور کوئی چیز سے مطلب کیا ہے؟ جناب ذرا وضاحت فرمائیں تو کچھ عرض کروں۔

وہ بولے، میرا مطلب یہ ہے کہ نثر غالباً آپ نے کبھی نہیں لکھی۔ نہ آپ کا کبھی کوئی افسانہ پڑھا ہے نہ کوئی تنقیدی مضمون دیکھا ہے۔ نہ کوئی تخلیقی مقالہ۔ عرض کیا، جناب والا، یہ آپ نے درست فرمایا اور یہ واقعہ بھی ہے، اب تک اس قسم کی کوئی چیز لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔

ان کو بہانہ مل گیا، آنکھیں گھما کر بولے، اب آپ خود غور فرمائیے کہ کسی ادبی رسالے کے ادارہ تحریر میں آپ کو کیونکر شامل کیا جا سکتا ہے؟ آپ کی شاعرانہ صلاحیت مسلم ہے مگر اس کی ہم کو ضرورت نہیں۔

ایسے کور ذوق سے کچھ اور کہنا ہی بے کار تھا۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کر کے چلے آئے اور طے کر لیا کہ اب اِدھر کا رُخ بھی نہ کریں گے۔ مگر ادھر کا نہ سہی کسی اور طرف کا تو رُخ کرنا ہی تھا ورنہ یہاں تو فاقوں کی نوبت بھی دور نہ تھی۔ کافی دماغ سوزی کے بعد ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ اگر کوئی کتب فروش دیوان چھاپنے پر تیار ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کچھ نہ کچھ حقِ تصنیف بھی مل جائے گا۔ دوسرے اس پردیس میں اپنے تعارف کا ایک ذریعہ اس دیوان کی صورت میں نکل آئے گا۔ بالکل الہامی طور پر دیوان کا نام ذہن پر نازل ہوا۔ ''لیلائے سخن''، محبوب سبحانی کی مناسبت سے اس سے بہتر نام اور کیا ہو سکتا تھا۔ دوسرے ہی دن یہاں کے ایک آدھ پبلشر سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے، شہر کے سب سے بڑے پبلشر کا نام اور پتا پہلے ہی پوچھ رکھا تھا اور ان کی دکان پر پہنچ کر ان سے شرفِ نیاز حاصل کیا اور آخر اپنا تعارف خود کرایا:

جناب نام سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ اس خاکسار کو محبوب سبحانی کہتے ہیں۔ وہ حضرت بھی عجیب چیز نکلے، کہنے لگے، پھر؟

غصہ تو بہت آیا اس ''پھر'' پر مگر کیا کرتے وقت آپڑا تھا۔ لہٰذا اپنے آپ کو سنبھال کر کہا، میں نے آپ کے یہاں کی مطبوعہ اکثر کتابیں دیکھی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طباعت کا جو سلیقہ آپ کو حاصل ہے وہ کسی اور پبلشر کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اپنا دیوان اگر کسی کو دے سکتا ہوں تو وہ صرف آپ کو۔ کیا نام ہے اس کتاب کا جو ابھی آپ نے شائع کی ہے؟ وہ ڈکار لیتے ہوئے بولے ''کلیدِ مرغی خانہ''۔

عرض کیا، جی ہاں کلیدِ مرغی خانہ، کیا کہنا ہے اس کتاب کا۔ کتابت ہے تو سبحان اللہ طباعت ہے تو ماشاء اللہ۔ پھر ترتیب و سجاوٹ، دلہن بنا کر رکھ دیا ہے آپ نے کتاب کو! میں نے اپنے دیوان کا نام تجویز کیا ہے لیلائے سخن۔ جس کا

تخلص محبوب سبحانی ہو، اس کے دیوان کا کتنا مناسب نام ہے یہ۔

انھوں نے براہ راست سوال کیا، تو آپ چھپوانا چاہتے ہیں اپنا دیوان؟ عرض کیا، جی ہاں۔ ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ میں نے اپنے چار دواوین میں سے انتخاب کرکے ایک دیوان مرتب کیا ہے۔ گویا اپنی کائنات شعری کا جوہر نچوڑ لیا ہے اور یہ طے ہوا کہ چھپواؤں گا آپ ہی کے ذریعے۔

انھوں نے کہا، اچھا تو ہم چھاپ دیں گے۔ بہتر سے بہتر لکھائی چھپائی ہوگی۔ کاغذ وہی ہوگا جو کلید مرغی خانہ کا ہے۔ ہم آپ کو ابھی حساب لگا کر بتائے دیتے ہیں کہ آپ کو کیا خرچ کرنا پڑے گا۔

ہم نے چونک کر کہا، ہم کو کیا خرچ کرنا پڑے گا؟ غالباً آپ میرا مطلب نہیں سمجھے! وہ ہم سے زیادہ متحیر ہو کر بولے، تو کیا مطلب ہے آپ کا؟ صاف صاف عرض کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ لے لیجیے دیوان اور چھاپیے۔ حقِ تصنیف طے ہوجائے گا۔ جو مناسب سمجھیں دے دیجیے۔

انھوں نے ایک ایسا قہقہہ لگایا، گویا یہ کوئی بہت دلچسپ لطیفہ سُنا تھا۔ پھر عجیب تمسخر سے بولے، ”آپ گویا یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا دیوان آپ سے خرید کر خود بیچنے کے لیے چھاپیں۔ آج کل بھلا کون کسی کا دیوان چھاپتا ہے؟ کس کے پیسے فالتو ہیں کہ وہ دیمک کی ضیافت کے لیے دیوان چھاپ کر اپنے یہاں ڈھیر کرے؟ پیسہ بھی ضائع کرے، وقت بھی برباد کرے، محنت بھی خواہ مخواہ کی اور جگہ بھی گھیری جائے۔“

ہم نے ایک دو شعرا کے کلام کے مجموعوں کا حوالہ دیا جو حال ہی میں شائع ہوئے تھے اور عرض کیا، آخر یہ مجموعے اور یہ دیوان بھی تو چھپے ہیں۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے، اوہو۔ آپ سمجھے نہیں۔ جن شاعروں کا آپ نے نام لیا ہے ان کی تو اس وقت مانگ ہے۔ ان کے مجموعے تو اگر اس وقت ہم کو بھی مل جائیں تو ہم بھی سب کچھ چھوڑ کر چھاپ دیں۔ مگر یہاں ذکر ہے آپ.....

اب تو قابو میں رہنا مشکل تھا، ذرا تلخی سے عرض کیا، کیا مطلب آپ کا؟ اگر آپ میرے نام سے واقف نہیں ہیں اور میرے شاعرانہ مرتبہ کو نہیں جانتے تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں، یہ آپ ہی کی کوتاہی ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک خاص مقام رکھتا ہوں اس دور کے شعرا میں۔

وہ صاحب عجیب بے ہودگی سے بولے، اجی یہ تو سب ہی شاعر کہتے ہیں۔ خیر اس سے کیا مطلب، ہم معافی چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا دیوان نہیں چھاپ سکتے۔

ہم نے اُٹھتے ہوئے کہا، کلام تو خیر میں خود آپ کو چھاپنے کے لیے اب نہیں دے سکتا۔ مگر کتابوں کی تجارت کرنے آپ بیٹھے ہیں تو ذرا اہلِ علم سے بات کرنے کا سلیقہ بھی پیدا کیجیے۔ وہ حضرت پہلو بدل کر بولے، اہلِ علم میں سے جب کوئی آتا ہے تو ہماری گفتگو بھی دوسری قسم کی ہوتی ہے۔

ہم نے اس بدتمیزی کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ دل ہی دل میں کھولتے ہوئے اس دکان سے باہر آگئے۔ مگر ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ چودھری صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ یہ چودھری صاحب بڑے اثر و رسوخ کے لوگوں میں سے ہیں اور میرے کلام کے بڑے دلدادہ ہیں بلکہ نمائش کے مشاعرے میں یہی صدر تھے اور ان ہی کی طرف سے میرے لیے تمغے کا اعلان ہوا تھا۔ ہمیشہ جھوم جھوم کر میری غزلیں سُنا کرتے تھے اور اچھل اچھل کر داد دیا کرتے تھے۔ آج بھی دُور ہی سے دیکھ کر پہچان گئے اور ایک نعرہ بلند کیا:

اخاہ محبوب سبحانی صاحب! ارے بھئی آپ کہاں! بھئی خوب ملاقات ہوئی، کب آئے۔

عرض کیا، آئے ہوئے تو دو ماہ سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ حیرت سے بولے، دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں اور کہیں نظر بھی نہ آئے۔ میں تو اکثر مشاعروں میں گیا مگر آپ کو نہ دیکھا۔ عرض کیا، جناب والا اب شعر کی فکر سے زیادہ پیٹ کی فکر ہے۔ وہ فارغ البالی کے زمانے گئے۔

اب تو سب سے مقدم ہے روزی کا ملنا۔ مگر اب آپ مل گئے ہیں تو سب ہی کچھ ہو جائے گا۔

اور یہ کہہ کر اپنی تمام داستان ان کو سُنا دی کہ کس بے سروسامانی کی حالت میں یہاں تک پہنچے ہیں اور اگر جلد ہی ملازمت کا کوئی سلسلہ نہ ہوا تو کیا وقت آنے والا ہے ہم پر۔ بڑی ہمدردی اور غور سے تمام حالات سنتے رہے اور سب کچھ سننے کے بعد فرمایا، ارے بھئی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ملازمت آپ کو نہیں تو اور کس کو ملے گی، میں ذمہ لیتا ہوں اس بات کا۔

مُنہ مانگی مراد مل گئی۔ جی چاہا کہ اس شریف انسان کے قدموں پر گر کر جان دے دیں۔ مگر وفورِ جذبات میں قدموں کے بجائے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے عرض کیا، میرا دل خود گواہی دے رہا ہے کہ آپ مل گئے ہیں تو اب میری مشکلات کا خاتمہ ہی سمجھنا چاہیے۔

کہنے لگے، خیر یہ تو آپ کی بندہ نوازی ہے۔ اچھا قبلہ یہ فرمائیے کہ انگریزی کی تعلیم کہاں تک ہے؟ ایسے ذہین آدمی سے اس مہمل سوال کی اُمید تو نہ ہو سکتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان حضرت نے ہمارا انگریزی نہیں بلکہ اُردو کا کلام سُنا تھا۔ انگریزی میں بات کرتے کبھی نہ سُنا ہوگا۔ البتہ کبھی کبھی سوٹ پہنے ضرور دیکھا ہوگا اور ممکن ہے کہ یہ غلط فہمی اسی وجہ سے پیدا ہوگئی ہو۔ لہٰذا ہم نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے عرض کیا:

بھائی جان! انگریزی سے کیا واسطہ؟ آپ تو جانتے ہوں گے کہ زندگی گزری ہے اُردو کی خدمت میں۔ وہ بولے، تب کم سے کم ایم اے تو آپ ہوں گے۔ عرض کیا، اجی پڑھائی میں کیا رکھا ہے؟ بچپن ہی سے اس شاعری کا ایسا شوق ہوا کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ چھاڑ بس اسی کے ہو رہے۔

ہمارا جواب سن کر وہ کچھ بجھ سے گئے، تو گویا انگریزی آپ جانتے ہی نہیں۔ یہ تو بڑی مشکل پیدا کردی آپ نے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کو کوئی باقاعدہ ملازمت تو مل ہی نہیں سکتی مگر خیر آپ یہ کیجیے کہ فی الحال تو میری ایک چھوٹی سی دکان ہے، اس کے حساب کتاب کی نگرانی فرمائیے بیٹھ کر۔ اس عرصہ میں اگر کوئی بہتر جگہ مل گئی تو چلے جائیے گا

ایک صاحبزادے بھی ہماری شاگردی کرنے آئے۔ پوچھ رہے تھے کہ وہ ہمیں اُستاد کہیں گے تو ہم ان کو اس کسرِ نفسی کا کیا معاوضہ دیں گے

ورنہ میں ہی کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہوں گا۔

خدا کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ اس نے کوئی نہ کوئی سبیل بہرصورت پیدا کر ہی دی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ وہ بھوکا اُٹھاتا ہے مگر بھوکا سُلاتا نہیں ہے۔ لیجیے اب ہم ایک بارونق بازار میں موزے، بنیان، رومال، تولیے، شیمپو، کنگھا، آئینہ وغیرہ بیچنے ایک دکان پر بیٹھ گئے۔ صبح نو بجے جا کر دکان کھولنا، جھاڑو دینا، دن بھر گاہکوں کا خیر مقدم کرنا اور مال بیچنا اور رات کو دس بجے دکان بند کر دینا۔ ایک کام تو یہ تھا اور دوسرا کام یہ کہ دن بھر کی بکری رجسٹر پر لکھ کر شام کو میزان نکال لیا کرتے تھے۔ مگر یہ دوسرا کام اس قدر نامعقول ثابت ہوا کہ کبھی کبھی تو زندگی سے عاجز آجاتے تھے۔ کبھی کیش بکس میں ہیں ۲۳۶۲ روپے اور کھاتہ میں میزان کل ہے ۲۳۳۰ روپے۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون صاحب بتیس روپے چپکے سے کیش بکس میں ڈال گئے ہیں۔ دکان کے دوسرے ملازم سے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی تم ہی کچھ یاد کرو۔ آخر وہ اسی رائے پر اڑ جاتا کہ جب آپ اپنے دوست کو غزل سُنا رہے تھے، اس وقت جتنے گاہک آئے، سب سے دام لے کر کیش بکس میں تو آپ نے ڈال دیے مگر کھاتے پر چڑھائے نہیں۔ لیجیے اب کھاتے

0302-6515012 موبائل: 2511845 فون:

کے فرضی اندراج ہو رہے ہیں۔ مگر جس دن یہ ہوتا کہ کیش بکس میں سے نکلے ۴۵۱۴ روپے اور کھاتہ دکھا رہا ہے ۴۵۵۴ روپے، اس روز تو ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ کر جاتے کہ اب یہ چالیس روپے کی کمی کہاں سے پوری ہو۔ دکان کے دوسرے ملازم نے یاد کرتے ہوئے کہا، میں سمجھ گیا محبوب صاحب! ۴۰ر روپے کا چائے کا ڈبا بیچا تھا اور چائے کا ڈبا لے کر وہ صاحب بیٹھ گئے تھے آپ کی غزل سننے دوسرے کے ساتھ بڑی دیر تک واہ واہ کرتے رہے اور پھر ایک دم سے غائب ہوگئے۔ دیکھیے چائے کے ڈبے کے دام لکھے ہیں؟

کھاتے میں چائے کے ڈبے کے دام ۴۰ر روپے موجود اور اب ہم کو بھی یاد آگیا کہ ہم نے دام لکھ تو لیے تھے مگر وہ بیٹھ گئے تھے کلام سننے اور بڑے سخن فہم معلوم ہو رہے تھے۔ لہٰذا یہی خیال تھا کہ جاتے وقت دے دیں گے دام مگر وہ چپکے سے نکل گئے۔ بمشکل تمام دوسرے ملازم سے مل ملا کر اور اس کو بھی اسی قسم کا ایک موقع دینے کا وعدہ کر کے کھاتے کے اس اندراج کو مٹایا گیا اور جان بچی۔ کان پکڑ کر توبہ کی کہ آیندہ دکان پر شعر و شاعری کا شغل ہرگز نہ ہوگا اور سوائے دکانداری کے دکان پر بیٹھ کر اور کچھ نہ کریں گے۔ مگر جس نے بھی کہا ہے سچ کہا ہے کہ ؎

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

ایک دِن کیا دیکھتے ہیں کہ ساقی، پیارا، کیف، طور، نور، حیف سب کے سب ٹولی بنائے ہوئے چلے آرہے ہیں اور ایک دم سے آکر حملہ آور ہوگئے۔ اب کیسے نہ بٹھاتے ان کو اور جب بیٹھ کر ان سے یہ معلوم ہوا کہ مشاعرے سے اُٹھ کر وہ لوگ آرہے ہیں تو کیسے نہ اُن سے فرمایش ہو مشاعرے کی غزلیں سنانے کی؟ اور جب وہ غزلیں سُنا دیں تو کہاں کا ہے یہ اخلاق کہ خود اپنی اسی طرح کی غزل نہ سُنائی جائے ان کو۔ بس اتنی سی بات سے مشاعرے کی سی کیفیت پیدا ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ راہ گیر بھی اکثر سخن فہم ہوتے ہیں۔ اگر وہ کلام سننے کو ٹھہر جائیں تو

ADMISSION NOTICE
INDUSTRY ORIENTED, MOST DEMANDING HIGHLY PAYING
ONE YEAR DIPLOMA
IN
APPLIED INSTRUMENTATION
AND
CONTROL AUTOMATION
Curriculum approved by TEVTA
GOVT. OF PUNJAB
Eligibility: F.Sc. Pre-Engg. or ICS or
DAE Electronics / electrical
Maximum Age: 26 years
Offered BY
PRIME INSTITUTE OF TECHNOLOGY MULTAN
443-ALTAMASH ROAD, MULTAN CANTT.
TEL & FAX NO. 061-4548250
INFO CELL NO. 0300-9631550
ISO 9001:2008 CERTIFIED
REGISTERED & AFFILIATED WITH
PUNJAB BOARD OF TECHNICAL EDUCATION LAHORE.
DIRECTOR: M. YOUSUF SHAHABI
CELL: 0322-6157380
VICE PRINCIPAL: M. FRASAT SHAHABI
CELL: 0312-7537879
Admission opens in Jul-Aug of every year.
On completion
You will became an
INSTRUMENT TECHNICIAN
And can get a job of monthly salary
up to Rs. 50,000
in Pakistan
up to Rs. 100,000
in Middle east & all over the world.
Best chance for those
Not admitted in engineering universities
Prospectus price is Rs. 300/- by courier Rs. 450/-

کون ان سے کہہ سکتا ہے کہ آپ چلتے پھرتے نظر آئیں؟ رہ گئے گاہک ان کی بلا سے مشاعرہ ہو یا کچھ، وہ تو لائف بوائے سوپ، شیمپو لینے اس وقت بھی آئیں گے۔ ان کو تو اپنے نوزائیدہ کے لیے چُوسنی اور بے بی پاؤڈر اس وقت بھی درکار ہوگا۔ چنانچہ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں، شعرائے کرام کے علاوہ سامعین بھی کچھ زیادہ ہی جمع ہوگئے تھے۔ اس لیے کہ ساقی اپنی غزل پڑھ رہے تھے اور ان کی آواز سُن کر تو راہ گیر کیا پرندے تک ہوا میں معلق ہو کے رہ جاتے ہیں۔ دریا اپنی روانی چھوڑ دیتا ہے اور کچھ عجیب بات ہے کہ اسی وقت گاہک بھی کچھ ضرورت سے زیادہ آگئے تھے۔ مختصر یہ کہ مِلا جُلا مجمع ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا اور سڑک پر ٹریفک تھی۔ تھوڑی بہت رک گئی تھی یعنی اِدھر اور اُدھر دونوں طرف موٹر کھڑے ہارن دے رہے تھے کہ ناگاہ چودھری صاحب بھی اسی وقت آموجود ہوئے۔

کچھ پریشان، کچھ بدحواس، چہرے کا رنگ اُڑا ہوا۔ غالباً وہ سمجھے ہوں گے اس اجتماع کو دیکھ کر کہ کوئی بلوہ ہوگیا ہے یا دکان کو آگ لگ گئی ہے۔ مگر یہاں کچھ آل پاکستان مشاعرے کا رنگ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ سر پکڑ کر ایک طرف خاموش بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے غزل پڑھی تو بھی ہمارے کلام پر اچھل اچھل پڑنے والے چودھری صاحب سر پکڑے ہی بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ آنے والے رخصت ہوگئے۔ مجمع چھٹ گیا۔ سڑک کھل گئی اور دکان پر جب کوئی نہ رہا، تو چودھری صاحب نے نہایت خاموشی سے اُٹھ کر کہا، محبوب صاحب آج کون سی تاریخ ہے؟ عرض کیا، ''پندرہ۔'' انھوں نے کہا، میں بصد ادب آدھے مہینے کی یہ تنخواہ پیش کر رہا ہوں اور آدھے مہینے کی مزید تنخواہ اپنی طرف سے ہدیے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے۔

عرض کیا، بات کیا ہے آخر؟ کہنے لگے، میں شرمندہ ہوں گا اس سلسلہ میں بات کرتے ہوئے۔ صرف اسی قدر عرض ہے کہ میری دکانداری تو ختم ہو کر رہ جائے گی اگر آپ کچھ دن اور یہاں رہے۔ اس عرصہ میں جو نقصانات ہو چکے ہیں ان سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ لاکھ ان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہی مگر وہ بس ہاتھ ہی جوڑتے رہے اور اپنی دکان سے رخصت کر دیا۔ مگر اب اپنے شاعر احباب کے مشورے سے ہم نے ایک سائن بورڈ اپنے مکان ہی پر ٹانگ لیا ہے:

ادارہ اصلاحِ سخن
یک سخن

یہاں کلام میں اصلاح بھی دی جاتی ہے اور دوسروں کے لیے بہتر سے بہتر کلام بھی حسبِ فرمایش تیار کیا جاتا ہے۔

آزمایش شرط ہے۔

صبح سے شام تک اس سائن بورڈ کے زیرِ سایہ بیٹھے رہتے ہیں۔ آج ۱۵ر دن ہو چکے ہیں مگر اب تک صرف ۲ر گاہک آئے ہیں۔ ایک صاحب کی بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایسے پھڑکتے ہوئے شعر ان کو لکھے جائیں کہ بیوی تڑپ کر واپس آجائے۔ شعر ان کو کہہ کر دے دیے ہیں۔

۱۰۰ر روپے وہ دے گئے ہیں اور ۱۰۰ر روپے بیوی کے آجانے پر دیں گے۔ دوسرے صاحب اس لیے تشریف لائے تھے کہ وہ واقع ہوئے ہیں قوال۔ ان کے ایک حریف قوال نے کسی پچھلی محفل میں ایک چیز گا کر محفل لوٹ لی تھی۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ اسی قسم کی اس سے زبردست چیز کہہ دی جائے۔ وعدہ ہوا صرف ۳۰۰ر روپے کا اور اگر وہ چل گئی تو جیسی آمدنی محفل میں ہوگی ویسی ہی وہ ہماری خدمت بھی کریں گے۔ یہ چیز ہم تیار کر رہے ہیں۔ ان ۲ر گاہکوں کے علاوہ اب تک تو اور کوئی نہیں آیا۔ ہاں میں بھولا ایک صاحبزادے بھی شاگردی کرنے آئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ وہ جو ہم کو اُستاد کہیں گے تو ہم ان کو اس کسر نفسی کا کیا معاوضہ دیں گے؟ یہ ہے اس دور میں آپ کی شاعری کا حال اور اس حال میں ہیں آپ کے وہ شاعر جو آپ کے ادب کو مالا مال کر رہے ہیں۔

دانش مشرق

قونیہ میں محوِ خواب ایک مردِ خود آگاہ و خود بین کا تذکرہ

وہ سالہا سال بنجر دلوں کو اپنے سوز و گداز میں گندھے اشعار سے سینچتے رہے

سفیان شہزاد گورایہ

ایسا علم جو تجھے تجھ سے نہ لے لے، اُس سے جہالت بہتر ہے

بیرِ رومی

صدی ہجری کے ابتدائی دِنوں کی بات ہے جب تاتاریوں کا سیلِ رواں راستے میں آنے والی ہر سلطنت کو تنکوں کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ مسلمان ان دنوں طوائف الملوکی کا شکار ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے اور وہ قوم جن کا اتحاد کبھی مثالی ہوا کرتا تھا، انہی میں اتحاد کی دولت ناپید ہو چکی تھی۔ مرکزیت صرف برائے نام باقی تھی۔ انہی دنوں محمد خوارزم شاہ (جو خراسان کے بعض شہروں اور ''رے'' کے وسیع علاقوں کا حکمران تھا)، کی سلطنت میں ایک شریف النسب خاندان آباد تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا تھا۔ ان کے گھر میں ایک بزرگ جن کا نام ''محمد'' اور لقب ''شیخ بہاؤالدین'' تھا، وہ بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ خراسان میں ان کا بڑا چرچا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی ان کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔

۶۰۴ھ میں ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔ انھوں نے اس کا نام بھی محمد رکھا جو آگے چل کر جلال الدین رومی کے نام سے مشہور ہوئے۔

۶۱۰ھ میں شیخ بہاؤالدین نیشاپور ہجرت کر گئے۔ جلال الدین رومی کی عمر ۶ سال تھی جب ان کے والد انھیں ساتھ لے کر نیشاپور کے مشہور بزرگ شیخ فریدالدین عطار سے ملاقات کرنے گئے۔ فریدالدین نے ننھے محمد کو دیکھ کر شیخ بہاؤالدین سے فرمایا ''مولانا اس کی تربیت میں غفلت نہ برتنا، آگے چل کر یہ مسلمانوں کا بہت بڑا امام بنے گا اور اس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔''

اس کے بعد شیخ بہاؤالدین بغداد پہنچے۔ کچھ دن وہاں قیام کے بعد شام، پھر حجاز، پھر زنجان پہنچے۔ پھر لارندہ پہنچ کر وہاں قیام کیا۔ جلال الدین کی عمر اب ۱۸ سال ہو چکی تھی۔ یہیں ان کی شادی جوہر نامی سمرقندی خاتون سے کر دی گئی۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام رشید سلطان وَلَدؒ رکھا گیا جو آگے چل کر آپ کا خلیفہ اور سوانح نگار بنا۔

بغداد میں قیام کے دوران شیخ بہاؤالدین کی شہرت روم کے بادشاہ علاؤالدین کیقباد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی خصوصی درخواست پر آپ قونیہ (ترکی) تشریف لے گئے۔ یہیں پر ۱۸ ربیع الثانی بروز جمعہ ۶۲۸ھ بمطابق ۲۲ جنوری ۱۲۳۱ء میں اپنے لختِ جگر جلال الدین رومی کو اپنے مریدِ خاص سید برہان الدین کے سپرد کر کے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا جلال الدین نے ابتدائی علوم کی منازل اپنے والد سے ہی طے کر لی تھیں۔ اس کے بعد اپنے اتالیق سید برہان الدین کی شاگردی اختیار کی۔ ۶۲۹ھ میں شام تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ سعدی اور شیخ محی الدین ابن عربی کے حلقے کے صوفیوں سے کسب فیض کیا۔ پھر حلب کے مدرسے حلاویہ میں رہ کر مولانا کمال الدین کے سامنے زانوئے تلمذ (شاگردی) تہ کیا۔ یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں پیدا ہونے والا یہ بچہ محض ۲۶ سال کی عمر میں مرجع خلائق بن گیا اور بڑے بڑے علما اس کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اتنی شہرت کے باوجود دل میں ایک کسک سی باقی تھی اور نامعلوم شے کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

اُدھر ایک مردِ خدا بابا کمال الدین جندی کو بذریعہ کشف مولانا کے تمام حالات کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے مریدِ خاص حضرت شاہ شمس تبریزؒ کو حکم دیا کہ روم جاؤ اور ایک سوختہ دل کو گرما آؤ۔ سو وہ قونیہ پہنچے اور شکر فروشوں کی سرائے میں قیام فرمایا۔

ایک دن مولانا جلال الدین راستے سے گزر رہے تھے کہ حضرت شمس سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت شمس نے سرِراہ دریافت فرمایا کہ مجاہدے اور ریاضت کا کیا مقصد ہے؟ مولانا نے جواب دیا ''اتباعِ شریعت۔''

شمس تبریز نے کہا، یہ تو سبھی جانتے ہیں لیکن اصل مقصد مجاہدے اور ریاضت کا یہ ہے کہ وہ انسان کو منزل تک پہنچا دے۔ پھر حکیم سنائی کا شعر پڑھا جس کا ترجمہ ہے:

''ایسا علم جو تجھے تجھ سے نہ لے لے، اس سے جہالت بہتر ہے۔''

شمس تبریز سے مولانا کی ملاقات کے متعلق ایک دوسری حکایت بھی ملتی ہے جس کے مطابق مولانا حوض کے کنارے بیٹھے درس و تدریس میں مشغول تھے کہ حضرت شمس تبریز وہاں پہنچے اور وہاں موجود کتب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''یہ کیا ہے؟''

مولانا نے جواب دیا ''یہ وہ علم ہے جس کا تجھے نہیں پتا (ایں علم است و تو نمی دانی)۔ حضرت شمس تبریز نے ساری کتابیں حوض میں پھینک دیں۔ مولانا نے فرمایا، یہ تو نے کیا کر دیا؟ ایسی قیمتی کتب تو بادشاہوں کے خزانوں میں بھی نہ ہوں گی۔ یہ سن کر حضرت شمس تبریز نے ہاتھ ڈال کر حوض میں سے ساری کتب ایک ایک کر کے خشک حالت میں نکال لیں اور ساتھ ساتھ کتابوں پر ہاتھ مار کر گرد جھاڑتے جاتے تھے۔ مولانا نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ تو حضرت شمس تبریز نے جواب دیا کہ یہ وہ علم ہے جس کا تجھے نہیں پتا (ایں علم است و تو نمی دانی)۔

اس کے بعد مولانا حضرت شمس کے مرید ہو گئے۔ مولانا خود فرماتے ہیں۔

مولوی ہرگز نہ شُد مولائے روم
تا مریدِ پیرِ تبریزی نہ شُد

اس کے بعد مولانا روم نے درس و تدریس کی تمام مجالس ترک کردیں اور حضرت شمس کے ہی ہو کر رہ گئے اور خاموشی اختیار کرلی۔ اگر کسی وقت بولتے تو منہ سے خوبصورت اشعار نکلتے جو ان کے ایک مریدِ خاص ساتھ ساتھ لکھتے جاتے۔ یہی اشعار آج ہمارے سامنے مثنوی کی صورت میں موجود ہیں۔

سالہا سال تک بنجر دِلوں کو آباد کرنے والے یہ عظیم انسان ۵ر جمادی الثانی ۶۷۲ھ بمطابق ۱۷ر دسمبر ۱۲۷۳ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ قونیہ میں ان کا مزار آج بھی اہلِ دل کے لیے حرم ہے۔

مثنوی روم

مولانا جلال الدین رومی کی اور بھی کئی تصانیف ہیں لیکن جو شہرت دوام ''مثنوی'' کو ملی، دوسری کتب اس سے محروم ہی رہیں۔ آج بھی جہاں جہاں مسلمان اور فارسی زبان سے واقفیت رکھنے والے موجود ہیں، ان کی یہ کتاب نہ صرف پڑھی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اپنی اس کتاب میں آپ نے حکایات کا سہارا لے کر تصوف کے دقیق سے دقیق مسائل کو بھی انتہائی آسان طریقے سے قاری کو ذہن نشین کروایا ہے جیسے وہ کوئی عام سا مسئلہ ہو۔

اس کا ہر ایک شعر سوز و گداز میں گُندھا ہوا اور پڑھنے والے کے دل میں اترتا جاتا ہے۔ اپنی شاعری میں مولانا جگہ جگہ انسانیت سے محبت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ بدکار سے بدکار شخص سے بھی محبت کریں نہ کہ نفرت۔ نفرت کے لائق تو اس کا عمل ہے نہ کہ وہ خود۔ آپ فرماتے ہیں کہ کسی انسان کے ظاہر کو دیکھ کر اُسے بُرا نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کا مقبول ترین بندہ ہو۔ اس سلسلے میں ۲ر حکایات پیشِ خدمت ہیں:

حکایت نمبر۱

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ایک سارنگی بجانے والا گویا تھا۔ اتنا خوشنوا کہ بلبل بھی اُس کی آواز سے مست ہوجائے۔ اس کی آواز گویا مُردوں میں جان ڈال دیتی۔ اس کی ساری عمر سارنگی بجاتے گزر گئی۔ یہاں تک کہ ۷۰ر سال کا ہوگیا۔ خوشنوائی رخصت ہوگئی، آواز بھدی ہوگئی، ہاتھ کانپنے لگے اور دو وقت کی روٹی سے تنگ آ گیا۔

اُسے ایک دن خیال آیا کہ ساری عمر لوگوں کے لیے سارنگی بجائی۔ چند کوڑیوں کے لیے لوگوں کو خوش کرتا رہا۔ کیوں نہ آج خالقِ حقیقی کے لیے بھی سارنگی بجاؤں اور انعام پاؤں۔ یہ سوچ کر وہ مدینہ کے قبرستان چلا گیا اور سارنگی بجانے لگا۔ اس حالت میں اُسے نیند آگئی اور وہ سوگیا۔

اللہ رب العزت کو اس کی یہ ادا اتنی زیادہ پسند آئی کہ حضرت عمرؓ کو بحالتِ نیند الہام کیا کہ میرا ایک بندہ قبرستان میں پڑا ہے۔ بیت المال سے ۷۰۰ر درہم لے کر اسے دے آؤ۔ عمر فاروقؓ ۷۰۰ر درہم لے کر وہاں پہنچے۔ سارنگی والے کو دیکھ کر اسے فاسق و فاجر سمجھ کر کسی اور بندے کو تلاش کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ انھیں الہام کیا کہ یہی میرا وہ بندہ ہے۔

آپؓ نے اسے جگایا تو وہ آپ کو سامنے دیکھ کر ڈر گیا کہ گناہگار بندہ ہوں اور محتسب سر پر آ گیا ہے۔ لیکن آپ اسے کوئی سزا دینے کے بجائے ۷۰۰ر درہم دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ نے تمھارے لیے بھیجے ہیں۔ وہ بڑا شرمندہ ہوتا ہے اور خدا کے حضور عرض کرتا ہے کہ اے مولیٰ.....! تو کتنا رحمان و رحیم ہے۔ میں نے ۷۰ر سال تک تیری نافرمانی میں زندگی گزاری اور تو نے پھر بھی مجھے یاد رکھا۔ وہ پھر تائب ہوگیا اور سارنگی توڑ دی۔

قارئین کرام غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کتنا دیالو ہے۔ ایک بندہ جو ۷۰ر سال اللہ کی نافرمانی کرتا رہا محض سارنگی بجانے پر اس کو یہ انعام دیا کہ امیر المومنین کو اس کے پاس بھیجا۔ ۷۰۰ر دینار دے کر اس کے ضمیر کو ایسا چوکا لگایا کہ وہ خود بخود تائب ہوگیا۔ لہٰذا بندہ چاہے جتنا بھی گناہگار ہو جب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ جو اسے ۷۰ر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے، اس کی پکار کو ضرور سنتا ہے۔

اسی موضوع پر ایک اور حکایت مولانا کی مثنوی میں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا معمول تھا کہ مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک دن ایک بوڑھے مہمان کو ساتھ بٹھا کر کھانا شروع کیا تو اس نے بسم اللہ پڑھے بغیر کھانے کا آغاز کردیا۔ جد الانبیاء نے اُسے دسترخوان سے اٹھا دیا، تو مولائے کائنات نے وحی کی کہ اس کی عمر ۸۰ر سال ہے۔ اتنے سال یہ میرا رزق کھا کر میرا انکار کرتا رہا، میں اتنے سال اسے کھلاتا رہا ہوں۔ آج اس نے ایک وقت ہی تمھارے سامنے میرا نام نہیں لیا تو تم نے اسے دسترخوان سے اٹھا دیا۔ اس پر ابراہیمؑ نے اللہ سے معافی مانگی اور دسترخوان پر اسے بٹھا کر عزت سے کھانا کھلایا۔

حکایت نمبر۲

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی ملک کا ایک بادشاہ تھا۔ اس نے ایک نہایت خوبصورت باز پال رکھا تھا جس سے وہ شکار کا کام لیتا تھا۔ باز اس کا وفادار اور اس کے اشاروں پر چلنے والا تھا۔ ایک دن وہ گم ہوگیا۔ تلاش کے باوجود بھی نہ ملا۔ بادشاہ نے ملک بھر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ باز کی تلاش شروع ہوگئی۔

اُدھر باز ایک بُڑھیا کی جھونپڑی میں چلا گیا۔ بُڑھیا ناسمجھ اور جاہل تھی۔ اس نے باز کو دیکھا تو کہا، تو کن ناسمجھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے؟ جنھوں نے تیرے پروں کی تراش خراش کی نہ تیرے ناخن کاٹے اور نہ تیری ٹیڑھی چونچ کو سیدھا کیا۔ سو اس نے باز کی چونچ، پروں اور ناخن کو کاٹ دیا اور اسے بالکل بے کار کردیا۔ بادشاہ کے کارندے باز کو ڈھونڈتے ہوئے بُڑھیا کی جھونپڑی تک پہنچے اور باز کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرکے سارا ماجرا بیان کیا۔

بادشاہ بہت رویا اور باز سے کہنے لگا'' تیرا یہی علاج تھا جو بُڑھیا نے کردیا۔ تو نے اپنے مالک سے جو تیری ہر ضرورت کو بہتر سمجھتا اور تیرا خیال رکھتا تھا دغا کی اور ایسی جگہ گیا جہاں نہ تو کوئی تیری ضرورت کو سمجھتا تھا اور نہ تیرا خیال رکھ سکتا تھا۔ پس ذلت تو تیرا مقدر ہونی ہی تھی سو وہ ہوئی۔''

سبق: باز سے مراد انسان اور بڑھیا سے مراد دنیا۔

جیسا کہ اس حکایت کے ایک شعر میں خود مولانا روم نے ذکر کیا ہے:

کندہ پیر جاہل ایں دنیا دُنی ست
ہر کہ مائلِ شد بدوخوار و غمی ست

جاہل بُڑھیا یہ کمینی دنیا ہے اور جو اس کی طرف مائل ہوا ذلیل اور بیوقوف ہے اور بادشاہ سے مراد حق تعالیٰ کی ذات ہے۔

اب مطلب واضح ہے کہ اگر انسان (خصوصاً مسلمان) اللہ تعالیٰ سے دغا کرے اور اس کو چھوڑ کر جو اس سے ۷۰ر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے، دنیا کی طرف مائل ہو جو کہ جاہل بُڑھیا کے مانند ہے، تو دنیا اور آخرت میں ذلت اور رسوائی اس کا مقدر ٹھہرے گی اور انسان اپنے مقام و مرتبہ سے جو کہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات اور اپنا خلیفہ بنا کر بخشا ہے، گر جائے گا۔ یہیں سے اقبالؒ نے خودی اور شاہین کا تصور لیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

دست ہر نا اہلِ بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

ترجمہ: ہر نااہل کا ہاتھ تجھے بیمار کردیتا ہے، ماں کی طرف آ کہ تیری عیادت کرے۔

آخر میں مولانا روم خدائے مہرباں کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں:

اے خدائے باعطائے با وفا
رحم کن در عمر رفتہ در جفا

ترجمہ: اے عطا اور وفا کرنے والے اس پر رحم کر جو اپنی عمر جفا میں گزار چکا ہے۔

محاورں کی دنیا

اُردو میں سب سے زیادہ اشعار کا محور

آنکھ

اِترانے، آنکھیں دِکھانے، شرمانے، آنکھ بھر آنے، مٹکانے، دھمکانے اور چُرانے جیسے کتنے ہی کام صرف اِس آنکھ سے وابستہ ہیں، آیئے! اس کا ذکر کرتے ہیں

اُمِ ایمان

اُردو شاعری میں ''آنکھ'' ایسا انسانی عضو ہے جس پر شاید سب سے زیادہ اشعار کہے گئے۔ نثر میں معنی بے شمار ہیں اور محاورے بھی۔ شاعر حضرات کبھی آنکھ اور ابرو کو تیر کمان سے تشبیہ دیتے ہیں اور کبھی سُرمے کی لکیر کو شمشیرِ بے نیام سے، گویا آنکھ نہ ہوئی اسلحہ خانہ ہوگیا ؎

گوشۂ چشم سے باہر ہوئی سرمے کی لکیر
خیر ہو میان سے تلوار نکل آئی ہے

کبھی محبوب کو نصیحت کی جاتی ہے کہ ؎

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی انگلی
نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

کبھی آنکھ کے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو گوہرِ بے بہا قرار دیا جاتا ہے۔

اب اپنی آنکھ کے دریا کو کام میں لاؤ
کہ زندگی کا سمندر تو بے گہر ہے بہت

اُردُو ادب میں ''آنکھ'' کا مقام جاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے معنی جان لیے جائیں کہ یہ کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے:

آنکھ:۔ دیکھنے کا عضو، چشم، دیدہ، نگاہ، نظر، بینائی، بصارت، دیکھنے کا انداز، تیور، اِشارہ، دخل، شناخت، واقفیت، امید، اولاد، محبّت و مروت، گھٹنے کے دونوں اطراف کے گڑھے، آلو، بانس اور گنے میں شاخیں پھوٹنے کی جگہ، انناس کے حلقے۔

آنکھ کیا کام کرسکتی ہے، اس سے متعلّق کون سے محاورے مشہور ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے، آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں:

آنکھ آنا:۔ آنکھ دُکھنے آنا، آنکھ میں تکلیف ہونا، آنکھ میں جلن ہونا۔

آنکھ اُبل آنا:۔ آنکھ میں تکلیف ہونا، آنکھ سوجنا، آشوبِ چشم ہونا۔

آنکھ اٹکنا:۔ عاشق ہونا، فریفتہ ہونا۔

آنکھ اٹھنا:۔ نظر سامنے ہونا، توجہ ہونا۔

آنکھ اُٹھ نہ سکنا:۔ بہت شرمندہ ہونا، رعب اور خوف غالب ہونا۔

آنکھ آشنا ہونا:۔ واقف ہونا، روشناس ہونا۔

آنکھ اٹھا کر دیکھنا:۔ نظر بھر کر دیکھنا، توجہ کرنا، حسرت، رغبت، چاشنی سے دیکھنا۔

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا:۔ شرمانا، توجہ نہ کرنا، خاطر میں نہ لانا، ناراض ہونا، بے پروائی برتنا، ناقدری کرنا، غرور کی وجہ سے نہ دیکھنا، خوف سے نظر نیچی کیے رہنا۔

آنکھ اُچٹ جانا:۔ آنکھ کھل جانا، جاگ جانا، نشانہ چوک جانا۔

آنکھ الجھنا:۔ (جو عموماً عاشقوں اور شاعروں کی ہوتی ہے) عشق ہونا۔

آنکھ بتانا:۔ آنکھ سے اشارہ کرنا۔

آنکھ بچا جانا:۔ بے مروتی کرنا۔ چھپ کر کام کرنا، چشم پوشی کرنا، کھسک جانا۔

آنکھ بدل جانا: بے مروت ہونا، محبّت میں فرق آنا۔

آنکھ بند کرلینا:۔ سوجانا، مرجانا، بے پروائی کرنا، بے وفائی کرنا، کام سے توجہ ہٹانا۔

آنکھ بہہ جانا:۔ آنکھ خراب ہونا۔

آنکھ بھر آنا:۔ آنکھوں میں آنسو آنا، آبدیدہ ہوجانا۔

آنکھ بھوں چڑھانا:۔ تیوری چڑھانا، خفگی کا اظہار کرنا، ناراض ہونا، نفرت کا اظہار کرنا۔

آنکھ بیٹھ جانا:۔ اندھا ہونا، آنکھ کے ڈیلے کا اندر دھنس جانا، بہت نقصان ہونا۔

آنکھ پانا:۔ اشارہ پانا، مرضی پانا۔

آنکھ پتھرانا:۔ بے نور ہونا، مرجانا۔

آنکھ پسیجنا: شرم آنا، لحاظ آنا، ترس آنا، آنکھ میں آنسو آنا۔

آنکھ پلٹنا:۔ نگاہ بدلنا، نظر پھیرنا۔

آنکھ پھر جانا:۔ خفا ہونا، دشمن ہونا، رُخ بدل لینا، بے اعتنائی برتنا۔

آنکھ پھڑکنا:۔ خود بخود پپوٹے کا حرکت میں آنا، مشہور ہے کہ دائیں آنکھ پھڑکے تو خوشی اور بائیں آنکھ پھڑکنے پر رنج حاصل ہوتا ہے۔

آنکھ پھسلنا:۔ کسی شے کی چمک اور صفائی کے باعث نظر نہ جمنا، نگاہ کا لغزش کرنا۔

آنکھ پھوٹنا:۔ بینائی جاتی رہنا، اولاد کا مرنا۔

آنکھ پیدا کرنا:۔ دیکھنے یا پرکھنے کی لیاقت پیدا کرنا۔

آنکھ تاڑ جانا:۔ تیور سے اِرادہ بھانپ لینا۔ نگاہوں کے انداز سے مقصد معلوم کرلینا۔

آنکھ تر ہونا:۔ آنسو آنا، دقت آنا۔

آنکھ ٹھنڈی کرنا:۔ دل خوش کرنا، تسلّی دینا، کسی دوست یا عزیز سے ملنا۔

آنکھ ٹیڑھی کرنا۔ بے رُخی کرنا، بے مروتی اختیار کرنا، خفا ہونا۔

آنکھ جا پڑنا:۔ یکا یک نظر پڑ جانا، اتفاقیہ دیکھ پانا۔

آنکھ جا لڑنا:۔ (یہ بھی عاشقوں اور شاعروں کا ہی کام ہے) عاشق ہونا اور فریفتہ ہونا، نظر سے نظر ملنا۔

آنکھ جلنا:۔ مغلوب ہونا، دب جانا، مقابلہ برداشت نہ کرنا۔

آنکھ جمنا:۔ نظر ٹھہرنا۔

آنکھ جھپکانا:۔ پلک مارنا، شرمانا، اشارہ کرنا، روشنی کی تاب نہ لانا۔

آنکھ جھکانا:۔ شرم سے نظر نیچی کرنا، شرمندہ ہونا، نظر نہ ملانا۔

آنکھ چُرانا: نظر بچانا، پہلو بچانا، اغماض برتنا، کترانا، چھپنا۔

آنکھ چمکانا:۔ اِترانا، آنکھیں مٹکانا۔

آنکھ دِکھانا: اشارہ کرنا، گھرکنا، دھمکانا، ناراض ہونا۔

آنکھ دینا:۔ دیکھنے کی طاقت بخشنا، علم و فہم دینا، لیاقت دینا۔

سچ بتائیں تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ آنکھوں سے اتنے کام لیے جاسکتے ہیں۔ شاید اسی لیے شاعر حضرات آنکھوں آنکھوں میں تمام مراحل طے کرنے کی باتیں کرتے ہیں کہ محبوبِ حقیقی ہو یا مجازی، بصارت ہو تو دیکھ لینا ممکن اور محسوس کرلینا بھی۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

تو نے سو سو رنگ سے پردا کیا
دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا
ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

ایک

نثری یا شعری تصنیف کی تخلیق جس قدر مشکل ہے، اسی قدر اس کا عنوان تجویز کرنا بھی کٹھن مرحلہ ہے۔

اُردو ادب میں کئی اشعار اس قدر زبان زد عام ہوئے کہ شاعر اور نثر نگاروں کے لیے انھیں بطور اپنی کتابوں کے نام، مستعار لینا ضرورت بن گیا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں غالبؔ کے کمالات کا ایک جہان معترف ہے کہ انھوں نے ایسے رازوں سے پردہ اٹھایا جو پہلے دیوانے کی بڑ معلوم ہوتے تھے، وہیں یہ اعزاز غالب ہی کو گیا کہ سب سے زیادہ اُن ہی کے اشعار سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی کتابوں کے نام تجویز کیے۔ آئیے کچھ مشہور اشعار اور کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دیوانِ غالب کا پہلا شعر ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش فریادی، فیض احمد فیض کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے بڑے شاعر تھے جن کے اثرات موجودہ صدی میں بھی چھائے ہوئے ہیں۔ اس مجموعۂ کلام میں فیض صاحب کی وہ شہرہ آفاق نظم بھی شامل ہے جس نے ملکہ ترنم نور جہاں کو اتنی شہرت بخشی کہ بالآخر فیض صاحب نے یہ نظم یہ کہہ کر نور جہاں کے نام منسوب کردی کہ یہ نظم اب میری کہاں یہ تو نور جہاں کی ہی ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

دیوانِ غالبؔ کے پہلے شعر ہی کی ایک ترکیب، ''شوخیِ تحریر'' سید محمد جعفری کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

سید محمد جعفری کی وجہ شہرت شاعری اور مصوری ہے۔ وہ اکبر الٰہ آبادی کی طرز پر بڑے شاعر تھے۔ پیروڈی میں کمال حاصل تھا۔ اُن کی جس پیروڈی کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ نظیر اکبر آبادی کی نظم ''جب لاد چلے گا بنجارہ'' ہے۔ اُن کی وفات کے بعد مجموعۂ کلام ''شوخیِ تحریر'' منظرِ عام پر آیا۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض کی کلیات کا مجموعہ ہے جس میں نقش فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہ سنگ، سروادیٔ سینا، شامِ شہریاراں، مرے دل مرے مسافر اور غُبارِ ایام کی شاعری شامل ہے۔ اس میں تصاویر نامور مصور اسلم کمال کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ مکتبہ کارواں، لاہور کے تعاون سے شائع ہوا۔

☆☆

وہ میری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

چین جبیں کے درمیاں ''بہ'' لگانے سے یہ اُردو کا محاورہ بن جاتا ہے۔ اس نام سے ڈاکٹر عنایت اللّٰہ فیضی نے ایک سفر نامہ لکھا۔ یہ چین کے ۱۵ روزہ دورے کے دوران پیش آنے والے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ اسے دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کیا۔

☆☆

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

دلاور فگار مزاحیہ شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے ایک شعری مجموعے کا نام مرزا غالبؔ کے اسی شعر سے مستعار لیا گیا جس کا نام ''انگلیاں فگار اپنی'' ہے۔ اس نام میں شاعر کے تخلص کی رعایت ہے اور غالب کی تراکیب سے استفادہ بھی۔

اُردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''بنات النعش'' کا نام بھی غالب کے شعر سے لیا گیا ہے

☆☆

ہیں اور بھی دنیا میں سُخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

''سُخن ور'' سلطانہ مہر کی چار جلدوں پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ پاکستان کے اُردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اسی نام سے ایک ادبی ماہنامہ کراچی سے کوثر نقوی نکالتے ہیں۔

☆☆

وہ آئیں گھر میں ہمارے خُدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

''وہ آئیں گھر میں ہمارے''، عبدالقوی ضیا علیگ کی خاکوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں پروفیسر عزیز احمد، فیض احمد فیض، پروفیسر ممتاز حسین، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، رئیس امروہوی، صہبا لکھنوی، حمایت علی شاعر اور احمد فراز کے خاکے شامل ہیں۔ عبدالقوی ضیا علیگ طویل عرصے تک حیدر آباد سندھ میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔

☆☆

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں

''بزم آرائیاں'' معروف مزاح نگار، کرنل محمد خان کے طبع زاد مضامین کا مجموعہ ہے، جسے انہوں نے اپنے دوستوں کے نام معنون کیا۔ ۱۵ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں بقول مصنف کے ۳ قسم کے مضامین شامل ہیں: عشقائیے، انشائیے اور مصنف بیتی۔ اس کتاب میں شامل اُن کی ایک تحریر ''قدر ایاز'' کو اُردو کی شاہکار تحریروں میں شمار کیا گیا۔

جمیل الدین عالی کے سفرناموں ''دُنیا مرے آگے'' اور ''تماشا مرے آگے'' نے بھی غالب کے اشعار سے وجود اور نام پایا

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں

ڈپٹی نذیر احمد کو اُردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ''بنات النعش'' اُن کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ہے جن کے مشہور کردار ۲ بہنیں، اکبری اور اصغری ہیں۔ یہ گھریلو مسائل پر مبنی ناول اصلاحِ معاشرہ کے لیے لکھا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں میں محاورات اور کہاوتیں بہت ملتی ہیں۔ اگر انہیں یکجا کیا جائے تو یہ علیحدہ ضخیم کتاب بن سکتی ہے جو دلچسپ بھی ہوگی۔

☆☆

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہوگئیں

عطا الحق قاسمی کا شمار اُن کالم نویسوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہر دور میں حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچ لکھا۔ ''روزنِ دیوار سے'' اُن کے اخباری کالموں کا مجموعہ ہے جس کا ہر کالم پڑھنے کے لائق ہے۔

اُردو ادب کا ایک اور بڑا نام آغا شورش کاشمیری کا ہے جو سیاست، خطابت، صحافت، تاریخ، خاکہ نگاری

سمیت شاعری اور نثر کی اصناف ادب پر حاوی تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کئی بار جیل گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر باغیانہ تقریر پر ۷/سال قید کی سزا پائی۔ ''پس دیوارِ زنداں'' اسی قید کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ہے۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی اُردو ادب کے لیے بیش بہا ذخیرہ چھوڑا۔

☆☆

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

''گنج ہائے گراں مایہ'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہم عصروں کے خاکوں پر مشتمل کتاب ہے۔ ان خاکوں کا تعارف کراتے ہوئے لطیف الزماں رقم طراز ہیں: ''رشید صاحب کے خاکے محض ادبی شاہکار ہی نہیں بلکہ اُن میں الفاظ کا دروبست دِل آویز، شگفتہ اندازِ تحریر اور منفرد و یکتا نثر کا اُسلوب ملتا ہے۔ انسانوں کے کرداروں کا مطالعہ شعور میں بالیدگی، وسعت و گہرائی پیدا کرتا ہے۔ اُردو خاکہ نگاری میں رشید صاحب پہلے ادیب ہیں جنھوں نے فرد اور فکر میں رشتہ تلاش کیا۔ جو خوبیاں انھوں نے کرداروں میں تلاش کی ہیں، اُن کا مطالعہ اور تجزیہ ہمارے ذہنی دریچوں کو کھولتا، آگے بڑھنے اور تازہ دم ہونے کا حوصلہ دیتا ہے۔ رشید صاحب نے کہیں بھی ان خاکوں میں اپنی شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیا۔''

☆☆

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

''آشفتہ بیانی میری'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی ہے۔ پروفیسر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں طویل عرصے تک درس و تدریس کے فرائض انجام
رہے۔ انھوں نے تعلیم و ادب کے لیے بے پناہ خد
انجام دیں جس کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے
متعدد اعزازات سے نوازا۔ علی گڑھ میں ہی اُن کی
آرام گاہ ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس
ڈاکٹر احسان رشید اُن کے صاحبزادے تھے۔

☆☆

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

''دنیا مرے آگے'' اور ''تماشا مرے آگے'' اُردو
معروف شاعر جمیل الدین عالی کے سفرنامے ہیں۔
کے لکھے ہوئے کئی ملی نغمات زبان زدِ عام ہیں۔ وہ
کے شعبے سے منسلک رہے۔ آج کل روزنامہ جنگ
ہفتہ وار اظہاریہ لکھ رہے ہیں۔ انجمنِ ترقی اردو، کر
کے سربراہ ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

جمیل الدین عالی کے اظہاریوں کا انتخاب ۲ ضخیم مجمو
''صدا کر چلے اور دُعا کر چلے'' کی صورت شائع ہوا ہے۔

☆☆

تیرا اندازِ سُخن شانہ زُلفِ الہام
تیری رفتار قلم جُنبش بالِ جبریل

''بالِ جبریل'' علامہ اقبال کا اُردو مجموعہ کلام ہے
جنوری ۱۹۳۵ء میں طبع ہوا۔ اس میں بعض غزلیں زبو
کی طرز پر اور کچھ رُباعیات اور قطعات پیامِ مشرق
انداز میں ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے حصے میں غزلیات
پھر رباعیات اور قطعات، آخر میں مختلف عنوانات کے

علامہ اقبال کے مجموعۂ کلام ''بالِ جبریل'' کا نام بھی مرزا غالب کے شعر سے ماخوذ ہے

نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں چند اُندلس کی مشہور عمارات
مقامات کے متعلق ہیں۔ اُن کے لفظ لفظ سے دردمندی
اظہار ہوتا ہے۔ اسی مجموعے میں اُن کی شہرہ آفاق نظم
''مسجدِ قرطبہ'' بھی شامل ہے۔

☆☆

بخشے ہے جلوہ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

نابیناؤں کے مسائل کے حل کے لیے سرگودھا میں
یک ادارہ ''ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ'' طویل عرصے
ے پروفیسر شیخ محمد اقبال کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔
نہی کی ایک تصنیف کا نام ''ذوقِ تماشا'' ہے۔ یہ نابیناؤں
کے انتالیس اہم مسائل پر مبنی ادبی مزاح کی حامل کتاب
ہے۔ یہ مضامین اس سے قبل ماہنامہ ''سفید چھڑی''
سرگودھا میں شائع ہو چکے۔

☆☆

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

''دیوار پتھر کی'' اُردو کے افسانہ نگار اور کئی انسائیکلوپیڈیاز کے مرتب سید قاسم محمود کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۰ کہانیاں شامل ہیں۔ جب انھوں نے اشاعتی میدان میں قدم رکھا اور سردار عبدالرب نشتر سے کیے وعدے کے مطابق انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے لگے تو پھر ان کے اندر کا افسانہ نگار گم ہوگیا۔ ''دیوارِ پتھر کی'' کا انتساب سید عابد علی عابد کے نام ہے جو اُن کے استاد تھے۔ کتاب کے آغاز میں میر تقی میر کا یہ شعر درج ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

☆☆

فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' کا نام غالب کے اشعار سے مستعار ہے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

لطف اللہ خان کی ایک وجہ شہرت یہ ہے کہ اُن کے پاس برصغیر کی نایاب آوازوں کا خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی کتابیں اور ایک سفرنامہ بھی لکھا۔ انھوں نے ''تماشائے اہلِ کرم'' کے عنوان سے ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے جن میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، ن م راشد، فیض احمد فیض، استاد قمر جلالوی، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی، حفیظ ہوشیار پوری اور زیڈ اے بُخاری شامل ہیں۔

☆☆

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

''غالب آشفتہ نوا'' ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے مضامین کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ مضامین کلامِ غالب زندگی کے حادثات، اُس زمانے کے تاریخی حالات اور سماجی فضا سے متعلق ہیں۔ یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے۔ ان مضامین کے خاص خاص عنوانات ہیں: غالب کی عشقیہ شاعری، غالب کا غم، غالب کے اُردو خطوط اور غالب کی بزمِ خیال وغیرہ۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر کرّار حسین نے لکھا ہے۔

ایک دلچسپ اور حیران کرنے والی تحریر

اتفاق یا حسن اتفاق

4 کا ہندسہ

چین اور جاپان میں ۴ کے ہندسے کو منحوس سمجھا جاتا ہے

میں چوتھے مہینے میں پیدا ہوا۔ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھا۔ شادی ۴ تاریخ کو ہوئی۔ پاسپورٹ میں سارے نمبر ۴۔ حج پر گیا تو مکتب ۴۔ ہوٹل کی منزل ۴۔ کمرا نمبر ۴۔ واپسی پر بھی تاریخ ۴ تھی

اتنے اتفاقات کے باوجود میں نہیں جانتا کہ یہ اتفاق ہے یا
کسوتی علم ہندسہ اِس کا باعث بنا ہے اور میری زندگی میں غالب رہا

حبیب اشرف صبوحی

زندگی کے ۴۰ سال ملازمت کے دوران مختلف شہروں میں قیام کیا۔ مختلف کرداروں سے ملا اور مختلف واقعات سے واسطہ پڑا جو دلچسپ تھے اور تلخ بھی۔ انہی واقعات اور کرداروں میں سے ایک کردار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

تقریباً ۲۵ برس پہلے کی بات ہے کہ مجھے اپنے ایک جنرل مینیجر کے ساتھ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا۔ جب میں مقررہ دن اور وقت پر ان کے پاس پہنچا تو اُن کے سیکرٹری نے بتایا کہ صاحب ایک انتہائی ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں اور آپ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ آپ کو اپنے پاس بٹھاؤں۔ میں آدھے گھنٹے تک فارغ ہوجاؤں گا۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ اُن کے سیکرٹری کا نام بعد میں معلوم ہوا جو ''محمد حامد'' تھا۔ وہ گاہے گاہے دفتر کے کام کے ساتھ کچھ جمع تفریق بھی کر رہے تھے۔

جمع تفریق کرتے ہوئے انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا پورا نام بتایا۔ پھر وہ کچھ حساب کتاب کرنے لگے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ ابھی کمپنی میں نئے آئے ہیں؟ کہنے لگے کہ نہیں۔ میں فیصل آباد سے ٹرانسفر ہو کر چند روز ہوئے یہاں آیا ہوں۔ چند لمحے بعد انھوں نے بتایا کہ ۴ کا ہندسہ آپ کی زندگی میں کردار ادا کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لگے کہ آپ کا نام ۴ حروف میں ہے۔ آپ چوتھے میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کی شادی ۴ تاریخ کو ہے۔ آپ کا بیٹا ۴ تاریخ کو پیدا ہوا ہے۔ آپ کی کے نام میں ۴ حروف ہیں اور وہ بھی چوتھے مہینے میں ہوئی ہے۔ آپ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہیں آپ کی بیوی بھی چوتھے نمبر پر ہے۔ آپ کے اکاؤنٹ میں ۴ آتا ہے۔ آپ کے گھر میں چار آتا آپ کی گاڑی میں چار آتا ہے فون نمبر اور موبائل میں چار آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی سانس میں چیزیں بتائیں اور جب میں نے غور کیا تو اس کی معلو صحیح تھیں لیکن میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میں اُن سے پوچھا کہ میں آپ سے پہلی بار ملا ہوں اور

بتادیں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے علم ہندسہ سیکھا ہے اور اس کی مدد سے میں ہر شخص کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ میری معلومات بالکل صحیح ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بے شمار واقعات گزرے جن میں ۴ کا ہندسہ اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ جب میں حج پر گیا تو میرے پاسپورٹ کا نمبر ۴-۴۴۴۴ تھا۔ میری بیگم کا پاسپورٹ نمبر ۵-۴۴۴۴۴ تھا۔ ہم ۴ تاریخ کو حج پر گئے۔ مکتب نمبر ۴ تھا۔ مکہ شریف میں چوتھی منزل پر ۴۱۴ نمبر کمرہ تھا اور اسی طرح مدینہ شریف میں چوتھی منزل پر ۴۴ نمبر کمرے میں ٹھہرے وہاں سے ۴ تاریخ کو پاکستان واپس آئے۔

اسی طرح میں ایک سرکاری ادارے میں ایبٹ آباد میں ملازم تھا۔ میرے دفتر کا ڈرائیور ایک ماہ کی چھٹی چلا گیا۔ اُس کی جگہ جس آدمی کو ڈرائیور رکھا وہ چند روز قبل ہی سعودی عرب سے آیا تھا اور وہاں اُس کی ملازمت ختم ہوگئی تھی۔

ایک روز میں اسلام آباد سے واپس آرہا تھا۔ میں اپنے ایک دفتری ساتھی کو ایک پریشانی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ میرے دفتر میں سامان کی چوری ہوگئی اور چور کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس ڈرائیور نے کہا کہ میرے والد ''علم ہندسہ'' کے ماہر ہیں۔ آپ، اپنا اور اپنی والدہ کا نام لکھ کر دیں میں آپ کی پریشانی کا حل نکلوا کر دوں گا۔ ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے، میں نے اُسے مطلوبہ معلومات دے دیں۔ وہ دوسرے روز میرے بارے میں بڑی تفصیل سے معلومات لے کر آگیا۔ اس کے والد نے جس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی ملا، تفصیلی معلومات دیں اور میری دفتری پریشانی کے بارے میں مکمل راہنمائی کی۔ اس نے یہاں تک بتایا کہ میرے بائیں بازو پر ایک تل کا ہونا ضروری ہے۔ جب میں نے اپنا بازو دیکھا تو واقعی تل تھا۔ اُس نے مزید بتایا کہ میں اگلے سال حج پر جاؤں گا۔ یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ میری دفتری پریشانی بھی ''معجزاتی'' طور پر ختم ہوگئی۔

جب میں متعلقہ آدمی سے ملنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے گیا تو اس نے کہا، اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی سے یہ علم حاصل ہو رہا ہے۔ جہاں بہت سے علوم ہیں، وہاں ''علم ہندسہ'' بھی ایک علم ہے۔ جہاں اور علوم کی افادیت ہے، وہیں اس ''علم'' کی بھی افادیت ہے، چاہے کوئی اس پر یقین کرے نہ کرے۔

اُردو زبان میں چار کے ہندسے کے بارے میں کئی محاورات ہیں:

(۱) چار آئینہ۔ ایک قسم کا زرہ بکتر جس میں لوہے کی چار تختیاں منڈھ کر سینے اور پشت پر ڈالتے ہیں۔

(۲) چار ابرو کا صفایا۔ ڈاڑھی، مونچھ، سر، بھنویں منڈوا دینا۔

(۳) چار جامہ۔ زین کی طرح کی پوشش جسے گھوڑے پر ڈال کر سوار ہوتے ہیں۔

(۴) چار چاند لگنا۔ قدر بڑھ جانا۔ مرتبہ اور عزت بڑھانا

(۵) چار چوٹ کی مار۔ ضرب شدید، لات، مکے اور لکڑی وغیرہ سے مارنا۔

(۶) چار دن کی چاندنی۔ عارضی خوشی۔

(۷) چاریاری۔ خاص دوستوں کا مجمع۔

(۸) چاروں خانے چت۔ اس طرح گرنا کہ پیٹھ زمین سے لگ جائے۔

(۹) چار یار۔ خلفائے راشدین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(۱۰) چار اجساد۔ خاک، باد، آب، آتش۔

(۱۱) چار پیر۔ سلسلہ زہاد میں جن کے پیرو عبادت الٰہی اور تزکیہ نفس میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کو علم معنی میں حقیقت و معرفت کی تلقین کا فیض حضرت علیؓ سے جاری ہوا امام حسنؓ، امام حسینؓ، حضرت حسن بصریؒ اور حضرت کمیل بن زیادؒ تک۔

(۱۲) آنکھیں چار کرنا۔ آنکھیں ملانا، مقابل ہونا، سامنے آنا۔

(۱۳) چار آنکھیں سر پر نہ رکھنا۔ سلام تک نہ کرنا۔

(۱۴) چار تکبیر۔ نماز جنازہ۔

چین اور جاپان میں چار کے ہندسے کو منحوس سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان زبانوں میں اس ہندسے کا تلفظ موت کے تلفظ سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان ملکوں کے لاکھوں افراد چار تاریخ کو سفر نہیں کرتے اور نہ ہی ایسا فون نمبر اور مکان نمبر منتخب کرتے ہیں جس میں چار کا ہندسہ شامل ہو۔ اسی طرح کسی بلڈنگ کی چوتھی منزل اور کار کی لائسنس پلیٹ میں چار کا ہندسہ منحوس سمجھا جاتا ہے۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سان ڈیاگو کے ماہرین سماجیات کی تحقیقات کے مطابق جاپانی اور چینی عوام میں دیگر اقوام کے مقابلے میں کسی بھی مہینے کی چار تاریخ کو موت کے منہ میں جانے کا خطرہ ۵۰ فیصد زائد ہوتا ہے۔

جرمنی کے بادشاہ چارلس پنجم کی زندگی میں ۴ کے ہندسے کی اہمیت:

وہ روزانہ چار مرتبہ کھانا کھاتا تھا۔
اُس کے پاس چار محلات تھے۔
ہر محل کے چار دروازے تھے۔
وہ چار رنگ کا لباس پہنتا تھا۔
وہ چار زبانیں جانتا تھا۔
اُس نے چار شادیاں کی تھیں۔
اُس کے چار لڑکے پیدا ہوئے۔
اُس کی فوج چار حصوں میں منقسم تھی۔
اُس کی وفات ۲۲ نومبر ۱۳۷۶ء کو شام چار بج کر چار منٹ پر ہوئی۔
مرتے وقت ۴ معالج اُس کے پاس موجود تھے۔

چہار چیز

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد و گرما ، گدا و گورستان

چہار چیز است تحفہ ملتان
آم و مخدوم و حلوہ و خرما

چہار چیز است تحفہ لندن
خمرو خنزیر و مردِ زنانہ و زن

(ظفر علی خان)

چہار چیز است تحفہ کشمیر
مفلسی، جہل، گندگی، ادبیر

(عزیز فیضانی)

چہار چیز است تحفہ بھوپال
گٹکا، بٹوہ، چنوئی و رومال

۴ کے ہندسے میں کچھ مزید

اللہ کے حرف	۴
محمدؐ کے حرف	۴
رسول کے حرف	۴
کتاب کے حرف	۴
مسجد کے حرف	۴
قرآن کے حرف	۴
نماز کے حرف	۴
حکمہ کے حرف	۴
روزہ کے حرف	۴
زکوٰۃ کے حرف	۴
جہاد کے حرف	۴
دنیا کے حرف	۴
آخرت کے حرف	۴
بہشت کے حرف	۴
جہنم کے حرف	۴
نبیؐ کے یار بھی	۴
مالک کے حروف	۴
غلام کے حروف	۴
مشہور آسمانی کتابیں بھی	۴
اماموں کی تعداد	۴
موسم بھی	۴

جوہرِ قابل

دشوار کو آسان بنا سکتے ہیں
اس قوم کی پہچان بنا سکتے ہیں
اخلاص سے محنت سے محبت سے ہم
افراد کو یک جان بنا سکتے ہیں

ہم کسی سے کم نہیں

ماہِ رفتہ میں رونما ہونے والے اہم واقعات اور اُن سے وابستہ شخصیات کا اجمالی تذکرہ جو ملک کا وقار بڑھنے کا باعث ہیں

تحریم حنا صدیقی

اُن کے لیے خاص جنھیں پاکستان اور پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

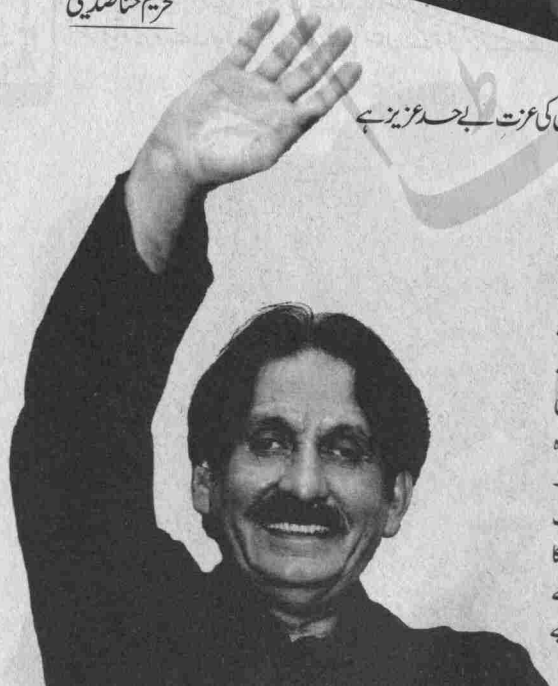

انٹرنیشنل جیورسٹ ایوارڈ

انٹرنیشنل جیورسٹ ایوارڈ کی اہمیت نوبل پرائز کے برابر ہے۔ اس مرتبہ انٹرنیشنل کونسل آف جیورسٹس نے جیورسٹ ایوارڈ ۲۰۱۲ء کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کا انتخاب کیا۔ اُنھوں نے لندن میں منعقدہ خصوصی تقریب میں یہ ایوارڈ وصول کیا۔ اُنھیں رکاوٹوں کے باوجود فراہمی انصاف کے لیے بلاخوف اقدامات کی بنا پر ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ چیف جسٹس کے ساتھ ساتھ یہ ایوارڈ پاکستانی قوم کے لیے بھی خوشی اور فخر کا باعث ہے۔

تھر کی جھلسا دینے والی گرمی میں عظیم کارنامہ

وطنِ عزیز کو اللہ تعالیٰ نے اَن گنت وسائل سے مالا مال کیا ہے، جہاں بے شمار معدنی وسائل پاکستان کی سرزمین میں مدفون ہیں۔ وہاں ایسے محبِ وطن، ذہین اور قابل افراد کی بھی کمی نہیں جو ان وسائل کو قابلِ استعمال بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہمت اور قوت دے جنھوں نے ملک کے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر ثمر مبارک مند کے زیرِ قیادت تھر کی جھلسا دینے والی گرمی میں تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ وہ کسی سے صلے کے طلب گار نہیں۔ وہ اپنی قوم کو توانائی کے قحط میں مبتلا دیکھ کر پریشان ہوئے اور یہ عہد کیا کہ وہ تھر کے کوئلے کے ذخیروں کو استعمال میں لاتے ہوئے قوم کو انرجی کے اس عظیم ذخیرے سے اس طرح مستفید کریں گے کہ اسے سستی گیس، بجلی اور ڈیزل فراہم کیا جاسکے۔ اس وقت ہم بجلی کا یونٹ ۲۰ روپے میں پیدا کر رہے ہیں، تھر میں کول کی گیسی فیکیشن کے ذریعے محض ۴ روپے فی یونٹ پیدا کریں گے۔ تخمینے کے مطابق توانائی کے اس عظیم ذخیرے سے ۵۰ ہزار میگاواٹ بجلی اور ۱۰ کروڑ بیرل ڈیزل آئندہ ۵۰۰ سال تک حاصل کیا جاسکے گا۔ یہ ایک خواب ہے، جس کا پورا ہونا اب قریباً یقینی ہو چکا ہے اور جس دن تھر کول سے ۱۰ ہزار میگاواٹ بجلی پیدا ہونے لگی، اس دن ہم تمام بحرانوں کو خیرباد کہتے ہوئے ترقی اور استحکام کے راستے پر قدم رکھ دیں گے۔

ڈاکٹر ثمر مبارک نے پوری قوم کو ایک مبارک خبر سنائی۔ ۱۳ مئی ۲۰۱۲ء کو مزید ۴ کنوؤں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ زیرِ زمین کول گیسی فیکیشن ٹیکنالوجی کو حتمی شکل دینے کے لیے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے مایہ ناز سائنسدانوں، انجینئروں، ٹیکنیشنوں نے اپنے حساس ادارے میں نصب سپر کمپیوٹرز بھی استعمال کیے۔ اگر یہی ٹیکنالوجی آسٹریلیا وغیرہ سے لی جاتی تو اس کے لیے پاکستان کے قومی خزانے سے ۶ کروڑ ڈالر خرچ کرنے پڑتے۔

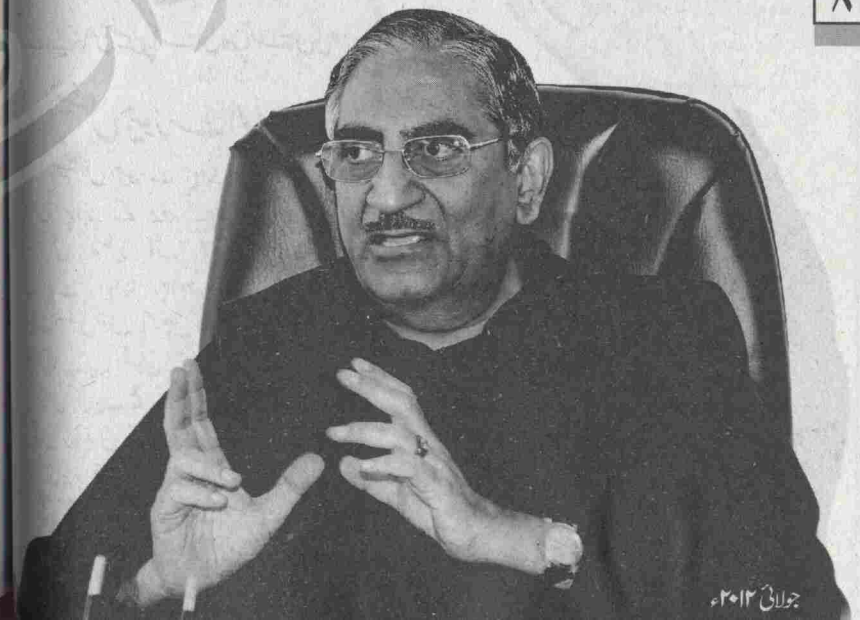

''میکا ایوارڈ'' کے لیے ۳ر پاکستانی کمپنیاں میدان میں

مغربی ممالک نے اپنی انڈسٹری اور افرادی قوت کو عالمی شہرت دینے کے لیے کوالٹی کے معیار بنائے اور دنیا بھر میں اپنے برانڈز کو مقبول بنایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں پاکستان کا بنا ہوا فٹ بال مشہور ہے اور بڑے بڑے میچ حتیٰ کہ ماضی میں عالمی ورلڈ کپ بھی سیالکوٹ کے بنے ہوئے فٹ بال سے ہی کھیلا جاتا تھا لیکن اس پر نام ایک ولایتی کمپنی کا لکھا ہوتا تھا۔ آج تک پاکستان نے فٹ بال میں اپنا کوئی برانڈ مقبول بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس قسم کی صورتِ حال دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ہے چنانچہ OIC (آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز) نے صنعت وتجارت کے میدان میں مسلمان ممالک کو آگے لانے کے لیے کافی اقدام کیے ہیں۔ اسلامی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز قائم کیا، کمیٹی فار اکنامک کارپوریشن، اسلامک چیمبر ریسرچ اینڈ انفارمیشن سنٹر، اسلامک کنٹریز کریڈٹ رینٹنگ سسٹم، اسلامی ورلڈ ٹریڈ ڈائریکٹری اور بین الاقوامی سطح پر اسلامی ممالک کے برانڈز کی حوصلہ افزائی کے لیے MECCA AWARDS (ایوارڈ کا پورا نام Muslim Excellency and Competitiveness Cooperation Award) ہے، کا اجراء کیا ہے۔ یہ اعلیٰ ترین مسلم ایوارڈ یورپی یونین کے EFQM ماڈل پر شروع کیا گیا ہے۔ ''میکا ایوارڈ'' کو اب اسلامی دنیا سے باہر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ایوارڈ کی نامزدگی کے لیے ضروری ہے کہ پروڈکٹ عالمی معیار کی ہو اور کوالٹی کے تمام عالمی معیار سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہو۔

اس سال استنبول میں ہونے والی تقریب میں پاکستان کی ۳ کمپنیوں نے بین الاقوامی سطح پر ''میکا ایوارڈ'' کے لیے کوالیفائی کیا۔ (۱) اظہار گروپ آف کمپنیز (۲) ماڈرن ٹیکسٹائل ملز (۳) شازیب فارما کمپنی

انٹرنیٹ پر فحش مواد کی روک تھام کے لیے عبداللہ غازی کی خدمات

انٹرنیٹ کے ذریعے آنے والا فحش مواد تیزی سے معاشرے کی اخلاقی وسماجی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ اس کے خلاف کراچی کا ۱۵ سالہ نوجوان عبداللہ غازی جدوجہد کی ایک علامت کے طور پر ابھرا ہے۔ عموماً اس عمر میں نوجوان کھیل کود اور لڑائی جھگڑوں میں حصہ لیتے ہیں تاہم اس نوجوان نے ایک انتہائی سنجیدہ اور مثبت نتائج کی حامل لڑائی کا راستہ اختیار کیا۔ اس کی لڑائی سسٹم، ریاستی اداروں، بے پردہ معاشرے، مغربی خود پسندوں اور نام نہاد لبرلز کے خلاف ہے، جہاں حکومت، پارلیمنٹ، سول سوسائٹی اور میڈیا انٹرنیٹ کے ذریعے پاکستان میں آنے والے فحش مواد پر چپ سادھے بیٹھا ہے۔ عبداللہ غازی نے اس کے خلاف لڑائی کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلے میں پی ٹی اے، وزارتِ آئی ٹی اور چیف جسٹس پاکستان سے رابطہ کیا کہ وہ فحش اور قابلِ اعتراض مواد کو چیک کریں۔ بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا ہے لیکن یہ نوجوان اب تک ۷ لاکھ ۶۰ ہزار قابلِ اعتراض مواد والے ویب لنکس کے متعلق پی ٹی اے کو آگاہ کر چکا ہے۔

علی رضا

پہلا پاکستانی مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ٹرینر

۲۵ رسالہ پاکستانی نوجوان علی رضا کی انفارمیشن ٹیکنالوجی میں غیر معمولی صلاحیت اور جستجو سے ایڈوب ٹریننگ پارٹنر Adobe Training Partner کی فہرست میں پہلی مرتبہ پاکستان کا نام ۲۰۱۰ء میں شامل ہوا۔ وہ واحد پاکستانی ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ (Microsoft Certified Trainer) کی فہرست میں بھی وہ شامل ہیں۔ واضح رہے کہ ٹریننگ پارٹنرز وہ تکنیکی اور تربیتی ماہرین ہوتے ہیں جنھیں متعلقہ اداروں کی طرف سے تعلیم دینے کا باقاعدہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔

علی رضا دنیا کے ممتاز آئی ٹی اداروں مائیکروسافٹ، اوریکل، ایڈوب اور زینڈ Adobe, Oracle, Microsoft اور Zend کی ۱۰۰ ر سے زائد آفیشل آئی ٹی سرٹیفیکیشن حاصل کر کے ورلڈ ریکارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔

علی رضا کی حاصل کردہ سرٹیفیکیشن کی فہرست بڑی طویل ہے جس میں:

ایڈوب سرٹیفائیڈ انسٹرکٹر کی ۳۱ ر سرٹیفکیشنز
ایڈوب سرٹیفائیڈ ماسٹر کی ۴ ر سرٹیفکیشنز
ایڈوب سرٹیفائیڈ سپیشلسٹ کی ۵ ر سرٹیفکیشنز
ایڈوب سرٹیفائیڈ کی ۱۹ ر سرٹیفکیشنز
مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ کی ۴۶ ر سرٹیفکیشنز
مائیکروسافٹ پروفیشنل ڈویلپر کی ۸ ر سرٹیفکیشنز
مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ٹیکنالوجی سپیشلسٹ کی ۱۱ ر سرٹیفکیشنز شامل ہیں۔

علی رضا کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر ڈگری ہولڈر ہیں۔ انہیں ڈیزائن اور ڈویلپمنٹ سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اپنے اسی شوق، علم سے لگن اور جستجو کی بدولت علی رضا دنیا کے صفِ اول کے اداروں مائیکروسافٹ، ایڈوب، اوریکل اور زینڈ کے مجموعی طور پر ۱۲۵ سرٹیفکیشن حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں وہ وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلی کے مطابق اپ گریڈ کرتے رہتے ہیں۔ علی رضا نے یہ کامیابی ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۲ء تک کی شبانہ روز محنت کے بعد حاصل کی ہے۔ واضح رہے کہ علی رضا کے مقابلے میں دنیا میں کہیں بھی کسی ایک فرد نے نصف سرٹیفکیشنز بھی حاصل نہیں کیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی پر امریکا سے شائع ہونے والے میگزین 'فلیش اینڈ فلیکس' اور 'کوڈر سکائے' میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے لیے خدمات کے اعتراف میں فلیش اینڈ فلیکس میگزین امریکا کی جانب سے فروری ۲۰۱۱ء میں انہیں میگزین میں (Contributing Editor) کے اعزاز سے نوازا گیا۔ علی رضا انگلینڈ کے ادارے ''ایگزیم ایڈ'' کے لیے فلیکس تھری اور فلیکس فور کے بارے میں گائیڈز بھی لکھ چکے ہیں جن کے ذریعے آئی ٹی طلبہ خود بھی ایڈوب سرٹیفائیڈ ایکسپرٹ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی اور برطانوی اشاعتی اداروں پیکٹ پبلشنگ اور پراگمیٹک پبلشنگ کی جانب سے شائع ہونے والی درج ذیل کتابوں کے تکنیکی مبصر (Technical Reviewer) کے طور پر بھی ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ Flash 10 Multiplayer Word Press, Game Essentials and Flash 10x Cookbook HTML5 and CSS3 Develop with Tomorrows standards Today اور۔ ان میں سے ۲ ر کتابوں میں ایک ایک صفحہ علی رضا کے نام مختص کیا گیا تھا، جبکہ تیسری کتاب پر تکنیکی تبصرہ کرنے پر مصنف نے علی رضا کا تحریری شکریہ ادا کیا۔

علی رضا نے Adobe کی پراڈکٹ اور ٹیکنالوجی سیکھنے اور استعمال کرنے والوں کے لیے Adobepedia کے نام سے ایک ایجوکیشنل موبائل سافٹ ویئر بنایا ہے جو کہ Android پر ریلیز ہو چکا ہے جبکہ iOs اور Blackberry Playbook کے لیے ابھی اپروول پراسس میں ہے۔ اس سافٹ ویئر سے لوگوں کو پراڈکٹ اَپ ڈیٹس، ٹیوٹو ریلز، ٹپس اینڈ ٹرکس اور اس کے علاوہ ویڈیو لیکچرز سے بھی استفادہ کرنے کی سہولت میسر آ سکے گی۔

علی رضا نے بتایا کہ وہ پیسا کمانے پر علم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اسی لیے اپنا بیشتر وقت علم حاصل کرنے پر صرف کرتے ہیں۔

پاکستان میں شمسی توانائی کے امکانات

پاکستان انجینئرنگ کونسل کے حکام نے کہا ہے کہ ملک میں شمسی توانائی سے سالانہ ۱۲ اعشاریہ ۳۲۴ ر ملین میگا واٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ توانائی بحران کے خاتمے میں سولر انرجی سسٹم اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ شمسی توانائی کی مدد سے دور دراز دیہی علاقوں کی قسمت بدلی جا سکتی ہے۔ بنگلہ دیش کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں نجی شعبے کی معاونت سے ہر ماہ ایک گاؤں میں ۱۰ ر ہزار سولر پینل لگائے جاتے ہیں جس سے دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کی جاتی ہے۔

جولائی ۲۰۱۲ء

جمیل الدین عالی کا ترانہ، انٹرنیٹ پر

مسرت جبیں اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں ''پچھلے دنوں جمیل الدین عالی کے بیٹے راجو جمیل نے فیس بک پر عالی صاحب کا ترانہ ''پاکستان کو سمجھو لوگو، پاکستان خدا کا ہے'' اس خیال سے متعارف کرایا تھا کہ وہ لوگ جو پاکستان کے موجودہ حالات سے مایوس اور دل برداشتہ ہیں، اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ قدرت کا یہ عظیم انعام ہمیں خدا کی طرف سے ملا ہے۔ ٹھیک ہے اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں کہ خدا ہم پر مہربانی اور احسان کرے لیکن اپنی نعمت کی حفاظت کرنا وہ خوب جانتا ہے۔ یہ واقعی اس کی عنایت ہے کہ ہم ابھی تک دنیا کے نقشے پر موجود ہیں ورنہ ہماری حرکتیں اس قابل تو نہیں تھیں کہ ہمیں دو دن کی بھی زندگی عطا کی جاتی۔ اس ترانے نے مقبولیت کے نئے ریکارڈز قائم کیے ہیں۔

مسلم ہینڈز انٹرنیشنل کا ۵۰ ممالک تک دائرۂ کار

''مسلم ہینڈز انٹرنیشنل'' کے سربراہ صاحبزادہ سید لخت حسنین وزیر آباد شہر کے معروف تعلیمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا خدمت خلق کا جذبہ ۱۲ مربع فٹ کے کمرے سے ۲۰ سالوں میں دنیا کے ۵۰ سے زیادہ ملکوں تک پھیل گیا ہے اور ان کا مشن اسے ۱۰۰ سے زیادہ ملکوں تک پھیلانے کا ہے۔

بعض اوقات کئی بڑے بڑے کاموں کا آغاز بہت سادے انداز میں ہوتا ہے۔ صاحبزادہ لخت حسنین کا کہنا ہے کہ ۲۰ سال پہلے انھوں نے روزنامہ جنگ لندن میں منو بھائی کے تحریر کردہ ایک کالم ''گریبان'' سے متاثر ہو کر خدمتِ خلق خدا کی عبادت شروع کی تھی۔

کروڑوں بلکہ اربوں پاؤنڈز کے اس عظیم مشن کا آغاز سید لخت حسنین نے اپنی لندن کی مسجد میں جھولی فنڈ اکٹھا کرنے سے شروع کیا تھا اور سب سے پہلے منو بھائی کے تحریر کردہ کالم میں بیان کردہ اُوچ شریف کی ایک بیٹی جمیلہ ناز کے معذور بھائی کے لیے موبائل وہیل چیئر خرید کر بھیجی گئی۔ بہت ہی قابلِ قدر بات ہے کہ وہ دنیا بھر میں کام کی مصروفیت کے باوجود اپنے آبائی شہر کے لوگوں کو نہیں بھولے جہاں ان کی تنظیم نے مثالی تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں۔

پاکستان اور آزاد کشمیر کے زلزلہ کے متاثرین اور ان کے لواحقین جانتے ہیں کہ مسلم ہینڈز انٹرنیشنل نے ان کی امداد اور معمولاتِ زندگی میں بحالی کی کوششوں میں کیسی کیسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ سیلاب زدگان بھی اس ادارے کی خدمات کو یاد رکھیں گے۔ مسلم ہینڈز انٹرنیشنل کی خدمتِ خلق کا دائرہ سری لنکا سے ساؤتھ افریقہ، صومالیہ، سری لیون، سینی گال، فلسطین، نائیجیریا، نیپال، موریطانیہ، مالی، ملاوی، مقدونیہ، چین، ایتھوپیا، البانیہ، آذر بائیجان اور بنگلہ دیش میں بھی پاکستان کے اصل، خوبصورت، انسان دوستی، خلقِ خدا سے ہمدردی کے تاثر کو پھیلانے میں مصروف ہے۔

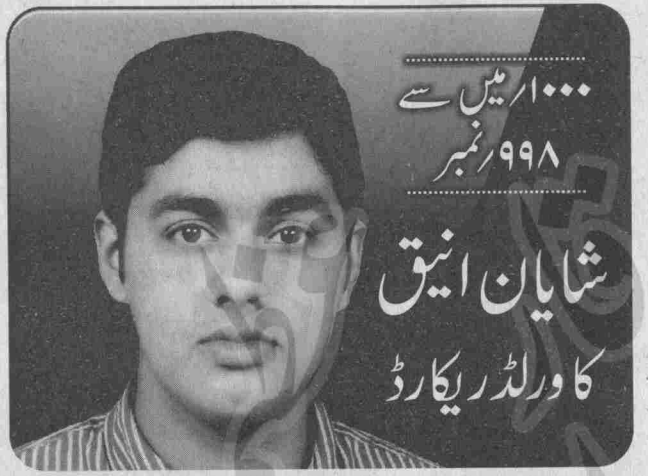

شایان، آئی ٹی کی دنیا میں روشن ستارہ بننے والا باصلاحیت طالب علم ہے۔ اس کا تعلق اوکاڑہ کے علاقے حویلی لکھا سے ہے۔ یہاں وہ بی ایجوکیٹرز سکول میں زیرِ تعلیم ہے۔ شایان کے والد ڈینٹسٹ ہیں۔ شایان نے کسی کمپیوٹر کالج یا ادارے میں کمپیوٹر کورس کرنے کے بجائے خود ہی کمپیوٹر پہ طبع آزمائی شروع کر دی۔ شایان کی بنائی گئی کمپیوٹر گیمز اور پراڈکٹس کو انٹرنیشنل کمپنیاں ڈالروں میں خرید رہی ہیں۔

شایان کے ماموں انگلینڈ میں سافٹ ویئر انجینئر ہیں۔ وہ ان کے کام سے بھی متاثر ہوا۔ میٹرک کی سند ملنے سے پہلے ہی پاکستان کا نام عالمی سطح پر روشن کرنے والا طالب علم ہے۔

۱۷ سالہ شایان انیق نے مائیکروسافٹ پروفیشنل سرٹیفکیٹ کے امتحان میں ۱۰۰۰ میں سے ۹۹۸ نمبر حاصل کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ یہ اعزاز حاصل کرنے پر مائیکروسافٹ کارپوریشن کے بانی بل گیٹس نے اس نوجوان کو ملازمت کے لیے خصوصی دعوت پر امریکا مدعو کیا ہے اور اپنی کمپنی کی طرف سے مکمل تعاون کا وعدہ بھی کیا ہے۔ شایان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی شامل کیا جا چکا ہے۔

شایان اب تک مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل (MCP)، مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ٹیکنالوجی سپیشلسٹ (CMCTS) اور مائیکروسافٹ پروفیشنل ڈویلپر (MCPD) کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔

شایان کمپیوٹر اور موبائل ٹیکنالوجی سے متعلقہ میگزین شوق سے پڑھتا ہے۔ کتابیں خصوصاً انگریزی ناول پڑھنا بھی اسے پسند ہے۔ فارغ وقت میں نیشنل جیوگرافک اور ڈسکوری چینل سے بھی معلومات اکٹھی کرتا ہے۔ دن کا کچھ وقت دوستوں کے لیے بھی نکال لیتا ہے۔

شایان کا چھوٹا بھائی ابتسام ۱۳ سال کا ہے۔ یہ بھی ایک باصلاحیت بچہ ہے۔ اسے ویڈیو ڈاکومینٹری بنانے کا شوق ہے۔ اگر اس نوجوان کی مناسب راہنمائی کی جائے تو یہ وطن عزیز میں آئی ٹی کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

پچھلے دنوں شایان اپنے والد، والدہ اور بھائی کے ساتھ اُردو ڈائجسٹ کے آفس آیا اور کئی گھنٹے ایڈیٹر صاحب اور ٹیم کے ساتھ گزارے۔ اُسے اپنی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ ذمے داری کا بھی خوب احساس ہے کہ کامیابی حاصل کرنا آسان ہے مگر اسے قائم رکھنا مشکل مگر قابلِ فخر ہوتا ہے۔

پاکستانی ماہرین کا ایک اور کارنامہ

پاکستان نے ۲۵؍اپریل ۲۰۱۲ء کی صبح درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل حتف چہارم شاہین ون اے ویپن سسٹم کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ میزائل شاہین کی جدید شکل ہے جسے رینج میں اضافے اور ٹیکنیکل پیرامیٹرز کو بہتر بنا کر تیار کیا گیا ہے۔

یہ میزائل روایتی اور جوہری، دونوں قسم کے وار ہیڈز کو ہدف تک لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میزائل نے سمندر میں اپنے ہدف کو کامیابی سے نشانہ بنایا۔ اس تجربے سے پاکستان کی دفاعی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

۲۸؍ممالک کے لیے روس کا پاکستانی سفیر

ملک کے ممتاز تعلیمی ادارے زیبسٹ میں ایم بی اے کے طالب علم جہانگیر اکرم کو روس کی طرف سے نوجوانوں سے متعلق ایشیا کے ۲۸؍ممالک کے لیے اعزازی سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جہانگیر اکرم نے بتایا کہ ۹؍جولائی ۲۰۱۱ء کو روس کے شہر سلیگر میں ۸؍روزہ یوتھ کنونشن ہوا تھا جس میں ۸۰؍ممالک کے نوجوان طلبہ شریک ہوئے۔ پاکستان کی طرف سے ۲؍طلبہ اور برطانوی نژاد ۲؍پاکستانی طلبہ نے بھی برطانیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔ سیمینار میں شریک ۴۰۰؍طلبہ کے علمی اور ذہنی استعداد کے مختلف ٹیسٹ ہوئے اور اس کی روشنی میں روس کی جانب سے ۷؍بہترین نوجوانوں کا انتخاب کرتے ہوئے اُنھیں دنیا کے ۷؍خطوں کے لیے اعزازی سفیر منتخب کیا گیا۔ اس میں ایشیا کے ۲۸؍ممالک کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

دُودھ کی پیداوار ۳؍گنا سے ۹۰۰؍فیصد تک بڑھنے کا امکان

پاکستان میں قدرتی وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کمی صرف پلاننگ اور غور و فکر کرنے کی ہے۔ اب آپ دودھ کی مثال لے لیں۔ ڈچ سفارتکاروں ین فن رینالارا اور مارکو ہولٹ نے کہا ہے کہ پاکستان بآسانی دودھ کی پیداوار میں ۳؍گنا اضافہ کر سکتا ہے جبکہ جدید طریقے اختیار کر کے موجودہ پیداوار میں ۹۰۰؍فیصد اضافہ ممکن ہے۔

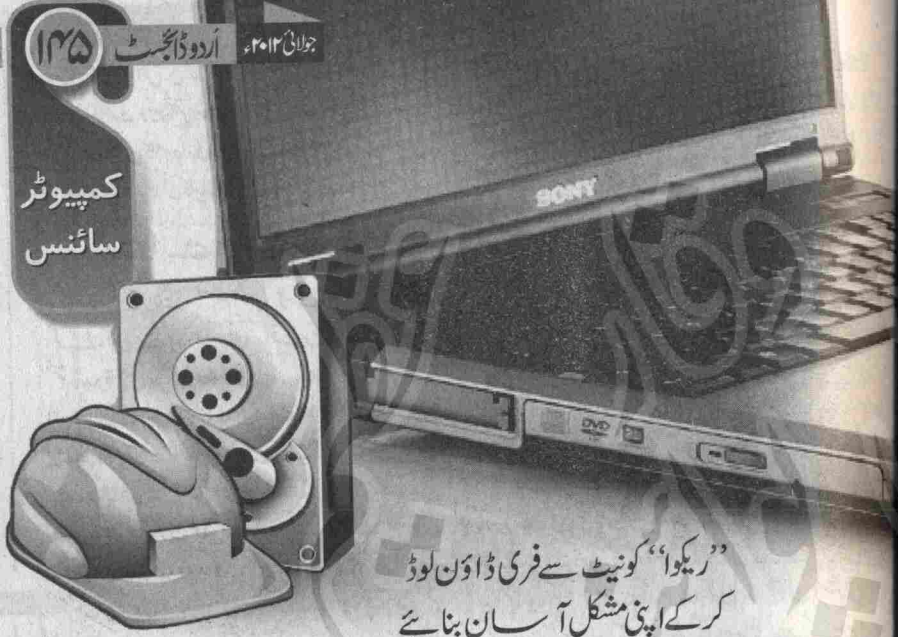

’’ریکوا‘‘ کو نیٹ سے فری ڈاؤن لوڈ کر کے اپنی مشکل آسان بنائیے

ختم شدہ فائلیں دوبارہ حاصل کریں

صغیر عباس

کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے کبھی کبھی حادثاتی طور پر کوئی فائل یا فائلیں ختم (ڈیلیٹ) ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے، تب انسان کو خاصی پریشانی ہوتی ہے اور اگر وہ فائل بہت اہم ہو، مثلاً اسی پہ آپ کی ملازمت یا کاروبار کا دارومدار ہو، تو تشویش عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

خوش قسمتی سے ایسے سافٹ ویئر موجود ہیں جن کی مدد سے ختم شدہ فائلیں ہارڈ ڈسک سے حاصل کرنا ممکن ہے۔ ختم شدہ فائلیں حاصل کرنے والے بیشتر سافٹ ویئر انٹرنیٹ پر قیمتاً دستیاب ہیں۔ تاہم ایک جدید ترین سافٹ ویئر، ریکوا (Recuva) آپ نیٹ سے مفت ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

ریکوا کی خصوصیات و خامیاں بتانے سے قبل یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ غلطی سے کوئی اہم فائل ختم کر بیٹھے ہیں، تو اپنا کام فوراً روک دیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک فائل ختم ہو کر بھی تب تک ہارڈ ڈسک میں محفوظ رہتی ہے، جب تک

دوسری فائلیں اس کی جگہ نہ لے لیں۔ ایسی صورت میں بذریعہ سافٹ ویئر ختم شدہ اہم فائل کو حاصل کرنا تقریباً یقینی ہے۔ لیکن کام جاری رکھا جائے اور مزید فائلیں ختم کی جائیں تو مطلوبہ فائل کا پانا مسئلہ بن جاتا ہے۔

ریکوا سے فائدہ اٹھائیے

ونڈوز آپریٹنگ سسٹم جس ڈسک کو بھی شناخت کرلے، اس سے بذریعہ ریکوا سافٹ ویئر مختلف اقسام کی ختم شدہ فائلیں حاصل کرنا ممکن ہے۔ عام طور پر ہارڈ ڈسک این ٹی ایف ایس (NTFS)، فیٹ (FAT) یا ایکس فیٹ (ExFAT) نظام استعمال کرکے قابل استعمال ہوتی ہے۔ ریکوا ان تینوں نظاموں کے سلسلے میں کام دیتا ہے۔

ریکوا کو ڈاؤن لوڈ کرنا آسان ہے۔ اسے استعمال کرتے ہوئے بھی پیچیدگیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا انٹرفیس یا مجموعی ڈیزائن بھی پُرکشش ہے۔ چنانچہ جب ختم شدہ فائل دوبارہ پانے کی جستجو میں آپ ذہنی اذیت میں مبتلا ہوں، تو ریکوا آپ کا کام آسان بنادیتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ جب ریکوا کا تجربہ کیا گیا، تو اس نے قیمتاً دستیاب سافٹ ویئر کے مانند تو کارکردگی نہیں دکھائی اور نہ ہی ساری ختم شدہ فائلیں سامنے لے کر آیا۔ مگر ایک مفت پروگرام کو دیکھتے ہوئے اس کی کارکردگی ماہرین کی توقع سے بڑھ کر رہی۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اگر بنانے والی کمپنی اس سافٹ ویئر کی تھوڑی بہت قیمت بھی لے، تو جائز ہے۔ گویا ختم شدہ فائلیں ازسرِنو حاصل کرنے میں فی الوقت یہ دنیائے انٹرنیٹ میں دستیاب مفت پروگراموں میں سب سے بہتر ہے۔

ریکوا ۲۱ اقسام یا ورژنز میں دستیاب ہے۔ ایک ورژن تو ہارڈ ڈسک میں انسٹال ہوتا ہے۔ ختم شدہ فائلیں حاصل کرنی ہوں، تو اس کا پہلے سے انسٹال ہونا ضروری ہے۔ بعد میں انسٹال کیا جائے، تو خطرہ رہتا ہے کہ مطلوبہ ختم شدہ فائلیں ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔

دوسرا ورژن بیرونی ہارڈ ڈسک یا یو ایس بی (USB) میں انسٹال ہوتا ہے۔ اس ورژن کی خوبی یہ ہے کہ اگر اسے فائلیں ختم ہونے کے بعد بھی انسٹال کیا جائے، تو کوئی خطرہ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ یہ ہارڈ ڈسک میں نئی فائلیں نہیں بھرتا یعنی اُسے اوورائٹ نہیں کرتا۔

سافٹ ویئر کا طریقِ کار

ریکوا کے دونوں ورژنز کا طریق کار ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے سافٹ ویئر آپ سے یہ دریافت کرتا ہے کہ کیا آپ ختم شدہ مخصوص فائلیں تلاش کرنا چاہتے ہیں، مثلاً تصاویر، گانے، ای میل وغیرہ یا پھر آپ کی خواہش ہے کہ ہارڈ ڈسک میں موجود تمام ختم شدہ فائلیں حاصل کی جائیں؟

جب یہ فیصلہ ہو چکے تو پھر آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہارڈ ڈسک کی کوئی پارٹیشن یا حصہ سافٹ ویئر اسکین کرے، یا چاہتے ہیں کہ وہ پوری ہارڈ ڈسک کھنگال مارے۔ آخر میں یہ انتخاب کرنا ہوتا ہے کہ ریکوا کون سا آپشن استعمال کرے۔ ''کوئیک اسکین'' جلد ختم ہوجاتا ہے جبکہ دوسرا آپشن ''ڈیپ اسکین'' کا ہے۔

کوئیک اسکین کے نام سے ظاہر ہے کہ اس طریق کار میں ریکوا جلد فائلیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جبکہ ہارڈ ڈسک بڑی ہو، مثلاً کئی جی بی (گیگا بائٹس) کی تو ڈیپ اسکین میں ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے۔ اس ضمن میں ماہرین کی تجویز ہے کہ اگر کوئک اسکین والے طریقے سے مطلوبہ فائل یا فائلیں نہ ملیں تو ڈیپ اسکین استعمال کریں۔

جب ہر دو قسم کے اسکین مکمل ہوجائیں، تو مرکزی ونڈوز میں ختم شدہ فائلوں کی فہرست آجاتی ہے۔ اگر آپ اس فہرست پر رائٹ کلک کریں، تو وہ تھمب ویو میں آجائے گی۔ یوں فائلوں کو دیکھنا آسان ہوتا ہے۔ فائل کے ساتھ سبز، زرد یا سرخ نشان لگا ہوتا ہے۔ دراصل یہ نشان عیاں کرتے ہیں کہ فائل قابل تجدید ہے، شاید قابل تجدید نہیں؛ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس موقع پر آپ وہ فائل منتخب کریں جسے دوبارہ پانا چاہتے ہیں۔ پھر ''ریکوا'' بٹن پر کلک کیجیے اور سافٹ ویئر کو بتائیے کہ آپ قابل تجدید فائلیں کمپیوٹر میں کس جگہ محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سافٹ ویئر سی ڈی میں فائلیں محفوظ نہیں کرسکتا۔

یاد رکھنے کی باتیں

پروگرام بڑی خوبی سے اپنا کام انجام دیتا ہے لیکن اسے استعمال کرتے ہوئے ماہرین کو چند انوکھی باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ سافٹ ویئر جس فائل پر سرخ نشان لگادے، وہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ریکوا ان نئی فائلوں کو قابل تجدید قرار نہیں دیتا جن کی پرانی نقول ہارڈ ڈسک میں محفوظ ہوتی ہیں۔

چنانچہ اگر آپ کی مطلوبہ فائل/ فائلوں میں سرخ نشان لگ جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ پروگرام کے انٹرفیس میں وہ بٹن تلاش کریں جو کہتا ہے کہ ''ایڈوانس موڈ میں سوئچ'' کرجائیں۔ اس موڈ میں جا کر پھر معاینہ جاتی (انسپکٹر) پینل میں ہر فائل کا بغور مطالعہ کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ یہ طریق کار اختیار کرنے پر ایسی کئی فائلیں بازیاب (retrieve) ہوسکتی ہیں جنھیں پروگرام پہلے ناقابل تجدید بتاتا ہے۔

ریکوا کی ایک اور خاصیت

یہ سافٹ ویئر صرف ختم شدہ فائلیں ہی ہارڈ ڈسک سے حاصل نہیں کرتا، بلکہ مخالف کام بھی انجام دیتا ہے۔ یعنی اگر آپ نے کوئی فائل ختم کرنی ہو، تو وہ اسے اس طریقے سے ڈیلیٹ کرتا ہے کہ پھر حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ پروگرام کے مینو میں فائل ڈیلیٹ کرنے کے سلسلے میں مختلف آپشن دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر سنگل پاس یا اوورائٹنگ آپشن۔ یہ طریقہ اپنا کر آپ فائل کو یوں ختم کرسکتے ہیں کہ کمپیوٹر پر آنے والا کوئی بھی اُسے دریافت نہیں کرسکتا۔

ایک اور آپشن کے ذریعے پروگرام ڈیٹا یا فائل کو تین یا سات بار اوورائیٹ (overwrite) کردیتا ہے۔ ایسی صورت میں ایف بی آئی یا سی آئی اے کے تجربہ کار ماہرین بھی جدید ترین آلات کے باوجود ختم شدہ فائل حاصل نہیں کرسکتے۔ غرض ریکوا سافٹ ویئر گھریلو کمپیوٹر کے لیے بڑا کارآمد ہے اور وہ اپنی خدمات مفت انجام دیتا ہے۔ اس کے ذریعے کیمرے کی ہارڈ ڈسک سے بھی گمشدہ ڈیٹا حاصل کرنا ممکن ہے۔

لیکن اگر آپ کاروبار یا دکان چلاتے ہیں، تو بہتر ہے کہ قیمتاً ملنے والا کوئی سافٹ ویئر مثلاً ڈسک انٹرنل (Disk Internal) اپنے کمپیوٹروں میں انسٹال کریں۔ وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ریکوا ایسی ختم شدہ فائلیں حاصل نہیں کرپاتا جن کے باعث رقم ضائع ہوسکتی ہو یا آپ گاہک کھو سکتے ہیں۔ چنانچہ بہتر ہے کہ کچھ رقم خرچ کرکے زیادہ طاقتور سافٹ ویئر خرید لیا جائے۔

انسٹا کیمرہ

(نیا سوشل نیٹ ورک)

انسٹاگرام کو یہ شہرت حاصل ہے کہ اُس کے فون اور کیمرے دنیا بھر میں اپنی انفرادیت کے باعث پسند کیے جاتے ہیں۔ سمارٹ فون ہو یا کیمرہ خریدار کے لیے سب سے پہلی چوائس انسٹاگرام ہی ہوتی ہے۔

انسٹا کیمرے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا استعمال انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ اس میں کوئی پیچیدہ یا مشکل فیچرز نہیں ہیں۔ یہ صرف ایک کیمرہ ہی نہیں بلکہ ایک سوشل نیٹ ورک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا استعمال انتہائی آسان ہے۔ تصویر کھینچنے والے کو صرف یہ کرنا ہے کہ تصویر بنائے۔ اس تصویر پر اپنی پسند کا مخصوص ایفکٹ لگائے۔ لیجیے آپ کی تصویر تیار ہے۔ اب آپ اُس کو اپنے پسندیدہ سوشل نیٹ ورک پر پیسٹ کریں یا انسٹاگرام کے اپنے سرور پر تصویر کو شیئر کریں۔ انسٹاگرام جدید ٹیکنالوجی کو بہترین طریقے سے استعمال کرکے اس کی افادیت بڑھا رہا ہے۔

(فہر علی حسین، محمد فلیح حسین)

روح فرسا انکشافات

پاکستانی نظامِ کرپشن کے اسرار و رموز

موجودہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ۴ رسال میں ۸۵۰۰/ارب کی کرپشن ہے

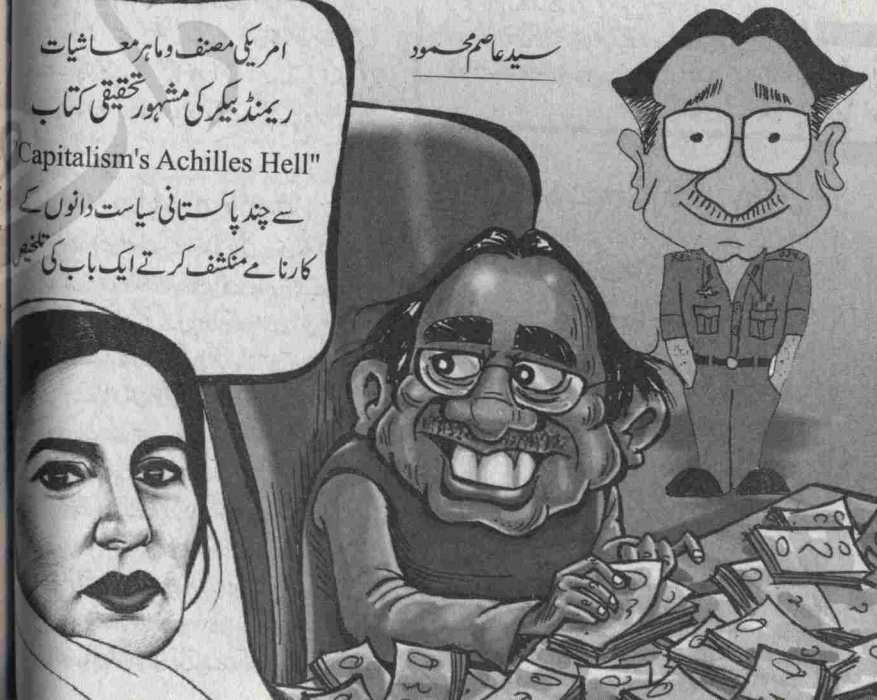

سید عاصم محمود

یہ اواخر اپریل ۲۰۱۲ء کی بات ہے، روزنامہ جنگ میں جناب ڈاکٹر عبدالقدیر کا کالم ''اس حمام میں سب ننگے ہیں'' نظر سے گزرا۔ موضوعِ کالم وہ پاکستانی حکمران تھے جنھوں نے مختلف ''گُر'' آزما کر قومی خزانے پر ڈاکے ڈالے اور کھربوں روپے لوٹ لیے۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک کتاب ''Capitalism's Achilles Heel'' (یعنی سرمایہ داری کا سب سے کمزور مقام) سے حوالے دیے جو ایک امریکی مصنف و ماہر معاشیات ریمنڈ بیکر کی تحقیقی تصنیف ہے۔ ذیل میں اسی کتاب سے پاکستانی حکمرانوں کے ''کارنامے'' بیان کرنے والا باب پیش ہے۔ واضح رہے، یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں طبع ہوئی تھی۔

چونکہ وطن عزیز میں جلد ہی انتخابات ہونے والے ہیں لہٰذا بہتر ہے کہ ماضی ذرا تازہ ہو جائے تاکہ یہ عمل پاکستانیوں کو باشعور بنا سکے۔ ورنہ ایک بار پھر آزمائے ہوئے کھوٹے سکے برسرِ اقتدار آگئے تو پاکستان بدستور کرپشن کے جال میں پھنسا رہے گا۔ گو پچھلے دس برس میں میڈیا آزاد اور طاقتور ہونے کی بدولت پاکستانی نیک و بد میں تمیز جان گئے، لیکن ابھی انھیں مزید باشعور بنانے کی ضرورت ہے۔

کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے کہ میڈیا کے اس قدر طاقتور ہونے کے باوجود کیا ہمارے ہاں کرپشن اسی طرح دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتی رہے گی اور کبھی اس کا جنازہ نہ نکل سکے گا۔

ماہ فروری میں ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل پاکستان نے یہ روح فرسا انکشاف کیا تھا کہ موجودہ حکومت نے پچھلے چار برس کے دوران ''۸۵۰۰ ارب روپے'' کی کرپشن کر کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ بے ایمانی کے خلاف مصروفِ جہاد اس ادارے کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر پاکستان سے کرپشن ختم ہو جائے، تو بیرون ممالک سے بشکل امداد یا قرض ایک پیسا لینے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات تعجب خیز ہی ہے کہ ہم پاکستانی کرپٹ سیاست دانوں کو دوبارہ ایوانِ اقتدار میں پہنچا دیتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ پاکستانی سیاست اصول و نظریات سے زیادہ روپے پیسے، برادری ازم اور دھونس دھاندلی کے گرد گھومتی ہے۔ اگر وطن عزیز میں تعلیم عام ہو جائے، تو باکردار، دیانت دار اور محبِ وطن سیاست دانوں کو نمایاں ہونے میں مدد ملے گی۔ شعور بڑھانے کا عمل بھی یہ کام انجام دیتا ہے۔ چنانچہ کتاب کا متن اسی لیے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب نیٹ پر بھی دستیاب ہے لہٰذا مضمون میں حوالے و اسناد نہیں دی گئیں، وہ کتاب میں درج ہیں۔

متنِ کتاب پیش کرنے سے قبل یہ ملحوظ خاطر رہے کہ پاکستان میں کرپشن کا آغاز ۱۹۴۷ء میں مکانوں اور زمینوں کی الاٹمنٹ سے شروع ہوا۔ تاہم یہ کرپشن نچلے طبقے تک محدود تھی، بیشتر سیاست دان اور اعلیٰ سرکاری افسر زر و زمین کی ہوس سے دور تھے۔ پھر آہستہ آہستہ مادہ پرستی کے جراثیم نظامِ حکومت میں داخل ہوئے اور اُسے گلانے سڑانے لگے۔ شروع میں امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس ان کا نشانہ بنے۔ پھر جو تباہی مچی اس کے آثار ۱۹۸۸ء سے نمایاں ہوئے جب بے نظیر بھٹو نے حکومت سنبھالی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ریمنڈ بیکر نے تحقیق کے بعد پاکستانی نظامِ کرپشن کے کیسے اسرار و رموز افشا کیے ہیں۔

☆☆☆

پاکستان میں کرپشن کا دور دورہ ہے۔ خصوصاً پاکستانی سیاست تو سرتاپا اس سے لتھڑی ہوئی ہے۔ جو بھی حکمران آتا ہے وہ مختلف خفیہ و عیاں طریقے اختیار کر کے قومی خزانہ لوٹتا اور لوٹی ہوئی دولت اپنے اکاؤنٹس میں جمع کرا دیتا ہے۔ بینک بھی تعلقات اور اثر و رسوخ دیکھ کر طبقہ بالا کو قرضے دیتے ہیں۔ قرضے لینے والے رقم کھاتے یا باہر لے جاتے ہیں اور انھیں واپس کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ دوسری طرف قانون صرف غریب کے لیے ہے اور اسی کو شکنجے میں کستا ہے۔ اسی تفاوت کے باعث کئی غریب انتقاماً دہشت گرد بن گئے اور حکومت کے خلاف

پچھلے ۳۵ برسوں میں قومی خزانے کو ۱۰۰ ارب ڈالر (۵۴ تا ۹۰ کھرب) تک کی کرپشن کا سامنا کرنا پڑا ہے

کارروائیاں کرنے لگے۔

برصغیر میں قومی خزانے کی لوٹ مار کا آغاز برصغیر میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے قدرتی وسائل جی بھر کے لوٹے اور انگلستان بھجوا دیے۔ پاکستان کے چالاک اور امیر نئے حکمران انہی کے چیلے ہیں، انھوں نے بھی قومی قدرتی وسائل بڑی مہارت سے لوٹے اور بیرون ممالک لے گئے جہاں وہ بینکوں میں یا جائیداد کی صورت ''محفوظ'' ہیں۔

۱۹۸۸ء کے بعد سیاست دانوں اور افسر شاہی کا یہ فیشن بن گیا کہ لمبی چوڑی رشوتیں لو اور انھیں ذاتی اکاؤنٹس میں جمع کرا دو۔ ایک اندازے کے مطابق پچھلے پینتیس برس کے دوران پاکستان کا قومی خزانہ کرپشن کی وجہ سے ۶۰ تا ۱۰۰ ارب ڈالر (۵۴ کھرب ۶۰ ارب روپے تا ۹۰ کھرب ۱۰ ارب روپے) سے محروم ہوگیا۔

پچھلے پینتیس برس میں پاکستان پر دو خانوادے، بھٹو اور شریف خاندان حکمرانی کرتے رہے۔ جہاں تک قومی معیشت کی تباہی کا معاملہ ہے، ان میں زیادہ فرق نہیں۔ بے نظیر بھٹو نے پہلی بار ۱۹۸۸ء میں اقتدار سنبھالا۔ ۱۹۹۰ء میں کرپشن اور اقربا پروری کے الزامات پر ان کی حکومت ختم ہوئی۔ ۱۹۹۳ء میں پھر حکومت میں آئیں۔ ۱۹۹۶ء میں کرپشن کے مزید الزامات نے دوبارہ ان کی حکومت برطرف کرا دی۔ دونوں ادوار دیکھے جائیں تو بے نظیر اور ان کے شوہر، آصف علی زرداری ''ورلڈ کلاس'' لٹیروں کی صورت نمایاں ہوتے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں اقتدار سنبھالتے ہی بے نظیر نے اپنی پارٹی کے چھتیس ہزار کارکن مختلف سرکاری محکموں بشمول قومی بینکوں میں بھرتی کرا دیے۔ اس کے بعد اصول و ضابطے کو کارروائی کے بغیر قومی خزانہ لٹانے کا وحشیانہ رقص شروع ہوگیا۔ سرکاری ذرائع بتاتے ہیں کہ بے نظیر اور زرداری نے ۵۰ منصوبوں کے لیے اربوں روپے قرضہ دیا۔ مگر یہ منصوبے میاں بیوی کے کارندوں (Frontmen) نے شروع کیے تھے۔ چنانچہ حقیقتاً سارا روپیہ بے نظیر اور زرداری ہی کو ملا۔ ایک موقع پر مسٹر زرداری نے کہا ''تیسری دنیا میں ایسے قرضے دینا عام ہے تاکہ ملک میں صنعتی ترقی انجام پا سکے۔''

زرداری نے پھر ہاتھ آئی دولت سے دو شوگر ملوں کے حصص چالیس کروڑ اکیس لاکھ روپے میں خریدے۔ یہ سودا بھی کارندوں کے توسط ہی سے انجام پایا۔ نیشنل پاکستان اسٹیل مل بھی انہی کے ایجنٹ چلا رہے تھے۔ چنانچہ ایک سودے میں انھیں چار کروڑ روپے بطور کمیشن (کک بیک) ملے۔ سرکاری منصوبوں میں کھلے عام کمیشن لینے کے باعث زرداری پاکستان میں ''مسٹر فائیو (۵) ٹین (۱۰) اور تھرٹی (۳۰) پرسنٹ کے القابات سے مشہور ہوئے اور جب دوسری حکومت میں بے نظیر نے انھیں وزیر سرمایہ کاری مقرر کیا، تو انھوں نے ''۱۰۰ پرسنٹ'' خطاب پایا۔

کوٹکینا کا گھپلا

حکومت پاکستان کو کسٹمز ڈیوٹی سے بہت آمدن ہوتی ہے، چنانچہ کرپٹ پاکستانی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان سے بچا جائے۔ اب بے نظیر اور زرداری نے سوچا کہ کمائی کے اس قومی ذریعہ سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کا طریق واردات انھوں نے یہ ڈھونڈا کہ کرپشن کے خلاف جنگ کی جائے اور ساتھ ساتھ مال کمایا جائے۔

ہوا یہ کہ بھٹو حکومت نے سوئٹزرلینڈ کی ایک

(انسپیکشن) کمپنی، کوٹکینا کو یہ ٹھیکہ دیا کہ وہ کسٹمز ڈیوٹی ادا نہ کرنے والوں کو پکڑنے کا کام انجام دے۔ کوٹکینا اس زمانے میں شعبہ صنعت وتجارت اور کاروبار میں پڑتال کرنے والی سب سے بڑی کمپنی اور درحقیقت ایک سوئس گروپ ایس جی ایس (سوسائٹی جنرل ڈی سرویلائنس) سے تعلق رکھتی تھی۔

یہ ٹھیکہ ایس جی ایس کو اس لیے ملا کہ گروپ نے بے نظیر اور زرداری کو کمیشن دینے کا یقین دلایا تھا۔ چنانچہ ۱۹۹۴ء میں گروپ نے انھیں خط لکھا کہ وہ ''مشاورتی فیس'' (یعنی کمیشن) برٹش ورجن آئی لینڈ کی دو کمپنیوں بومبر فنانسر اور ناسام اوورسیز کے نام ادا کر دے گا۔ ان دونوں کمپنیوں کے مالکان بے نظیر وزرداری تھے۔

چنانچہ ۱۲ ملین ڈالر (ایک ارب نو کروڑ روپے) کی خطیر رقم دونوں کمپنیوں کے سوئس اکاؤنٹس میں جمع کروا دی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایس جی ایس نے دیگر ممالک میں بھی ٹھیکے حاصل کرنے کی خاطر کثیر رقم بطور کمیشن ادا کی۔ بعدازاں جب بے نظیر بھٹو کا نام کوٹکینا اسکینڈل میں آیا، تو موصوفہ نے فرمایا ''میں نے پوری دیانت داری سے ملک چلایا۔ میں نے محنت اس لیے کی کہ مجھے سراہا جائے اور عوام سے پیار ملے۔''

پولینڈ ٹریکٹر

۱۹۹۴ء ہی میں بے نظیر حکومت نے تراسی ملین ڈالر (۷ ارب ۳۱ کروڑ روپے) کی لاگت سے ٹریکٹر درآمد کرنے کے لیے پولش کمپنی، ارسوس سے معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ بھی اسی لیے انجام پایا کہ ارسوس نے یہ ہامی بھری تھی کہ وہ معاہدے کی ۷ فیصد رقم بطور کمیشن دارگل ایسوسی ایٹڈ کو دے گا۔ کیریبین جزائر میں قائم یہ کمپنی بھی زرداری کی ملکیت تھی۔

پولینڈ سے ٹریکٹر منگوائے پھر کسٹم ڈیوٹی ختم کی اور سات فیصد کمیشن کی خاطر قومی خزانے کو ایک ارب ستر کروڑ کا نقصان پہنچایا

یوں اس معاہدے کے ذریعے بے نظیر و زرداری کو ۲۰۰ ملین ڈالر (۱۸ ارب، ۲۰ کروڑ روپے) کی خطیر رقم بطور کمیشن مل جاتی۔ لیکن ان کی بدقسمتی، اس سے پہلے کہ وہ رقم وصول کرتے، بے نظیر حکومت ہی ختم ہوگئی۔

بے نظیر حکومت نے ٹریکٹروں کی درآمد پر کسٹمز ڈیوٹیاں ختم کردیں۔ یوں اس نے قومی خزانے کو ایک ارب ۷۰ کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا۔ جب اس کرپشن کی اطلاع پولش حکومت کو ملی، تو وہاں چھان بین ہوئی۔ یہ تفتیش ۵۰۰ صفحات پر مشتمل دستاویز میں محفوظ ہے۔

فرانس کے جنگی طیارے

پولش ٹریکٹروں کا معاملہ محض ''وارم اپ'' میچ تھا۔ کچھ عرصے بعد امریکی حکومت نے ایف۔۱۶ جنگی طیاروں کے دو اسکواڈرن پاکستان کو دینے سے انکار کردیا۔ اب بے نظیر بھٹو حکومت نے کوششیں کیں کہ فرانس سے دسولت میراج طیارے خرید لیے جائیں۔ یہ ۴ ارب ڈالر (۳۲۵ ارب روپے) کا معاہدہ تھا۔

یہ معاہدہ بھی اسی لیے انجام پایا کہ میراج طیاروں سے متعلق تین فرانسیسی کمپنیوں دسولت ایوی ایشن، سنیکما (انجن بنانے والی کمپنی) اور تھامسن سی ایس ایف (ایوی ایشن الیکٹرونکس) نے ماریسٹون بزنس ایس اے کو معاہدے کی پانچ فیصد رقم بطور کمیشن دینے کی ہامی بھرلی تھی۔ برٹش ورجن آئی لینڈ میں واقع یہ کمپنی بھی زرداری کی ملکیت تھی۔

۳۲۶/ارب کے طیاروں کا معاہدہ ہو چکا تھا ۱۸/ارب ۲۰/کروڑ روپے بے نظیر و زرداری کو کمیشن ملنا تھا رقم وصول کرنے سے پہلے حکومت چلی گئی

دبئی کا سونا

تاہم قومی خزانے کے لٹیروں کو ''طلائی معاہدے'' سے خاصی رقم ہاتھ آگئی۔ برصغیر پاک و ہند میں سونے (Gold) کو خاص مقام حاصل ہے۔ کروڑوں مردوزن اِسے شوقیہ یا بطور سرمایہ کاری خریدتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق برصغیر میں ۱۰۰/ارب ڈالر کا سونا موجود ہے۔ سونے کی اسمگلنگ بھی زور شور سے ہوتی ہے۔

۱۹۹۴ء میں دبئی میں مقیم سونے کے پاکستانی تاجر، عبدالرزاق یعقوب نے بے نظیر بھٹو حکومت سے درخواست کی کہ سونے کی درآمد کا خصوصی لائسنس ان کی کمپنی، اے آر وائی انٹرنیشنل ایکس چینج کو دے دیا جائے۔ بظاہر موصوف سونے کے کاروبار کو اصول وضوابط کے تحت لانا چاہتے تھے۔ تاہم بے نظیر بھٹو و زرداری نے یہ لائسنس کمیشن لے کر عطا کیا۔

چنانچہ ۱۹۹۴ء میں برٹش ورجن آئی لینڈ میں ایم ایس کیپری کارن ٹریڈنگ کے نام سے زرداری کی ملکیتی ایک اور کمپنی کھولی گئی۔ کچھ عرصہ تک سوئٹزرلینڈ کے ایک وکیل، جینر شلے گیل مچ نے سٹی بینک کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا کہ مسٹر زرداری ایم ایس کیپری کارن ٹریڈنگ کے واحد مالک ہیں۔ نیز بینک مینیجر نے بھی وکیل سے کمپنی کے مالک کی بابت کچھ دریافت نہیں کیا۔

سٹی بینک، دبئی کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں عبدالرزاق یعقوب کی کمپنی نے زرداری کے درج بالا اکاؤنٹ میں ۱۰/ملین ڈالر (۹۱ کروڑ روپے) جمع کرائے۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں اے آر وائی انٹرنیشنل کو سونے کی درآمد کا خصوصی لائسنس مل گیا۔ اس لائسنس کے ذریعے پھر اگلے ۳/برس میں کمپنی نے ۵۰۰/ملین ڈالر (۴۵/ارب ۵۰/کروڑ روپے) کا سونا پاکستان درآمد کیا۔

اس دوران شلے گیل مچ نے سٹی بینک، سوئٹزرلینڈ میں بھی زرداری کے ۳/اکاؤنٹ کھلوا لیے۔ چنانچہ اگلے ۳/برس میں اے آر وائی انٹرنیشنل نے کمیشن کے ڈالر انہی میں جمع کرائے۔ ان اکاؤنٹس کی بالائی حد ۴۰/ملین ڈالر (۳/ارب ۶۴/کروڑ روپے) تھی جو جلد ہی آپہنچی۔

چھان بین کا آغاز

۱۹۹۵ء میں لندن کے پرائیویٹ سراغ رسانوں نے حزب اختلاف کی جماعت، مسلم لیگ کو پیش کش کی کہ وہ بے نظیر بھٹو اور زرداری کی کرپشن سے متعلق دستاویزی ثبوت انھیں دینے کو تیار ہیں۔ بدلے میں انھوں نے ایک کروڑ ڈالر (۹۱/کروڑ روپے) طلب کیے۔ تاہم تب یہ معاہدہ نہ ہوسکا۔

۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو حکومت ختم ہوئی، تو نئے انتخابات ہوئے جو مسلم لیگ نے جیت لیے۔ یوں جنوری ۱۹۹۷ء میں لیگی قائد، نواز شریف نئے وزیراعظم بن گئے۔ تب مسلم لیگی حکومت نے دس لاکھ ڈالر (۹/کروڑ ۱۰/لاکھ روپے) میں درج بالا دستاویز خرید لیں۔ پرائیویٹ سراغ رسانوں کا دعویٰ تھا کہ یہ دستاویزات انھوں نے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں شلے گیل مچ کے دفتر سے حاصل کی تھیں۔

ان دستاویزات کی بنیاد پر پھر بے نظیر بھٹو اور زرداری پہ قومی خزانہ لوٹنے کا الزام لگا اور ان کے خلاف قانونی کارروائی شروع ہوئی۔ ۱۹۹۹ء میں نواز حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں مشرف حکومت نے دستاویزات قومی احتساب بیورو کے سپرد کردیں۔ بیورو پھر دستاویزات منظرِعام پر لے آیا۔ تب انکشاف ہوا کہ میاں بیوی اندرون و بیرون ممالک کئی خفیہ جائیدادوں کے مالک ہیں، بینکوں میں ان کے درجنوں اکاؤنٹ ہیں اور انھوں نے بیسیوں کمپنیاں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

مشہور امریکی اخبار، نیویارک ٹائمز کے صحافیوں نے بھی ان دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے بعدازاں لکھا ''کرپشن کے دستاویزی ثبوت، خفیہ اداروں کے سربراہوں کے خطوط جن میں کمیشن دینے کا وعدہ کیا گیا، کمیشن کی رقومات کی تفصیل، ملاقاتوں کی تفصیل جن میں کمیشن کے معاملات طے پائے اور ان بیرون ممالک قائم فرضی کمپنیوں کے سرٹیفکیٹوں پر مشتمل ہیں جن کی بنیاد پر سارا کھیل کھیلا گیا۔''

انہی دستاویزات نے یہ انکشاف بھی کیا کہ بے نظیر بھٹو اور زرداری کو کرپشن کرتے ہوئے تمام مغربی اداروں کا بھرپور ''تعاون'' حاصل رہا۔ مثلاً یورپی کمپنیوں نے جوڑے کو منہ مانگا کمیشن دیا۔ پھر یورپی دوستوں نے بلاچون چرا مختلف جزائر میں ان کی جعلی کمپنیاں رجسٹر کرائیں۔ انہی نے پھر یورپی بینکوں میں جوڑے کے اکاؤنٹ کھولے۔ مزید براں یورپی بینکوں نے یہ دریافت کرنے کی زحمت نہیں کی کہ اکاؤنٹس کے مالکان کون ہیں اور ان میں رقم کہاں سے آرہی ہے۔ غرض یورپی دوستوں کا پورا نیٹ ورک لوٹ مار میں حکمران جوڑے کا مددگار رہا۔

سوئس حکومت کا اقدام

آخر سوئس حکومت کو کچھ خیال آیا اور ضمیر جاگا تو اس نے بے نظیر اور زرداری کے ۱۷/اکاؤنٹ منجمد کردیے۔ نیز ان پر منی لانڈرنگ کا الزام لگایا گیا اور یہ کہ انھوں نے ایس جی ایس سے کرپشن کی رقم لی۔ ۲۰۰۳ء میں سوئس عدالت میں یہ الزامات درست ثابت ہوئے۔

سوئس عدالت نے دونوں مجرموں کو قید اور جرمانے کی سزا سنائی۔ تاہم بے نظیر بھٹو اور زرداری نے اعلیٰ عدالت سے نظرثانی کی اپیل کی، تو اس نے معاملہ واپس سوئس تفتیش کنندگان کے پاس بھیج دیا۔ (اس دوران ۲۰۰۷ء میں مشرف حکومت نے ''این آر او'' متعارف کرادیا۔ چنانچہ سوئس عدالت میں بے نظیر اور زرداری کے خلاف تفتیش رک گئی جو ابھی تک منجمد ہے۔ حکومت پاکستان کے خط لکھنے پر ہی معاملہ آگے بڑھے گا۔

۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۴ء تک آصف علی زرداری نے مختلف مقدمات کے سلسلے میں قید کاٹی۔ اس دوران ان کی بیگم لندن اور دبئی میں مقیم رہیں اور انھوں نے خود کو مظلوم وستم رسیدہ عورت کی حیثیت سے نمایاں کیا۔ ان کا کہنا ہے ''میں نے کبھی اقتدار نہیں مانگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ پاکستانی قوم مجھے چاہتی ہے۔'' لیکن میرے خیال میں دنیا کے تمام معزول حکمرانوں میں بے نظیر ہی سب سے کم رحم وکرم کی مستحق ہیں۔

نواز شریف اقتدار میں

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے، جب میاں شریف نے کاروبار کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۲ء تک انھوں نے اچھا خاصا بڑا

اے آر وائی کو سونے کی درآمد کا لائسنس کمیشن لے کر دیا گیا۔ کمپنی نے تین برس میں ۵۰۰/ملین ڈالر (۴۵/ارب روپے) کا سونا درآمد کیا اور ۳/ارب ۶۴/کروڑ کمیشن زرداری صاحب کے اکاؤنٹس میں جمع کروایا

ادارہ بنالیا۔ تاہم اسی سال وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اُسے قومیا لیا۔ یوں بھٹو خاندان اور شریف خاندان کے مابین اختلافات کا آغاز ہوا۔

۱۹۸۰ء میں جنرل ضیا الحق نے شریف خاندان کو ان کا ادارہ، اتفاق برادرز واپس لوٹا دیا۔ بعدازاں اس خاندان کے چشم و چراغ، نواز شریف جرنیلوں سے تعلقات قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ پنجاب کے وزیر خزانہ بن گئے۔ انھوں نے سیاسی کامیابیاں تیزی سے حاصل کیں اور ۱۹۸۵ء میں پنجاب کے وزیراعلیٰ منتخب ہوئے۔ بعدازاں ۱۹۹۰ء میں وزیراعظم بھی بنے۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک نواز شریف خصوصاً پنجاب

میڈیا کے اِس قدر طاقتور ہونے کے باوجود اب کرپشن کا جنازہ نہ نکل سکے گا

میں سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ شروع میں ''اتفاق برادرز'' محض ایک فاؤنڈری کا مالک تھا۔ لیکن اگلے دس برس میں یہ ادارہ تیس کمپنیوں کا مالک بن گیا۔ یہ کمپنیاں اسٹیل، چینی، کاغذ اور ٹیکسٹائیل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی مجموعی آمدن ۴۰۰ملین ڈالر (۳۶/ارب ۴۰/کروڑ روپے) سالانہ تک پہنچ گئی۔ تیسری دنیا میں یہ دستور ہے کہ جو اقتدار تک پہنچے، وہ پھر جو چاہے کرسکتا ہے۔

موٹروے اور پیلی ٹیکسیاں

۱۹۹۰ء میں وزیراعظم بن کر نواز شریف نے لاہور تا اسلام آباد موٹروے بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس پر ۸ء۵/ارب روپے خرچ ہونے تھے۔ موٹروے کی تعمیر کے سلسلے میں جنوبی کوریا کے گروپ، ڈائیوو کو ٹھیکہ دیا گیا۔ اس نے ۲۰/ارب روپے میں یہ منصوبہ مکمل کیا۔

نواز شریف حکومت نے پھر ''پیلی ٹیکسی منصوبہ'' شروع کیا۔ اس ضمن میں ۵۰/ہزار گاڑیاں ڈیوٹی فری منگوائیں۔ یوں قومی خزانہ ڈیوٹیوں کی مد میں ۷۰۰/ملین ڈالر (۷/ارب ۷۰/کروڑ روپے) کی خطیر رقم سے محروم ہوگیا۔

بعدازاں بینکوں کو مجبور کیا گیا کہ جو شخص کل قیمت کا ۱۰/فیصد جمع کرادے، وہ اُسے پیلی ٹیکسی خریدنے کے لیے قرضہ فراہم کریں۔ خرید کنندہ نے پھر یہ رقم بصورت اقساط جمع کرانی تھی۔ لیکن ٹیکسی لینے والوں میں سے ''۶۰/فیصد'' نے اقساط جمع نہیں کرائیں۔ چنانچہ بینکوں کے ۱۰۰/ملین ڈالر (۵۰/ارب ۵۰/کروڑ روپے) کے قرضے پھنس گئے۔

نواز شریف حکومت کے دونوں ادوار میں کرپٹ پاکستانی امرا وسیع پیمانے پر بینکوں سے قرضے لیتے رہے۔ دوسری طرف ٹیکسوں کی رقم چوری کرنا ان کا وتیرہ رہا۔

۱۹۹۹ء میں جب مشرف حکومت نے نادہندگان کی فہرست شائع کی، تو انھوں نے ۴/ارب ڈالر (۳۶۴/ارب روپے) میں سے ۳/ارب ڈالر (۲۷۳/ارب روپے) بینکوں کے لوٹانے تھے۔ فہرست کی رو سے شریف خاندان ۶۰/ملین ڈالر (۵/ارب ۴۶/کروڑ روپے) کا نادہندہ تھا۔

۱۹۹۳ء میں جب نواز شریف کی پہلی حکومت ختم ہوئی، تو اتفاق گروپ دیوالیہ ہوگیا۔ اس وقت گروپ کی صرف تین کمپنیاں کام کر رہی تھیں۔ بقیہ کمپنیوں پر تقریباً ۷ء۵/ارب روپے کا قرضہ چڑھ چکا تھا۔

بینظیر و زرداری کے مانند شریف خاندان نے بھی بیرون ممالک (آف شور) کمپنیاں کھولیں۔ ان میں سے ۳/نیسکول، نیلسن اور شام روک برٹش ورجن آئی لینڈز میں کھولی گئیں۔ جبکہ ایک کمپنی، چینڈرون جرسی پرائیویٹ لمیٹڈ چینل آئی لینڈز میں کھولی گئی۔ انھی بیرونی کمپنیوں کی مدد سے شریف خاندان نے پھر پارک لین، لندن میں ۴/عالی شان فلیٹ خریدے جو مختلف ادوار میں ان کے زیرِ استعمال رہے۔

ایف بی آئی کی تحقیقات

۱۹۹۴ء میں بینظیر بھٹو نے ایف بی آئی کو یہ مہم سونپی کہ وہ نواز شریف حکومت کی کرپشن کا کھوج لگائے۔ اس مہم کے سربراہ ایف بی آئی کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل رحمان ملک تھے۔ موصوف تب تک رمزی یوسف کو گرفتار کرا کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ (رمزی یوسف نے ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر بم دھماکوں سے اڑانے کی کوشش کی تھی)۔

۱۹۹۷ء میں نواز شریف برسراقتدار آئے، تو رحمٰن ملک کی تفتیش رک گئی۔ وہ پھر ایک سال جیل میں رہے۔ جب اُن پر قاتلانہ حملہ ہوا، تو وہ لندن فرار ہوگئے۔ ۱۹۹۸ء میں لندن ہی سے انھوں نے پھر اپنی تفتیشی رپورٹ شائع کی جس کے خاص نکات درج ذیل ہیں:

☆ موٹروے کی تعمیر کے دوران ڈائیوو گروپ سے نواز شریف حکومت نے ۱۶۰/ملین ڈالر (۱۴/ارب ۵۶/کروڑ روپے) کا کمیشن کھایا۔

☆ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے قومی بینکوں سے ۱۴۰/ملین ڈالر (۱۲/ارب ۷۴/کروڑ روپے) کے قرضے لیے جو واپس نہ ہوئے۔

☆ نواز شریف اور ان کے کاروباری ساتھیوں کی ملکیت شوگر ملوں نے مختلف سرکاری ٹیکس نہ دے کر ۶۰/ملین ڈالر (۵/ارب ۴۶/کروڑ روپے) بچائے۔

☆ امریکا اور آسٹریلیا سے گندم درآمد کرکے اس سودے میں ۵۸/ملین ڈالر (۵/ارب ۳۶/کروڑ روپے) کمائے گئے۔

رحمان ملک کی تفتیشی رپورٹ میں سرکاری دستاویزات، سرکاری افسروں کے دستخطی بیان، بینکوں کی فائلیں، جائیداد کا ریکارڈ اور منصوبوں کی تفصیلات شامل ہیں۔

اردو ڈائجسٹ

خطرناک صورتِ حال

تانگے اور کار کے حادثے کے بعد تانگے والے نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ اسے کار والے سے تانگا توڑنے، گھوڑے کو مارنے اور اسے زخمی کرنے کا معاوضہ دلایا جائے۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ حادثے کے بعد تم نے کار کے مالک سے زخمی نہ ہونے کا اعتراف کیا تھا؟'' جج نے کہا۔

''میں اعتراف کرنے پر مجبور تھا جناب عالی!''

''تمھیں کس نے مجبور کیا تھا؟'' جج نے پوچھا۔

''میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں جی۔'' تانگے والے نے کہا ''جب حادثہ ہوا تو کار والا اپنی گاڑی سے ریوالور لیے نکلا، اس نے ایک نظر زخمی گھوڑے پر ڈالی اور بولا مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر اس نے تڑ تڑ ۳/فائر کیے اور گھوڑے کو مار دیا۔ پھر اس کے بعد مجھ سے بولا کیا تم بھی زخمی ہو گئے ہو؟ آپ ہی بتائیں جنابِ عالی! اس خطرناک صورت حال میں اگر زخمی نہ ہونے کا اعتراف نہ کرتا تو کیا کرتا؟''

(رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

خاتمۂ کلام

ریمنڈ بیکر نے پاکستانی افواج کو بھی کرپشن کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ انھیں غلط فہمی یوں ہوئی کہ پاک افواج کئی صنعتی اداروں مثلاً فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، شاہین کمپلیکس وغیرہ کی مالک ہے۔ لیکن سیاست دانوں کے کاروباری گروپوں اور پاک افواج کے اداروں میں فرق یہ ہے کہ آخرالذکر قومی معیشت کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہیں۔ نیز ان سے لاکھوں پاکستانیوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ظاہر ہے، سبھی جرنیل فرشتے نہیں ہوتے، لیکن مجموعی طور پر پاک فوج کرپشن سے محفوظ قومی ادارہ ہے۔

اگر پاکستان پیپلز پارٹی یا مسلم لیگ (ن) کے ترجمان ریمنڈ بیکر کی بیان کردہ تفصیل سے اختلاف رکھتے ہیں، تو انھیں اپنا مؤقف بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ مؤقف ٹھوس ثبوتوں اور حقائق پر مبنی ہوا تو اُسے شائع کیا جا سکتا ہے۔

سانحۂ گیاری

وہ جب تک زندہ تھے، وعدے اُن میں سانس لیتے تھے

میجر عاطف مصطفیٰ قریشی

سانس لیتے وعدے

جانے والوں نے سارے وعدے بھلا کر اپنے رب سے کیا وعدہ نبھا دیا

گیاری میں مقیم اُن پیاروں کا تذکرہ، جن کے دل، فون اور لفظ اپنے پیاروں کی محبت، انتظار اور وعدوں سے بھرے تھے ایک برفانی تودے نے اُنھیں زندگی اور زندہ رشتوں سے اِتنا دُور کردیا کہ عمر بھر کا رونا بھی اُنھیں واپس نہ لا پائے گا

آج مجھے یہاں دوسرا دن تھا۔ اپنے بٹالین ہیڈکوارٹر میں، کب چھٹی گیا اور کب واپس آیا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ گھر والوں کے ساتھ گزارے چھٹی کے دن ایک خواب بن گئے۔ میرے ذہن میں چھٹی جانے والا دن آ گیا۔ کیسے جانے کی جلدی میں خوشی خوشی ہر کام کیا تھا۔ فوجی کی زندگی چھٹی کے انتظار میں گزرتی ہے، چھٹی سے آئے تو اگلے ۳/ماہ کا انتظار کرنا شروع کردیا کہ کب پورے ہوں تو اگلی چھٹی ملے اور اس طرح پوری زندگی گزر جاتی ہے۔ مگر آج کل تو حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ کئی کئی نہیں جا پاتے۔ جب ہم چھٹی جا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے رشک کرتے ہیں اور جب آ رہے ہوتے ہیں تو دوسرے جانے والے ہمارے لیے قابلِ رشک ہوتے ہیں۔

کل صبح مجھے پوسٹ پر جانا ہے اور یہ ۲/دن موسم سے مطابقت حاصل کرنے کے لیے ملے تھے۔ میرا ذہن پھر اس لمحے کی طرف چلا گیا جب میں چھٹی جا رہا تھا۔ پہلے پیدل سفر، پھر ایک ٹوٹی ہوئی جیپ کا ۵/گھنٹے کا سفر پھر اگر سکردو سے جہاز ملا تو کیا کہنے، ورنہ ۲۴/گھنٹے بس کا سفر۔ سب کچھ ویسے ہی ہوگا۔ وہی بسوں کے اڈوں پر عوام کا حجم غفیر، کوئی اِدھر جا رہا ہے، کوئی اُدھر جا رہا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہوگا۔ بچے سونے کے لیے لیٹ گئے ہوں گے۔ ابو حسبِ عادت حالاتِ حاضرہ کا کوئی ٹی وی پروگرام دیکھ رہے ہوں گے۔ امی یا تو میرے بچوں کو کہانی سنا رہی ہوں گی یا پھر ابو سے گلہ کر رہی ہوں گی کہ ابو کے پاس ان کے لیے کوئی ٹائم نہیں۔ اب پتا نہیں وہ لمحۂ وصل کب آئے جب پھر ان سب سے ملاقات ہوگی۔

وقتِ جدائی ایک عجیب سماں ہوتا ہے۔ رخصت کرتی آنکھیں پانی سے بھری چھلکنے کو بے تاب، مگر نہ چھلکنے کی کوشش میں مگن۔ چاہے ماں کی ہوں یا باپ کی، یا پھر زندگی کی ساتھی کی۔ اور ہم جو رخصت ہو رہے ہوتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں، معلوم نہیں ہوتا کہ واپس آئیں گے یا نہیں۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو ایک ماں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں بھیجتے ہوئے بھی وہ ''جہاں رہو خوش رہو'' کی دعا دے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جب ایک باپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا بیٹا اُس سے شاید دوبارہ گلے نہ مل سکے، پھر بھی تنی ہوتی گردن کے ساتھ اس کے گلے لگتے ہوئے فخر سے اس کی کمر تھپکتا ہے جیسے خاموشی کی زبان سے کہہ رہا ہو جو سینہ میرے سینے سے لگا ہے اگر اس پر گولی کھائی تو میرا سر ایسے ہی بلند رہے گا۔ اس کا تھپکتا ہوا ہاتھ ایسے لگتا ہے کہ جیسے بیٹے کی پیٹھ کو چھپا رہا ہو کہ کہیں پیٹھ پر گولی نہ کھالے۔ اپنے سینے کو بیٹے کے سینے سے جب کوئی باپ لگاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اپنی دھڑکنیں بھی اس کے نام کر رہا ہو۔ پھر جب بیٹا دمِ رخصت باپ سے ہاتھ ملاتا ہے تو باپ کی نبض بیٹے کی نبض سے کہتی ہے ''ملت کی رگِ جاں کو جب بھی خون کی ضرورت پڑے تو پیچھے نہ رہنا۔''

وہی بیٹا جب بحیثیت شوہر بیوی کی طرف دیکھتا ہے تو زندگی کی ساتھی کی آنکھیں زندگی کے ساتھی کو آنکھوں سے کہتی ہیں۔ ہو تو تم میرے سرتاج، مگر میری مانگ میں اس مٹی کا سیندور لگے اس سے بڑا اعزاز نہیں کوئی اور جب وہ بیٹا اپنے بچوں کو دیکھتا ہے تو قوم کے بچوں کی محبت اپنے بچوں کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔

میں یہ سوچتے سوچتے سو گیا۔ صبح فجر کی نماز کے لیے آنکھ کھلی تو اللہ اکبر کے الفاظ اللہ کی عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ کمرے میں ٹھنڈ بہت تھی، میں نے اٹھ کر وضو کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ میری رجمنٹ کے بہت سے لوگ جو کل چھٹی سے آنے کے بعد نہیں ملے تھے، راستے میں ملتے رہے۔

نماز کے بعد سب سے ملاقات کرکے میں آگے جانے کا سوچتا ہوا آرہا تھا۔ ابھی مجھے اپنے سفر کا آخری حصہ طے کرنا تھا۔ یعنی اپنی پوسٹ کو سفر کیونکہ میں جاؤں گا تو میرے اگلے ساتھیوں کو گھر جانے کا مژدہ ملے گا۔ راستے میں کینٹین پر چلا آیا کہ کینٹین ٹھیکیدار سے ملاقات بھی کرلوں۔

''وحید خان السّلام علیکم! کیا حال ہیں۔'' میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے آواز لگائی۔

''سر ٹھیک ٹھاک، پنجیر راغلے آگیا آپ چھٹی سے۔'' وحید خان یہ کہتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آیا اور گلے لگ گیا۔

(وحید خان کا باپ ہماری یونٹ کی کینٹین کا پہلا ٹھیکیدار تھا۔ خود بوڑھا ہوگیا تو بیٹے کو کینٹین چلانے کی ذمے داری دے دی۔ مجھے یاد ہے جب یونٹ سیاچن آ رہی تھی تو ہمارے کمانڈنگ آفسر نے اس سے پوچھا تھا کہ سیاچن چلنا ہے یا نہیں اور وحید خان کا جواب تھا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یونٹ محاذ پر جائے اور وحید خان پیچھے ہو۔'')

''یار چھٹی سے تو میں آگیا تھا مگر کل کا سارا دن بس سردی سے لڑتے گزارا، آج آگے جانا تھا تو اس لیے ملنے آگیا۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا سر۔'' وحید خان نے جواب دیا اور ساتھ ہی ساتھ چائے بھی منگوالی۔

وحید خان کی کینٹین میں ریڈیو پر تلاوت آرہی تھی۔ اس کا ملازم لڑکا برتن دھونے کے ساتھ ساتھ چائے بھی بنا رہا تھا۔

''کام کیسا چل رہا ہے، وحید خان؟'' میں نے پوچھا۔

''بس سر ٹھیک ہے، ادھر کام اتنا نہیں ہے۔ آپ سب لوگ تو پوسٹوں پر ہو۔ بس جو آتا جاتا ہے ان سے

ملاقات ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں چائے پی کر کینٹین سے باہر آگیا۔ سامنے لنگر پر جہاں جوان کھانا کھاتے ہیں زندگی اپنا آپ منوا رہی تھی، دیگچیوں سے ٹکراتے کفگیر، ناشتا کرتے ہوئے باتوں میں مصروف جوان۔ ایک طرف دھوبی کے کمرے سے آتا ہوا کوئی جوان جس نے اپنی استری شدہ وردی اٹھائی ہوئی ہے، دوسری جانب گاڑیوں کو صاف کرتے ہوئے ڈرائیور، سامنے ہتھیاروں والے کمرے کے باہر حوالدار ساجد اپنے ذمے کیے گئے ہتھیاروں کی صفائی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ ایک ذمے دار حوالدار ہے۔ ہتھیار استعمال ہوں نہ ہوں مگر وہ پابندی سے ان کی صفائی کرتا ہے۔ جتنا خیال اس کو ہتھیاروں کا ہے اتنا خیال شاید اپنے بچوں کا بھی نہ ہو۔ آندھی آئے طوفان آئے مگر ہتھیار صاف کرنے کا اس کا معمول ختم نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ان کو صاف رکھتا ہے کہ کبھی بھی اُن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مجھے دیکھا تو آکر بہت گرم جوشی سے ملا۔ حال چال پوچھ کر میں چھوٹے سے میس کی طرف آگیا۔ ارادہ تھا کہ ناشتہ کروں گا۔ عموماً ہم ناشتا کمروں میں ہی کرتے ہیں مگر آج نہ جانے کیوں دل چاہا کہ ناشتا میس میں ہی کروں۔ اندر داخل ہوا تو میس کا ویٹر اسلم مل گیا۔ ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا اسلم، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، ہمیشہ خوش رہنے والا۔ بے چارہ ماں کا اکلوتا سہارا۔ باپ کارگل میں شہید ہوگیا تو پڑھنے کی عمر میں نوکری کرنے چلا آیا۔ بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ پرائیویٹ بی اے کا امتحان بھی دے رہا ہے اور نوکری بھی کر رہا ہے۔ ینٹ میں ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ وہ پڑھ لے۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے سب اس کی مدد کرتے ہیں۔

''یار اسلم ناشتا'' میں نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ سر ابھی لایا کہہ کر بوتل کے جن کی طرح غائب، اب یہ ناشتہ لے کر ہی آئے گا۔ ایسا ہی مخلص ہے یہ ہم سب سے۔ کچن سے چاچا کک کی آوازیں آرہی ہیں۔ نئے آنے والے کک کو ہدایات دی جارہی ہیں۔ کیسا نظام ہے یہ، ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر فِٹ ہے اس کارخانہ قدرت میں۔ چاچا کک کا نام تو نذیر ہے مگر سب چھوٹے بڑے اس کو چاچا کک ہی کہتے ہیں۔ میں ناشتہ کر کے کمرے میں آیا اور تیار ہو کر آفس کی طرف آگیا۔ یہاں کی ایک الگ زندگی، کام کرتے کلرک، ٹائپ رائٹروں کی کھٹا کھٹ، ہر طرف زندگی اپنے اپنے رنگوں میں رنگین۔ عصر کی نماز تک میں مختلف کاموں میں مصروف رہا جن میں اہم کام تو آگے جانے کے بارے میں انتظام وغیرہ کرنا تھا۔ شام کو ہم نے کرکٹ کھیلی۔ سیاچن میں کرکٹ..... ہے نا حیران کن! مگر ہیڈکوارٹر میں ایسا ممکن ہے۔ البتہ پوسٹوں پر ہونے والی کرکٹ اس کرکٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ کپڑے کی یا برف کے گولے کی گیند بنائی جاتی ہے اور فرائنگ پین کا بیٹ۔ گیند کپڑے کی ہو یا برف کی زمین پر مارنا منع ہے۔ البتہ کپڑے کی گیند سے کیچ آؤٹ ہونے پر اگلے کھلاڑی کی باری آتی ہے، جبکہ برف کے گولے کی صورت میں ایک اننگز میں صرف ۶ گیندیں یعنی ۱ گولے کھیل سکتا ہے۔

رات کو میں سب سے مل کر پارٹی کے ساتھ پوسٹ کی طرف چل پڑا۔ برف پر چلنا اتنا آسان نہیں، آکسیجن کی کمی، برف کا مخصوص لباس، آنکھوں پر چشمہ کہ جب ہوا چلتی ہے تو برف آنکھوں میں جاتی ہے۔ کبھی اِدھر پاؤں برف میں دھنس جائے تو کبھی اُدھر۔ سانس زور سے لو تو ٹھنڈی ہوا پھیپھڑوں کا نقصان کرتی ہے۔ آٹھ دس گھنٹے لگاتار موت کے منہ میں کہ کہیں سے کوئی برفانی تودہ نہ آگرے، چلتے چلتے اعصاب اور بدن دونوں شل ہوجاتے ہیں۔ بالآخر صبح صبح پوسٹ پر پہنچے۔ وہی کمرا، وہی مٹی کے تیل کا چولہا جس کی کالک آنکھوں اور نتھنوں میں بس کر قدرتی سرمہ لگتی ہے اور جو چھٹی پر جا کر بھی اتنی آسانی سے نہیں اترتی۔

ہمارے پہنچنے کی سب سے زیادہ خوشی ان لوگوں کو ہوئی جنھیں آج رات چھٹی جانا تھا۔ سپاہی شبیر جس کے ہاں ایک ماہ پہلے بیٹا ہوا تھا اور وہ اسے دیکھنے کو بے تاب تھا۔ حوالدار سرور جس کی ماں بیمار تھی اور جو جاتے ہی اس کو سی ایم ایچ لے جا کر دکھانا چاہتا تھا کیونکہ گھر میں ماں اور باپ ہی تھے اور کوئی ان کو لے جانے والا نہیں تھا۔ نائیک عبداللہ کی بہن کی شادی تھی۔ وہ ۲ ماہ پہلے ہی چھٹی سے آیا تھا مگر اب بطورِ خاص بہن کی شادی کی وجہ سے چھٹی جارہا تھا۔ میرا دن سوتے جاگتے، ملتے ملاتے گزرا۔ میں نے ایک مرتبہ تمام ذمے داری والے علاقے کا چکر لگایا۔ اپنے ہتھیار چیک کیے اور شام کو چھٹی جانے والوں کی پارٹی کو گلے مل کر رخصت کیا۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے کیونکہ جانے والے تو اتنے خطرے میں نہیں ہوتے وہ تو ہیڈکوارٹر کی طرف جارہے ہیں۔ خطرے میں تو پوسٹوں والے ہوتے ہیں جنھیں وہ پیچھے چھوڑ کر جارہے ہوتے ہیں۔ سب نے ایک دوسرے کو اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کی۔ شکوے شکایت، کہا سنا معاف کروایا کہ یہ رسم چھٹی جانے والے اور پیچھے رہ جانے والے ضرور نبھاتے ہیں بحیثیت دوست، بحیثیت ساتھی اور سب سے بڑھ کر بحیثیت مسلمان۔

عموماً پوسٹوں پر یا ہیڈکوارٹر پر برفانی تودے گرنے کے امکان بہت ہی کم ہوتے ہیں کیونکہ یہ تمام حفاظتی اقدامات کو ملحوظِ خاطر رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ البتہ ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ تک، یا ہیڈکوارٹر تک جانے میں نہ صرف یہ کہ برفانی تودے گرنے کا خطرہ ہوتا ہے بلکہ کئی جگہوں پر موجود کھائیاں جو کہ برف کی تہہ اوپر ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتیں، اپنا منہ کھولے موت کی پیامبر بنی رہتی ہیں۔ اسی لیے جب تک ایک پارٹی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ جاتی تمام لوگ ان کے لیے دُعا گو رہتے ہیں۔

رات تقریباً ۳ بجے پارٹی کے ہیڈکوارٹر سے خیر و عافیت پہنچنے کی اطلاع ملی۔ ہم سب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر میں اپنے بنکر میں چلا گیا۔ صبح فجر کی نماز کے قریب مجھے میرے ساتھیوں نے جھنجھوڑ کر اُٹھایا اور یہ روح فرسا اطلاع دی کہ بٹالین ہیڈکوارٹر پر برف کا ایک بہت بڑا تودہ آگرا ہے۔ یہ خبر ایک قیامت تھی۔ پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ بٹالین ہیڈکوارٹر پر بھی برفانی تودہ آ کر گر سکتا ہے۔ ایک ناقابل یقین بات تھی مگر ہم انسانوں کے لیے۔ اس ذات کے لیے نہیں جو سب سے بڑی اور سب کچھ کرنے کی طاقت رکھنے والی ذات ہے۔ اس ذات نے تو صرف ''کُن'' کہنا ہے اور ''فیکُون'' ہونے میں لمحہ نہیں لگتا کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۸/۷ اپریل کی درمیانی رات سے لے کر آج تک ہمارے لیے یہ سب ناقابل یقین ہے مگر ایسا ہو چکا ہے۔ امدادی کام جاری ہے۔ میرا ذہن آرام کے لمحوں میں یہی سوچتا رہتا ہے کہ جس دن میں صبح آنے سے پہلے کینٹین ٹھیکیدار وحید خان سے ملا تھا تقریباً اسی وقت وہ تودہ گرا مگر اس دن گرا جب میں وہاں سے نکل پڑا تھا۔ اگر ایک دن پہلے گرتا تو میں بھی منوں برف تلے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دفن ہوتا۔

جس وقت تودہ گرا اس وقت وحید خان کینٹین ٹھیکیدار حسبِ معمول کینٹین کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہوگا۔ اُسی طرح کینٹین میں ریڈیو پر تلاوت آرہی ہوگی۔ کینٹین میں کام کرنے والا لڑکا کسی کے لیے چائے بنا رہا ہوگا۔

جس وقت تودہ گرا ہوگا لنگر پر زندگی ویسے ہی چل رہی ہوگی۔ لوگ ناشتا کر رہے ہوں گے اور مختلف موضوعات پر بحث بھی جاری ہوگی۔ کوئی جوان اپنی استری شدہ وردی پہننے کے لیے لے جا رہا ہوگا۔ ڈرائیور گاڑیوں کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہوں گے۔ حوالدار ساجد حسبِ معمول اپنے ہتھیاروں کو صاف کرنے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ کک چاچا ہمیشہ کی طرح اپنے سے جونیئر کو کچن میں لیکچر دے رہا ہوگا۔ پڑھنے کا خواب آنکھوں میں جگائے، بڑا آدمی بننے کی لگن لیے میس ویٹر اسلم اپنی ماں اور بہنوں کی آنکھوں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی لگن لیے کام میں مصروف ہوگا۔ باپ کارگل میں شہید اور بیٹا گیاری میں شہید۔ دفتر میں ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹا کھٹ، تودہ گرنے کی

سانحہ گیاری۔ انتظار کے ۵۰ کٹھن دن

۷ اپریل صبح ۶/ بجے برف کا ۷۰/تا ۸۰/فٹ موٹا تودہ، گیاری کے مقام پر فوجی چوکی پر آن گرا۔ اس وقت وہاں ۱۲۴/فوجی جوان، ۱۱/سویلین افراد جن میں ۲/ بیرے، ۳/ حجام، ۲/ کینٹین مالکان، ایک درزی اور ایک نوکر غلام رسول موجود تھے، جو سبھی ۷۰ تا ۸۰ فٹ گہرے برف کے تودے تلے دب گئے۔ اس حادثے کے ایک گھنٹے کے اندر ۲۱/ سے زیادہ فوجی جائے حادثہ پر پہنچ چکے تھے اور انھوں نے وہاں موجود وسائل کے ساتھ برف میں دبے افراد کو نکالنے کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ اس کے بعد ۱۸۰/ سے زیادہ آرمی کے جوان اور ۶۰/ سویلین افراد نے برف تلے دبے افراد کو نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ آرمی کی بھاری مشینری، فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن اور گلگت بلتستان کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے بلڈوزر، پی ای لوڈرز اور کھدائی کرنے والی مشینیں جائے حادثہ پر دن رات ریسکیو کے کام میں مشغول رہے۔ برف تلے دبے ہوئے افراد کا کھوج لگانے کے لیے خصوصی آلات اور تربیت یافتہ کتوں سے بھی کام لیا جاتا رہا۔ زخمیوں کے علاج معالجے کے لیے ادویہ، ٹراما (ذہنی صدمہ) کٹس اور طبی ماہرین کو بھی سکردو پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ HQ10 Corps, اور FCNAHQ جیسی تنظیموں کے دفاتر بھی گیاری کے مقام پر قائم کر دیے گئے ہیں۔ ہر دن انتظار کا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر سبھی کی دعائیں اپنے پیاروں کی سلامتی اور زندگی کے لیے جاری تھیں۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب دبے ہوئے افراد کی زندگی ہی نہیں، ان کے دبے ہوئے جسموں کے ملنے کی امیدیں بھی ختم ہو چلی تھیں۔ یہاں تک کہ ریسکیو کا کام شروع ہونے کے ۵۰/ ویں دن ایک شہید کی لاش ملی جسے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا گیا۔ ۲۷/ مئی تک ۱۵/ شہداء کی لاشیں نکالی جا چکی تھیں۔ بالآخر فوج کی طرف سے مورخہ ۲۹/ مئی کو گیاری کے تمام افراد کو فخر اور دُکھ کے ساتھ شہید قرار دے دیا گیا۔ یوں ان کے زندہ رہنے کی ہر اُمید اور آس ختم ہوگئی۔ انتظار کے یہ ۵۰/ دن قوم پر ہی نہیں شہدا کے لواحقین پر بہت بھاری گزرے۔

گڑگڑاہٹ میں دب کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہوگی۔ ایک لمحے کے لیے کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا ہوگا اور اگلے ہی لمحے موت نے انھیں سب سمجھا دیا ہوگا۔ میرے وہ ساتھی جو پوسٹ پر میرے ساتھ تھے اور میرے آنے کے بعد چھٹی کی تیاری کر کے ہیڈکوارٹر پہنچے تھے۔ وہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے کہ ان کو تھوڑی دیر بعد ہی تو نکلنا تھا۔ سپاہی شبیر جو اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا اب کبھی اپنے بیٹے کو نہ دیکھ پائے گا اور اس کا بیٹا جوان حالات سے بے خبر ہے بڑے ہو کر صرف تصویر میں ہی اپنے بہادر اور شفیق باپ کا چہرہ دیکھے گا۔ حوالدار سرور جس نے اپنی ماں کی آنکھوں کا آپریشن کروانا تھا۔ اب اس کی ماں کا آپریشن کون کرائے گا اور آپریشن ہو بھی جائے تو کیا واپس آنے والی اس کی ماں کی بینائی اس کو اپنے بیٹے کی شکل دکھا سکے گی؟ کبھی نہیں۔ نائیک عبداللہ جو

اپنی بہن کی شادی پر جارہا تھا۔ اب اس کی بہن جب بھی رُخصت ہوگی اپنے بھائی کی دعاؤں کے بغیر رخصت ہوگی۔ کتنے ہی ساتھی ایسے تھے جنھوں نے فون پر اپ بچوں سے کتنی قسم کے وعدے کر رکھے تھے۔ کچھ ٹافیو کے وعدے، کچھ کپڑے خریدنے کے وعدے، کچھ بو والی گڑیا لانے کے وعدے، کہیں گھمانے پھرانے وعدے، نئے جوتے دلانے کے وعدے۔ سب وعد اَدھورے ہی رہ جائیں گے۔ سب وعدے ایک برفا تودے کے نیچے دب گئے۔ ان پیاروں کے ساتھ جن وجود زندہ تھے تو وعدے ان میں سانس لیتے تھے۔ جا والوں نے سارے وعدے بھلا کر صرف ایک وعدہ نبھا انھوں نے اپنے رب سے کیا تھا کہ وہ وطنِ عزیز کی جان دے دیں گے۔ سو انھوں نے اپنی جانیں دے وعدہ نبھایا۔

آسایشوں کی کثافت سے گہنائے ایک گھر کا المیہ

جھروکے

اُس شہر میں زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے سارے رِشتے تنہا ہو گئے تھے

بشریٰ رحمٰن

مکین اپنی راحتِ جاں اور رفیقِ زندگی کی
جھروکوں والی ثقافت کی تلاش میں آئے
ایک مسافرِ بے نوا کی دلِ گداز داستان
اُس سے "نورِ سحر" کی تنہائی دیکھی اور سہی نہ جاتی تھی

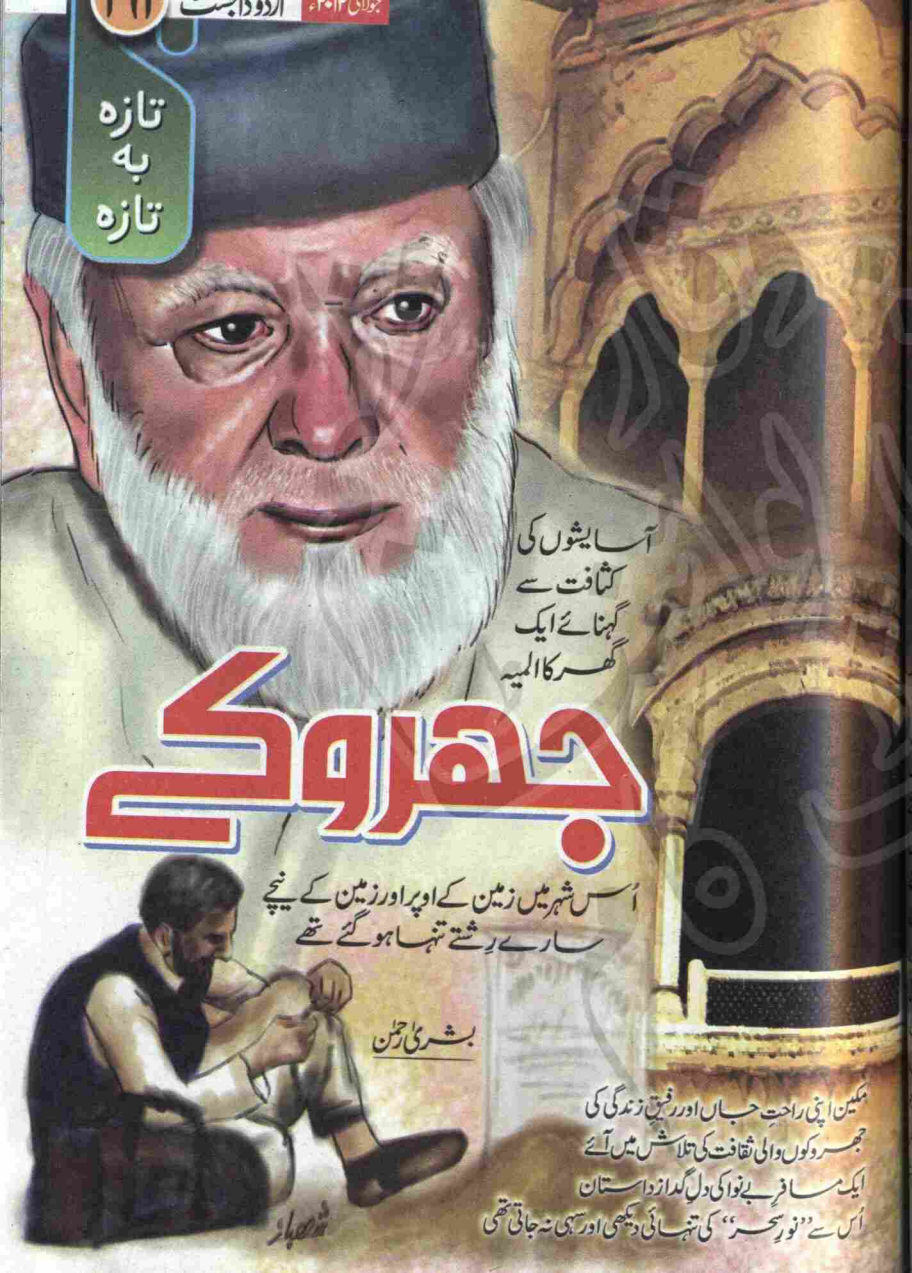

چھوٹا

سا ویران اسٹیشن، آدھی رات کا وقت، اجنبی شہر، نامانوس زبان، میں پلیٹ فارم پر سایہ سا بنا، اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی ایک پسنجر ٹرین مجھے یہاں اُتار کر گئی تھی۔ مجھے خود اپنی عقل پر حیرت ہونے لگی۔ آرلینڈ یونیورسٹی کے لیے مجھے ایک ریسرچ پیپر لکھنے کی آفر ہوئی تھی۔ پاکستان کے کسی ایسے علاقے کی ثقافت کے بارے میں لکھوں جسے جدید تہذیب کی آلائشوں اور سائنسی ایجادات کی سہولتوں نے چھوا تک نہ ہو۔ اسی پیپر پر میرا وہاں داخلے اور ملازمت کا انحصار بھی تھا۔ میرے ایک میڈیائی دوست نے مجھے اس شہر کا نام بتایا تھا اور جب میں نے اس سے کہا، کوئی اتا پتا بتاؤ، کہاں ٹھہروں کس سے ملوں، تو اس نے کہا تھا، یہیں سے تو ان کی ثقافت کا کھوج ملے گا۔ حوالے اور تعارف سے بے نیاز ہو کر جاؤ اور تلاش کرو۔

اسٹیشن پر اتنا سناٹا اور خاموشی تھی۔ پھر شہر کا عالم کیا ہوگا۔ میں ابھی کھڑا سوچ رہا تھا کہ باہر کس طرف سے نکلا جائے کہ ایک میلا کچیلا قلی آکر سامنے کھڑا ہوگیا۔

''باؤ جی! سامان اٹھاؤں؟''

سامان ہی کتنا تھا۔ میرا ایک سفری بیگ تھا جسے میں اکثر خود ہی اٹھا لیا کرتا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ قلی معلومات کا پہلا سورس ہوتا ہے میں نے بیگ کی طرف اشارہ کردیا۔ اس نے اٹھا لیا اور باہر کو لپکا۔ میں خارجی راستے سے ناواقف تھا، سو اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

باہر تانگوں کا اڈہ تھا۔ مجھے وہ وہاں لے آیا۔

''یہاں کوئی اور سواری نہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں باؤ جی! یہاں صرف تانگہ چلتا ہے یا سائیکل رکشہ۔ مگر وہ صبح کی سواری کے لیے دستیاب ہوتے ہیں آدھی رات کو نہیں۔''

ایک تانگے والا جو پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا اٹھا اور قریب آگیا۔

''کہاں جانا ہے باؤ جی؟''

''میں نے کہا شہر جانا ہے۔ تم سامان رکھو۔''

میں نے قلی کو پیسے دیے، اُچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ تانگے والے نے آگے بیٹھ کر چابک گھمایا اور گھوڑا دوڑنے لگا۔

''شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کافی دور ہے۔'' وہ بولا۔ ''اسٹیشن شہر سے باہر ہے۔ آپ کس طرف جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے شہر کے کسی ہوٹل میں لے چلو۔''

''ہوٹل! باؤ جی اس شہر میں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔''

''کوئی سرائے جہاں رات کو قیام ہو سکے۔''

''سرائے بھی نہیں ہے۔''

''جو مسافر لوگ ہوتے ہیں وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟''

''اس شہر کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ جو بھی دروازہ کھٹکھٹائے اسے اپنے گھر ٹھہرا لیتے ہیں۔''

''عجیب بات ہے بھلا کسی اجنبی مہمان کو کوئی کیسے اپنے گھر میں ٹھہرا سکتا ہے؟''

''آپ آزما کر دیکھ لیں باؤ جی۔''

تانگہ خاموش، نیم تاریک اور سنسان سڑکوں پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ چوراہوں پر کار پوریشن کی بتیاں روشن اور دکانیں بند تھیں۔ کسی کسی دکان کے باہر چارپائی پر یا تھڑے پر کوئی سویا ہوا نظر آتا تھا یا کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر اس کا تانگہ ایک نسبتاً تنگ بازار میں داخل ہوگیا۔

بولا یہ اس شہر کا سب سے بڑا بازار ہے اور یہاں سے اندرونِ شہر شروع ہو جاتا ہے۔ بازار سُونا تھا جیسے جن پھر گیا ہو۔

''یہاں بازار کتنے بجے بند ہو جاتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''باؤ جی! عشاء کی اذان ہوتے ہی دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ لوگ کاروبار بند کر کے مساجد کی طرف دوڑتے ہیں۔ عشا کی نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے اور کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔''

''اتنی جلدی!'' میں حیران ہوا۔

''ہاں جی! پھر علی الصبح فجر کی اذان کے ساتھ نور کے تڑکے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ناشتا کر کے دکانیں کھول لیتے ہیں۔ باؤ جی! جلدی سوئیں گے تو جلدی اٹھیں گے نا؟''

میں اس فلسفے پر غور کرتا ہوا..... خاموش ہو گیا۔

بازار سے ہوتا ہوا تانگہ ایک گلی میں آ کر رک گیا۔

''یہ کیا جگہ ہے؟''

یہ حاجی عبیداللہ کا گھر ہے۔ اکثر مسافر ان کے مہمان ہوتے ہیں۔''

''اگر انھوں نے دروازہ نہ کھولا تو.....''

''باؤ جی کوئی اور دروازہ کھل جائے گا۔ یہ شہر ایسا نہیں ہے۔''

وہ تانگے سے اتر کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ میں بھی اُتر آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی، اس وقت پچھلی رات کا ایک بج رہا تھا۔ سارا ماحول جیسے مراقبے میں تھا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں تھی۔ یکا یک دروازہ کھل گیا۔ ایک بزرگ صورت نے باہر جھانکا۔

''آپ کے مہمان آئے ہیں جی۔'' تانگے والے نے زور سے کہا۔

''بسم اللہ کہہ کر بزرگ نے دونوں دروازے کھول دیے۔'' آئیے اندر آجائیے۔''

میں ڈرتا جھجکتا اندر چلا گیا۔ تانگے والے نے میرا بیگ اندر رکھ دیا۔ میں نے جیب سے نکال کر اسے پیسے دیے۔ وہ چلا گیا۔

بزرگ نے دروازہ بند کرلیا اور مجھے کہا تشریف رکھیے۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں زبان کھولی۔

''جی میں..... مجھے.....''

''بیٹھیے۔'' انھوں نے ٹوک کر کہا۔ ''آپ سفر سے تھکے ہوئے آئے ہیں۔ میں پہلے آپ کے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تب تک آپ غسل خانے جا کر ہاتھ منہ دھولیں۔'' انھوں نے غسل خانے کی طرف اشارہ کر دیا۔

پھر جاتے جاتے رک گئے اور بولے ''اس وقت جو گھر میں حاضر ہے وہی پیش کر سکتا ہوں۔''

میں نے جلدی سے کہا ''کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ گھر والوں کو تکلیف نہ دیں۔ کھانے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔''

وہ بولے ''بستے گھروں میں مہمان بھوکے نہیں سوتے۔'' اور باہر نکل گئے۔

میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو اسی کمرے میں ایک بستر لگا تھا۔ میرے دل میں شکوک و شبہات اٹھنے لگے۔ نہ میرا اتا پتا معلوم کیا۔ نہ سوالات کی بوچھاڑ کی۔ اس پر یہ مہمان نوازی۔ کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

اتنے میں بزرگ پانی کا جگ اور گلاس پکڑے ہوئے وارد ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے شاید گھر کی نوکرانی ایک خوانچہ اٹھائے ہوئے تھی۔ اس نے قالین پر دسترخوان بچھایا اور کھانا لگا دیا۔ گرم گرم پھلکے اپنی خوشبو دے رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ واقعی مجھے بھوک لگی ہے۔ میں نے ڈھکن اٹھایا تو ایک پلیٹ میں چنے کی دال اور کدو پکے تھے۔ میں نے اس کو غنیمت جانا۔ پلیٹ کھسکائی۔ پہلا نوالہ توڑا تو نوکرانی کے ساتھ وہ بزرگ پھر آگئے۔ اب کے نوکرانی نے خوانچے میں سے ۵/قسم کے سالن کی رکابیاں نکال کر دسترخوان پر رکھ دیں اور خود چلی گئی۔ میں نے حیران ہو کر ان رکابیوں کی طرف دیکھا۔ ایک میں پالک گوشت، دوسری میں گوبھی گوشت، تیسری میں مٹر اور قیمہ، چوتھی میں غالباً دو تین کوفتے اور پانچویں رکابی میں مکس سبزی پڑی تھی۔ میں نے ان بزرگ سے پوچھا۔

''ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ گھر میں جو بچا کھچا ہوگا لے آئیں گے۔ پھر یکا یک یہ اتنے سالن کہاں سے آگئے؟''

وہ مسکرائے ''آپ تردد میں نہ پڑیں۔ کھانا کھا کر آرام کریں۔ صبح آپ کو بتا دیں گے۔''

میں نے ہر پلیٹ میں سے تھوڑا تھوڑا سالن لے کر کھایا۔ خدا گواہ ہے میں نے اتنا لذیذ سالن اپنے گھر میں بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے انھیں اپنے آنے کی غرض و غایت بتائی اور یہ بھی بتا دیا کہ تقریباً ایک ہفتہ قیام ہوگا، کیا وہ ایک ہفتہ مجھے برداشت کر سکیں

گے؟ انھوں نے خوش دلی سے مجھے اجازت دے دی اور ثقافت کے ضمن میں بہت سے لوگوں کا پتا دیا کہ میں ان کے ہاں جاؤں اور اپنے تھیسس کا مواد اکٹھا کرسکوں۔

ایک بات میرے لیے حیران کن تھی۔ ان کے گھر کا کھانا بہت لذیذ ہوتا تھا۔ اور ان کے گھر میں مجھے بے حد میٹھی اور پُرسکون نیند آتی تھی۔ وہیں بیٹھک ہی کو انھوں نے میرا کمرا بنا دیا تھا۔ وہ علی الصبح مجھے ناشتا کرا کے اپنی دکان پر چلے جاتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی ان کے بیٹے اور گھر کے دوسرے مرد بھی کام پر چلے جاتے تھے۔ وہ سب عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے مجھے بھی فجر کی اذان کے ساتھ اٹھنے اور پھر مسجد میں جا کر فجر پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔ رات کو اپنے آپ عشاء کی اذان سن کر میں محلے کی مسجد میں جا بیٹھتا۔ وہاں میں دیکھتا سب محلے دار ایک دوسرے کو خوش خلقی سے ملتے۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے۔ محلے کی خبریں ایک دوسرے کو بتاتے پھر گھر آجاتے۔

میں اپنے آداب کے مطابق جب کبھی ان کا شکریہ ادا کرتا یا اس تکلیف دہی کے لیے معذرت کرتا وہ ہمیشہ کہتے مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ جس گھر میں مہمان نہیں جاتے، اس گھر کا رزق نہیں بڑھتا۔

ایک روز میں نے انھیں یاد دلایا کہ حضرت! اس بار آپ نے ایک ضیافت کا اہتمام کیسے کرلیا۔

وہ مسکرائے اور مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ مجھے چھت پر لے گئے۔ میں نے دیکھا چھت کی دیواروں میں مختلف جھروکے بنے ہوئے تھے۔ جیسے چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر ایک جھروکہ کھول دیا۔ دوسری طرف کسی کا گھر تھا۔ دوسرا جھروکہ کھولا تو وہاں بھی گھر نظر آیا۔ تیرا چوتھا پانچواں۔ سب جھروکے کھول دیے۔ وہ سب جھروکے دوسرے گھروں میں کھلتے تھے۔

حاجی صاحب کہنے لگے ''یہ سب لوگ ہمارے قریبی ہمسائے ہیں۔ ہم سائے کا مطلب جانتے ہو۔ وہ لوگ جو گھر ہی سائے میں قیام کرتے ہوں۔ ہمارے شہر کی خوبی یہ ہے کہ ہم حقوق ہمسائیگی کے پیروکار ہیں۔ ہر گھر کا جھروکہ دوسرے گھر میں کھلتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہم ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں بلکہ بوقت ضرورت کسی ہمسائے کو کسی چیز دوائی یا مدد کی ضرورت ہو تو پیش کرتے ہیں۔ جو چیز ایک گھر سے نہیں ملتی وہ دوسرے گھر سے مل جاتی ہے۔ اس رات جب تم بے وقت آگئے۔ تو میری بیگم نے ان جھروکوں کو کھٹکھٹا کر ہمسایوں کو بتایا کہ کوئی نیا مہمان آیا ہے اگر کچھ بچا ہوا سالن ہو تو دے دیں۔ ۵ گھروں سے سالن کی پانچ پلیٹیں آگئی تھیں، جو ہم نے آپ کے آگے رکھ دیں۔ برخوردار یہی ہماری ثقافت کا نچوڑ.....! اسی لیے ہر گھر کے مرد بے فکر ہو کر کام پر چلے جاتے ہیں کہ ہر گھر کا رابطہ دوسرے گھر کے ساتھ ہے۔ ہمیں باہر سے کسی کو بلوانا نہیں پڑتا۔ محلے کے لوگ ایک برادری کی طرح رہتے ہیں اور مساجد میں اجتماع کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔

میں ایک ہفتہ ان کے گھر رہا۔ بالآخر میں نے چلنے سے پہلے حاجی صاحب سے کہا۔

''اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک بات عرض کروں۔'' وہ بولے ''ضرور..... ضرور۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''حاجی صاحب مقالہ تو میرا آپ کے گھر کے اندر ہی مکمل ہوگیا تھا۔ مگر بہت سوچ سمجھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ اس ثقافت کی مجھے خیرات دے دیں۔

''خیرات.....!'' وہ حیران ہوئے۔ ''میں سمجھا نہیں!''

''ہے تو گستاخی، مگر صاف صاف کہتا ہوں، مجھے اپنے خاندان کا فرد بنالیں۔ اپنی ہی فیملی میں میری شادی کرا دیں۔ میں نے اپنے بارے میں آپ کو مفصل بتا دیا تھا۔ میرے والدین آکر رشتہ مانگ لیں گے۔ میں اپنے گھر میں بھی ایسا ہی کلچر دیکھنا چاہتا ہوں۔

حاجی صاحب تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں خوف زدہ رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولے، ''برخوردار! میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میری اپنی بیٹیوں کی

شادیاں ہو چکی ہیں۔ میری ایک یتیم بھانجی میرے ساتھ رہتی ہے۔ اسے میں نے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔ پڑھایا ہے۔ اگر تمھیں منظور ہو تو.....''

''جی.....'' میں نے فوراً کہا۔ آپ کے زیرِ سایہ تربیت پانے والی ہر لڑکی خوش نصیب ہوگی۔''

اگلے مہینے میرے والدین نے آکر رشتہ مانگا۔ میری شادی ہوگئی۔ میں نور سحر کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔ اس کے آتے ہی مجھے آئرلینڈ سے آفر بھی آگئی کہ میرا مقالہ شامل نصاب کرلیا گیا ہے اور یونیورسٹی کی ریسرچ برانچ میں مجھے بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے۔

میں نور سحر کو لے کر آئرلینڈ آگیا۔

اس خاتون نے میری زندگی جنت بنا دی۔ ہمارے ۴ بچے ہوئے۔ ۲ بیٹیاں اور ۲ بیٹے۔ نور سحر دو چار سال کے بعد اپنے شہر آجاتی تھی۔ میں نے جب کاروبار شروع کرلیا تو مجھے یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ گھر کے خوبصورت ماحول نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ چاروں بچوں کی شادیاں ہوگئیں، تو نور کچھ بیمار رہنے لگی۔ گزشتہ سال اس نے وطن جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اسے بھیج دیا۔ یہاں آکر وہ زیادہ بیمار ہوگئی۔ ایک دن اس نے فون پر مجھے کہا کہ اس کا وقت آگیا ہے۔ وہ واپس نہیں آئے گی۔ اسی مٹی میں دفن ہونا چاہتی ہے اور اس نے درخواست کی کہ اسے واپس آنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ پھر وہ رونے لگی۔ بس اتنا کہا، جب کبھی آپ کو فرصت ملے، میری قبر پر فاتحہ پڑھنے ضرور آنا۔ ورنہ میں قیامت تک انتظار کرتی رہوں گی۔''

اسی رات اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ سنتے ہی مجھے زبردست ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ بیٹوں نے مجھے انتہائی نگہداشت میں بھیج دیا۔ ایک بیٹی میرے پاس رک گئی اور باقی ماں کی آخری رسومات پوری کرنے اس کے شہر آگئے۔

☆☆☆

کل رات میں پورے ۵۰ برس کے بعد اس اسٹیشن پر اُترا تھا۔ ٹرین بھی وہی ملی تھی اور رات کا وقت بھی وہی تھا۔ بس میں ۷۵ برس کا ہوگیا تھا۔ جب میں پہلی بار آیا تو میری عمر ۲۵ برس کی تھی۔ اسی طرح میرے ساتھ ایک سفری بیگ تھا۔ میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ جنگلے کے اوپر بڑے بڑے قمقمے روشن تھے۔ سٹیشن پر دو تین سٹال بن گئے تھے۔ ایک پر کھانا مل رہا تھا۔ دوسرا چائے اور مشروبات کا تھا۔ تیسرا ایک بک سٹال تھا جس پر باتصویر رسالے اور اخباریں لٹک رہی تھیں۔ اس وقت اسٹیشن پر کافی چہل پہل تھی۔ مسافر آجا رہے تھے۔ حسبِ معمول قلی میرے قریب آگیا۔ میں نے سامان اٹھوایا اور باہر نکل آیا۔ باہر بھی روشنی کا وافر انتظام تھا اور پارکنگ میں پیلی ٹیکسیاں کھڑی تھیں اور ساتھ آٹو رکشے بھی کھڑے تھے۔ میں نے ٹیکسی کو اشارے سے بلایا، اپنا سامان رکھوایا اور اسے شہر چلنے کو کہا۔

وہ چل پڑی۔ میں نے پوچھا ''بھئی یہاں پہلے تانگے بھی تو ہوا کرتے تھے۔''

''کب کی بات کر رہے ہو صاحب! تانگے تو اب خواب ہوگئے۔ کارپوریشن نے تانگے کی سواری پر پابندی لگا دی ہے۔''

''کیوں؟''

''گندگی بہت پھیلاتے تھے جی۔''

اور وہ سائیکل رکشے؟''

''اس کو غیر انسانی کہہ کر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ان کی جگہ آٹو رکشے چلتے ہیں۔''

''یہ تو اچھا ہوا۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کو شاہی بازار چلنے کو کہا۔

باہر کا سارا ماحول بھی بدلا ہوا تھا۔ سڑکوں کے چوراہوں پر ریستوران اور تکہ شاپس بنی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں مختلف مشروبات کی دکانیں تھیں۔ جن پر رات کے ان لمحوں میں بھی شور والا میوزک بج رہا تھا۔ اس وقت بھی کچھ خوش فکرے بیٹھے تکے کباب کھا رہے تھے۔

ساری سڑکیں روشن تھیں۔ کہیں کہیں کئی منزلہ پلازے بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے باہر سڑک پر موٹر

کھڑی تھی۔ اِکا دُکا ٹریفک بھی نظر آرہی تھی۔ ٹیکسی کے اندر ڈرائیور نے ایک بے ہودہ سے گیت کی کیسٹ لگا رکھی تھی۔ عمارتیں بلند و بالا ہوگئی تھیں اور بڑی بڑی دکانوں کے بورڈ انگریزی میں لکھے نظر آرہے تھے۔ جب ٹیکسی شاہی بازار کے اندر داخل ہوئی تو اس کا نقشہ بھی بدلا ہوا تھا۔ زیورات کی دکانوں کے آگے بڑے بڑے شوکیس بنے ہوئے تھے۔ ریڈی میڈ کپڑوں والی ڈیموں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ گو بازار بند تھا مگر ہر شوکیس کے اندر چھوٹی بتی جل رہی تھی۔

دکانوں کے بیچ ہوٹل اور ریستوران بن گئے تھے جو ابھی تک بند نہیں ہوئے تھے۔ ٹیکسی حاجی صاحب کی گلی میں مڑ گئی۔ گو حاجی صاحب کو فوت ہوئے ۲۰ سال ہو گئے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنے آنے کی اطلاع اپنے سسرال میں دے دی تھی۔

ٹیکسی جس گھر کے آگے رُکی اس کا نقشہ بھی بدلا ہوا تھا۔ یہ گھر کئی منزلہ عمارت میں بدل چکا تھا اور باہر ایک لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ اس پر کال بیل لگی تھی۔ ٹیکسی کو رخصت کر کے میں نے گھنٹی بجائی۔ بار بار گھنٹی بجانے کے بعد ایک باوردی چوکیدار آگیا۔ گیٹ کھولے بغیر للکارا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ بند کر دیا۔

پھر میرا سامان اٹھا کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا۔

میں نے کہا ''اندر اطلاع کر دو میرے آنے کی۔''

''اس وقت اطلاع نہیں ہو سکتی۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔''

میں نے کہا ''ان کو معلوم ہے میں نے آنا ہے۔ میرے بات ہوئی تھی۔''

''جی ہاں'' وہ بولا ''صاحب نے کہا تھا آپ کو اس کمرے میں ٹھہرا دیا جائے۔ وہ لوگ صبح اٹھیں گے، آپ کو بلائیں گے۔''

میرا سر گھوم گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں بستر لگا تھا۔ غالباً مجھے یہاں قیام کرنا تھا۔

کچھ کھانے کو مل جائے گا؟'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''صاحب اندر کا کچن تو بند ہو چکا ہے۔ آپ کہیں تو نکڑ والے ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔ وہ اس وقت کھلا ہوگا۔''

''نہیں رہنے دو۔'' میں کافی عرصہ سے پرہیزی کھانے کھا رہا تھا۔ بازار کا کھانا کھانا مناسب نہ سمجھا۔ چوکیدار کو بھیج دیا اور گزرے دنوں کو یاد کرنے لگا۔ سوتے جاگتے رات گزر ہی گئی۔ فجر کی اذان سن کر آنکھ کھل گئی۔ اتنے عرصہ بعد یہ اذان بہت اچھی لگی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور مسجد کو روانہ ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے نکل کر چند لوگ آئے، جن میں ضعیف العمر بزرگ تھے۔ ملازم قسم کے لڑکے تھے۔ باقی شاید دکاندار تھے۔ بمشکل ایک صف پوری ہوئی اور نماز کھڑی ہوگئی۔ مولوی صاحب بھی کوئی نوجوان تھے۔ انھوں نے مختصر دعا کرائی اور سب ایک دوسرے کو علیک سلیک کیے بغیر باہر نکل گئے۔ میں یونہی ٹہلتا ٹہلتا بازار کے دوسرے سرے پر نکل گیا۔ ۸ بج گئے مگر کسی نے دکان نہیں کھولی۔ البتہ ہوٹلوں کا کام شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا، دکانیں کس وقت کھلتی ہیں۔ اس نے کہا، ''کچھ دس بجے اور کچھ گیارہ بجے۔''

''اتنی دیر سے کیوں؟''

''رات کو جو ۱۲ بجے تک کھلی رہتی ہیں۔''

میں گھوم پھر کر گھر آگیا۔ مبادا گھر والے میرے انتظار میں ہوں۔ گھر ابھی تک غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بلا کر پوچھا ''گھر والے کب اٹھیں گے؟''

وہ بولا ''وقت مقرر نہیں ہے، جس کا جب دل چاہتا ہے اٹھ بیٹھتا ہے۔''

''پتا کیسے لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب لوگوں کے کمروں سے تیز میوزک کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔''

میں سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے چوکیدار سے پوچھا تو وہ بولا ''نکڑ والے

ہوٹل پر بہت اچھی چائے ملتی ہے، لے آؤں؟"

میں نے کہا "میں خود وہاں سے پی آؤں گا۔"

میں باہر نکل کر اس گندے غلیظ ہوٹل میں آ بیٹھا۔ چائے کا آرڈر دیا۔ پورے بازار کا حلیہ بدل چکا تھا۔ دکانوں کا ڈیزائن بدل چکا تھا۔ ہوٹل کے اندر سمع خراش قسم کا میوزک بج رہا تھا۔ دکانیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔ میں چائے پی کر واپس آ گیا۔ چوکیدار بھی ناشتا کر چکا تھا۔ میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ حاجی صاحب کے دونوں بیٹے بھی فوت ہو چکے تھے۔ اب اس گھر میں ان کے پوتے پوتیاں رہتے تھے۔ یہ مجھے فون پر نورسحر نے بتایا تھا۔

میں نے گیٹ میں کھڑے ہو کر اس ۴ر منزلہ عمارت کو دیکھا۔ مجھے اس کی چھت پر جانے کی طلب ہونے لگی۔ میں نے چوکیدار سے کہا "میں چھت پر جانا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا "چھت پر کچھ نہیں ہے۔ پانی کی ٹینکیاں لگی ہوئی ہیں یا گھر کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے سیڑھیاں دکھاؤ، میں جاؤں گا۔"

وہ مجھے سیڑھیوں کی طرف لے آیا اور بولا "سر آپ اتنی زیادہ سیڑھیاں چڑھ نہیں سکیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" واقعی یہ وہ چھت نہیں تھی۔ چار تو پانی کی ٹینکیاں بنی ہوئی تھیں۔ چار ہی ڈش انٹینے لگے ہوئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے کولر، ایئر کنڈیشنر اور موٹروں کے فاضل پُرزے پڑے تھے۔ میں نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ وہ جھروکے کہیں نہیں تھے۔ میں نے اُچک اُچک کر چاروں طرف دیکھا۔ ہمسایوں کے گھر بھی ویسے نہیں تھے۔ تقریباً ہر گھر ۲ر منزلہ یا ۳ر منزلہ ہو چکا تھا۔ چھتوں کے اوپر ٹینکیاں اور انٹینے ہی نظر آ رہے تھے۔ ہر گھر دوسرے سے بیگانہ کھڑا تھا۔ چھت پر سے سارے شہر پر نظر ڈالی تو اس کے اندر پہلے والی طمانیت اور سکون نظر نہیں آیا۔ ایک بے چینی تھی جو سارے گھروں پر منڈلاتی پھر رہی تھی۔ شاید ہر گھر کے اندر وہ پہلے والے لوگ بھی نہیں تھے۔ یہ سوچتے ہی میرا دل بھر آیا۔ میں پیچھے کو مڑا تو نہیں چوکیدار کب کا مجھے چھوڑ کر جا چکا تھا اور میں بغیروں کے دائروں میں پُرانا وقت کھوجتا رہ گیا تھا۔

میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے اور نیچے اُترنے لگا۔ نیچے سے بڑے پُرشور مغربی سازوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاید گھر والے جاگ گئے تھے۔ آدھے رستے میں مجھے چوکیدار آتا مل گیا۔ بولا "صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

آخری منزل کے دروازے میں حاجی صاحب کا پوتا نائٹ سوٹ میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ہیلو انکل! کل رات دیر تک پارٹی ہوتی رہی۔ میں اسٹیشن پر گاڑی بھیجنا بھول گیا۔ اُمید ہے آپ کو تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔"

"بس بیٹا! تکلیف کیسی یہ تو اپنا گھر ہے۔"

پھر وہ جلدی سے بولا "آپ آنٹی کی قبر پر جانا چاہتے ہیں۔ میں نے دفتر سے اپنا چپراسی بلا لیا ہے وہ آپ کو لے جائے گا۔ مجھے ذرا تیار ہو کر ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ رات کو ملاقات ہوگی انکل۔" وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا۔ یہ پوچھے بنا کہ میں نے ناشتا کیا ہے یا نہیں، کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ کہاں سویا تھا، کیسے آیا تھا۔ یہ اس گھر کا دستور تھا۔

میں نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور چپراسی کے ساتھ قبرستان آ گیا۔ اس نے قبر کی نشاندہی کر دی تو میں نے اسے رخصت کر دیا۔ میں آتے ہوئے بازار سے بہت سارے پھول لے آیا تھا۔ سارے پھول میں نے نورسحر کی قبر پر ڈال دیے۔ پھر دل بھر آیا۔ کیا کیا نہ یاد آیا، بیٹھا روتا رہا، چپ چاپ روتا رہا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ اپنا سفری بیگ اٹھایا اور بولا "نورسحر! تم نے ناحق یہاں دفن ہونا پسند کیا۔ وہاں میرے پاس رہتیں، میں روز تمہاری قبر پر پھول چڑھانے آیا کرتا۔ اس شہر میں تم بھی اجنبی ہو اور میں بھی۔ کیونکہ اس شہر میں اب وہ جھروکوں والی ثقافت نہیں ہے۔ اب یہ شہر بھی آسایشوں کی کثافت سے گہنا گیا ہے۔

اُردو ادب

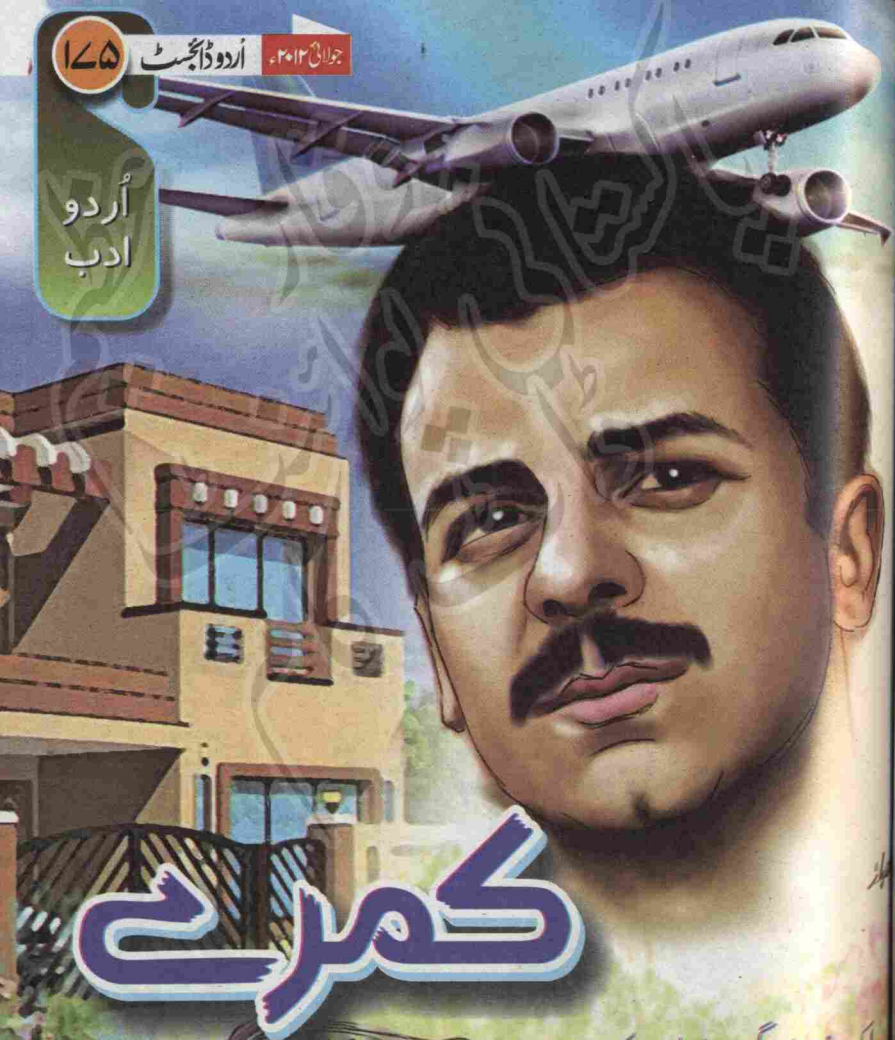

کمرے

ایک ہنستے بستے گھر کا المناک ماجرا

وہاں بچوں کو اپنے الگ الگ کمرے میں رہنے کی بہت آرزو تھی
دور دیس میں مشقت کرنے والے باپ کا رُلا دینے والا قصہ
اس نے اپنے بچوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا

سالوں پہلے لکھی گئی آج کی کہانی

نیلم احمد بشیر

گاڑی

ایک جھٹکے سے رک گئی۔
امجد چونک گیا، اس کا گھر آ گیا تھا۔
بھائی جان اس کے وزنی سوٹ کیس اٹھا کر اندر چلنے لگے۔ وہ باہر نکل کر چاروں طرف بغور دیکھنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سائنس فکشن فلم کا کردار ہو اور کسی ایلین فارن لینڈ سے اڑن طشتری میں سے آن اترا ہو۔

امریکا سے آنے کے بعد پاکستان کتنا مختلف اور عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ سنت نگر جو اس کا پرانا محلہ تھا، اجنبی اور گھر میلا میلا، گندا، پرانا سا لگ رہا تھا۔ گلی میں چلتے پھرتے لوگ بھی کالے کالے اور پسینے سے بھیگے بھیگے دکھائی دے رہے تھے۔ حالانکہ ابھی صرف صبح کے نو ہی بجے تھے اور اپریل کا مہینہ خوبصورت بہاروں کا پیغام لیے اترا یا اترا یا، خوشبودار جھونکوں کی ناز برداریاں کر رہا تھا۔

''ابو آ گئے، ابو آ گئے'' کہہ کر بچوں نے اس کا بھرپور استقبال کیا۔

اس کی بیوی حسنہ بھی جلدی سے دوپٹہ سنبھالتی باہر گلی میں آ گئی اور سب ایک دوسرے سے بھرپور انداز میں ملے۔ امجد دو سال بعد پہلی بار امریکا سے واپس ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا، اس لیے اپنے بال بچوں سے مل کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ یہ جدائی کے دن اس نے کتنے گن گن کر کاٹے تھے۔ پردیس میں تنہائی صرف کمائی کے لیے ہی تو برداشت کی تھی ورنہ اس کا بس چلتا تو کبھی اپنا ملک اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر نہ جاتا۔

امریکا جانے سے پہلے وہ سنت نگر میں ہی دیو سماج روڈ کے بازار میں ایک چھوٹی سی فوٹو گرافی کی دکان سے گزر اوقات کر لیا کرتا تھا۔ اس کے دوست شکیل نے اسے اپنے ساتھ امریکا لے جا کر سیٹ کرنے کی ہامی بھری تو اس سے انکار نہ ہو سکا اور ایک بہتر مستقبل کی خاطر اس نے وطن کو خیر باد کہہ دیا۔

شکیل نے اسے بھی راچسٹر (Rochester) نیویارک میں کوڈک فوٹو کمپنی میں اپنے ساتھ نوکری دلوا دی اور دونوں دوست ایک اپارٹمنٹ شیئر کر کے رہنے لگے۔ دونوں اپنے بال بچوں کے لیے پیسے بچانے کی سوچتے اور واپس جانے کی باتیں کرتے رہتے۔

امجد پہلی بار واپس آیا تھا اور حسب توقع اس کے سامان میں گھر کے لیے بجلی کے Appliances مثلاً جوسر، بلینڈر، چوپر، استریاں، سب کچھ موجود تھا۔ اس کے بیوی بچے اپنے لیے لائی گئی چیزیں دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سما رہے تھے۔

اس کا ۱۵ سالہ بیٹا ندیم جو ابھی ابھی میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا، اپنے لی وائیز برانڈ کی امریکن جینز اور ری باک (Reebok) برانڈ کے سنیکرز جوتے پہن کر باری باری سب کو دکھا رہا تھا۔ ان جینز کی فٹنگ کتنی عمدہ تھی، انہیں پہن کر تو ڈھیلا ڈھالا آدمی بھی سمارٹ لگنے لگ جاتا ہے۔ اسی لیے تو اس کے ابو نے بھی جینز پہن رکھی تھی اور کتنے ینگ لگ رہے تھے۔ ابو کے بجائے فرینڈ بنا لینے کو جی چاہ رہا تھا انھیں اور جوتے تو اتنے آرام دہ تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ آسمان پر اڑ رہا ہو۔

ابو کانوں میں سپیکرز لگا کر سننے والا سٹیریو واک مین بھی تو لائے تھے اور ساتھ ہی تازہ ترین امریکن ٹاپ کے میوزک کیسٹ۔

''ابو! تھینک یو سو مچ۔ میرے سب دوستوں کے پاس واک مین ہیں، اب تو میں بھی ان سے کم نہیں رہا'' ندیم کانوں میں لگے سٹیریو سے اٹھتی بیٹ (Beat) پر چٹکیاں بجانے لگا۔

نادیہ اور شازیہ ابھی ٹین ایجرز ہی تھیں۔ دونوں میں سال بھر کا فرق تھا مگر نادیہ کا قد جو ایک سال شازیہ سے چھوٹی تھی، اپنی بہن سے لمبا تھا۔

''ارے تم دونوں کتنی بڑی ہو گئی ہو ماشاء اللہ۔ میں تو تمھیں بچیاں سمجھ کر تمھارے لیے کھلونے لایا تھا مگر اب تو لگتا ہے، تمھیں تمھاری امی کے حصے کی چیزیں ہی دینی پڑیں گی۔'' امجد پیار سے بولا۔

"کوئی بات نہیں ابو ہم اپنا بندوبست کرلیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔" انھوں نے نقلی جیولری، پرس، جوتوں اور میک اپ کے سامان کی چھانٹی کرتے ہوئے ہنس کر اسے تسلی دی۔ حسنہ بھی نئے نئے سویٹر اور سوٹوں کے کپڑے دیکھ دیکھ کر کھلی جارہی تھی۔

سارے گھر میں نئی نئی چیزوں کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ ہر طرف خوشی اور ایکسائٹمنٹ کا راج تھا۔ محلے والے بھی آ آ کر چیزیں دیکھ رہے تھے، مبارک بادیں مل رہی تھیں۔ امجد لمبے سفر کی تھکان اور جیٹ لیگ (Jet Lag) کی وجہ سے دوپہر کا کھانا کھا کر سوگیا۔

شام کو جاگا تو اس کے بیوی بچے پھر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ ہر کوئی اس سے پیار سے لپٹ رہا تھا، باتیں کررہا تھا۔ تحفوں پہ تبصرے ہو رہے تھے۔ بہن بھائی ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ ندیم اور شازیہ کی آپس میں کبھی بنی نہ تھی۔ ندیم اسے نئی ہیل والی جوتی پہنے دیکھ کر چڑا رہا تھا۔

"تم جتنی مرضی اونچی ہیل پہن لو شاذی تم رہو گی، گٹھی کی، گٹھی۔"

"اچھا ندیم کے بچے۔ اگر زیادہ بکواس کی تو رات سوتے میں پانی پھینک دوں گی، سونا تو تم نے میرے ساتھ والی چارپائی پہ ہی ہے نا۔" شازی نے بھرپور جوابی حملہ کیا۔

شام کا سے بہت سہانا تھا۔ حسنہ پانی کا پلاسٹک پائپ پکڑے شلوار کے پائنچے اوپر چڑھائے اینٹوں کے سرخ سرخ فرش پر چھڑکاؤ کررہی تھی۔ اینٹیں اپنا منہ دُھلوا کر چمک رہی تھیں۔

چھڑکاؤ کے بعد گیلی مٹی میں سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو موتیے کی کلیوں کی کنواری کچی باس سے ہم آغوش ہونے لگی۔ امجد نے آنکھیں موندکر اس خاص مہک کو بھرپور انداز میں سونگھا اور اپنے اندر اتار لیا۔ اس خوشبو سے بھی تو وہ ۲ سال تک بچھڑا رہا تھا۔ دوری کے درد کے زہر کی ٹیسیں اسے اپنے دل میں محسوس ہونے لگیں۔

"ابو چائے پئیں گے!" شازیہ نے اس کے آگے پیالی بڑھادی۔ حسنہ اور ندیم بھی پاس آگئے۔ نادیہ نے صحن میں کھڑی چارپائی بچھا کر گدا ڈال دیا اور سب نے وہیں مجلس جما دی۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکنے لگا۔ دنیا جہان کی باتیں چھڑ گئیں، قصے بیان ہونے لگے۔ امجد انھیں امریکا کے متعلق بتاتا رہا۔ وہ اس کو اس کے پیچھے گزرے وقت کی خبریں سناتے رہے۔ ٹی وی بھی صحن میں ہی تار بڑھا کر لگا لیا گیا تھا۔ سب مل کر ٹی وی دیکھتے رہے۔ حسنہ بیچ میں کبھی کبھار اٹھ کر کھانے کا بندوبست کرتی رہی۔ لڑکیاں بھی ابو کے لیے خاص پکوان پکا چکی تھیں۔

اس شام رات ہونے پہ سب نے وہیں ایک چارپائی پر پلاسٹک بچھا کر کھانا کھایا۔ بچوں کی آپس میں چھینا جھپٹی اور چھیڑ چھاڑ اور حسنہ کی میٹھی میٹھی نظروں کا مزا لیتے ہوئے امجد کو اپنے بے انتہا خوش قسمت اور دولت مند ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

"اللہ نے مجھے کتنا پیار کرنے والا خاندان دیا ہے۔ صابر وشاکر خوبصورت، ہمیشہ مسکراتی ہوئی بیوی اور فرمانبردار، خیال رکھنے والے بچے، اپنی قسمت پر میں جتنا ناز کروں اُتنا ہی کم ہے۔"

امجد دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ انسان کا اصل سرمایہ تو یہی ہے۔ اس دولت کو پانے کے لیے کسی غیر ملک کو جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ کھیتی اپنے ہی دیس میں اُگتی ہے، کتنا قرب ہے ہم سب میں۔ یہ تعلق، یہ ربط، یہ اپنائیت، یہ رشتے یہی تو ہمارے کلچر اور دیس کی سوغات ہیں۔ یہی کمی مغربی معاشرے میں ہے اور اسی لیے انسان انسان سے دور ہیں۔ دلوں کے درمیان فاصلے ہیں۔ ہاتھ بڑھائیں تو ہاتھ کوئی تھامتا نہیں۔ غیریت دلوں میں پکے ڈیرے جمائے رہتی ہے۔

وہ اپنے بال بچوں کو یہی فلسفے سمجھاتا رہا۔

انھیں بتاتا رہا کہ مغرب میں لوگ مادی زندگی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے انسانی، اخلاقی اقدار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ بچے ماں باپ کو بوجھ سمجھتے ہیں اور ماں باپ بچوں کو۔

حسنہ کو تو حیرت سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا اور وہ یقین نہ آنے کے انداز میں سر ہلا رہی تھی۔

"یہ بتائیں ڈیڈی! کیا میں بھی آپ کے ساتھ امریکا جاسکوں گا؟" ندیم پوچھنے لگا۔

"دیکھتے ہیں بیٹا کہ آپ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد کیا رجحان رکھتے ہیں، سوچیں گے۔" امجد نے اسے تسلی دی۔

رات کے بارہ، ایک بجے محفل برخاست ہوئی۔ وہ بھی اس لیے کہ صبح بچوں نے سکول، کالج جانا تھا، ورنہ اٹھنے کو کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"چلو ندیم بیٹا! اپنی چارپائی بچھا لو اور بہنوں کے ساتھ چھیڑخانی نہیں کرنا۔ رات بہت ہوگئی ہے اور تمھارے ابو بھی تھکے ہوئے ہیں۔ سب سو جائیں اب سن لیا نا۔" حسنہ نے بچوں کو ان کے کمرے میں بھیجتے ہوئے فائنل ہدایات دیں۔

ندیم نے چارپائی اٹھا کر اندر ڈال لی اور آرام سے لیٹ گیا۔ شازیہ اور نادیہ کے پلنگ پہلے سے ہی کمرے میں بچھے رہتے تھے۔ اس لیے وہ بھی اپنے اپنے بستر پر دراز ہوگئیں۔ اس پرانے گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں حسنہ اور امجد سوتے تھے اور دوسرا تینوں بچوں کے زیراستعمال رہتا تھا۔ بچوں کے کمرے میں دونوں لڑکیوں کے پلنگ اور ایک کپڑوں کی الماری کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ رات کو سونے کے لیے ندیم ایک فالتو چارپائی بچھالیتا اور صبح اسے اٹھا کر صحن میں کھڑا کرلیا کرتا تھا۔

بچوں کے کپڑے پرانے صندوقوں میں پلنگوں کے نیچے رکھے جاتے تھے البتہ الماری میں تینوں بچوں کو ایک ایک خانہ ضرور دے دیا گیا تھا۔ ندیم تو اپنے خانے میں بھی کپڑے ہی ٹھونس دیا کرتا تھا مگر شازیہ نے اپنا خانہ پُرانی گڑیوں، چند کھلونوں، گڑیوں کے کپڑوں، ننھے منے صوفہ سیٹ اور اَلا بلا سے بھر رکھا تھا۔

نادیہ کا خانہ البتہ بہت ستھرا اور قرینے سے سجا سجایا تھا۔ کبھی کبھار ندیم اور شازیہ مل کر جان بوجھ کر اس کے خانے کی چیزیں اِدھر اُدھر کردیتے تو وہ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔

"میرا خانہ خراب کس نے کیا؟ کس نے میری چیزیں چھیڑی ہیں؟"

اس نے اپنے خانے میں اپنی ایک پرائیویٹ سی دنیا بسا رکھی تھی، محفل سجا رکھی تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں کے ٹکڑے قالین کے طور پر بچھے ہوئے تھے جن پہ ننھی منی ڈیکوریشن کی چیزیں، کتابیں، ہار، موتی ٹانک رکھے تھے۔ جب کبھی وہ "فارفرام دی میڈنگ کراؤڈ" یعنی دنیا سے دور چلے جانا چاہتی، اپنی دنیا میں گم ہوجاتی۔ الماری کھول کر اپنا چہرہ اپنے خانے میں ٹکا کر چپ چاپ بیٹھے اسے تکے جاتی۔ "ایلس ان ونڈرلینڈ" کی طرح ننھی منی ہوکر الماری کے خانے کے اندر کے ماحول کا حصہ بن جاتی، مدغم ہو جاتی۔ کبھی کبھار تو اس کی ماں اُس کی اُس اپنی الماری کے خانے سے آبسیشن (Obsession) سے چڑ کر اسے ڈانٹ دیتی۔

"کہاں گم رہتی ہو؟ گھر کے کام کاج کی بھی تمھیں ہوش نہیں رہتی۔" ندیم اور شازیہ بھی مذاق اُڑانے لگتے۔

"نادیہ کہاں ہیں؟ بھئی اپنی خانہ آبادی کررہی ہوگی۔" نادیہ دانت پیس کر رہ جاتی۔

امجد کو آئے دس پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اس کا وقت بہت اچھی طرح گزر رہا تھا۔ چھٹیاں جلدی جلدی گزر رہی تھیں۔ ایک صبح چھٹی کے روز جب سب مولیوں والے پراٹھے اور لسی کا ناشتا کرکے کچن میں ہی بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے تو ندیم یکلخت بولا:

"ڈیڈی! آپ اگلی بار ہمارے لیے کار لائیں گے نا؟" اب اس نے امجد کو ڈیڈی کہنا شروع کردیا تھا۔

"گاڑی۔ لو گاڑی بھلا اس سڑے ہوئے محلے میں کیا اچھی لگے گی۔ نہیں ابو پہلے تو ہم نیا گھر لیں گے، پھر گاڑی لیں گے۔ ہیں نا؟" شازیہ نے اپنی رائے ظاہر کی۔

حسنہ نے استفسارانہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور وہاں جواب پڑھ کر میز پر سے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اچھا اچھا۔ زیادہ فرمایشیں کرنے کی ضرورت نہیں، اس گھر میں کیا برائی ہے؟ اچھا بھلا تو ہے اور گاڑی کے بغیر کیا ہمارا گزارا نہیں ہو رہا۔ خدا کا شکر ادا کرو، اس نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے۔ تم لوگ تو منہ پھاڑ کر چیزیں ہی مانگتے چلے جاتے ہو۔ تمھارے ابو خیریت سے واپس آگئے ہیں، ہمیں اور کیا چاہیے۔''

''ویسے ابو!'' نادیہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک بڑا سا گھر تو ہونا چاہیے۔ یہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ دیکھیں نا۔ ندیم کو بھی ہمارے ہی کمرے میں رہنا پڑتا ہے۔ ہمیں تنگ کرتا ہے، مجھے تو اپنا علحدہ کمرا پانے کی حسرت ہے۔'' وہ خلاؤں میں گھورنے لگی۔

''اچھا تنگ میں کرتا ہوں یا تم دونوں مجھے تنگ کرتی ہو؟ مجھے کون سا تمہارے سڑے ہوئے لڑکیوں والے کمرے میں رہنا پسند ہے۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میرا اپنا علحدہ کمرا ہو۔ لڑکوں والا کمرہ جہاں میرے دوست آ کر بیٹھ سکیں۔ یہاں تو میں کسی کو بلا بھی نہیں سکتا۔ میرے سب دوستوں کے اپنے اپنے کمرے ہیں۔''

''اور ان کے باپ سمگلر بھی ہیں۔'' حسنہ نے مادرانہ غصے سے کہا۔

''تمھارا باپ ایماندار ہے۔ تمھیں حلال کی کمائی کھلاتا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟''

''ارے ارے حسنہ۔ جانے دو، غصہ نہ کرو، بچے ٹھیک کہتے ہیں، وہ اپنی جگہ سچے ہیں۔'' امجد نے پیار سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بھئی میں سمجھتا ہوں۔ تم لوگ اب بڑے ہو گئے ہو۔ تمھارے دوست ہیں، سہیلیاں ہیں، دنیا کے ساتھ ساتھ تو چلنا ہی پڑتا ہے سب کو، ہم ان شاء اللہ بڑا سا گھر ضرور لیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مگر ابھی کچھ وقت لگے گا، تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں ابو! آپ فکر نہ کریں۔ ہمیں جلدی نہیں، ہم انتظار کرلیں گے۔ بس آپ اگلی بار جب آئیں تو ہم نیا گھر لے لیں گے ٹھیک ہے نا؟'' شازیہ نے پیار سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اور میں سکون سے اپنے کمرے میں پڑھائی کر سکوں گی۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہیں کرسکے گا، میری اپنی چیزیں ہوں گی، گانے سن سکوں گی۔'' نادیہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔

''سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ندیم کے میلے کپڑوں اور بدبودار جوتوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ ہائے..... کتنا مزا آئے گا۔'' شازیہ نے لقمہ دیا۔

حسنہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ قابل تو وہ بھی دل ہی دل میں ہو چکی تھی مگر وہ اپنے محبوب شوہر پر بلاوجہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ پہلے ہی اس پر اتنی ذمے داری تھی اور گھر سے دور رہ کر وہ خوش نہیں تھا تو پھر وہ اس سے کس طرح ایسے مطالبے کرسکتی تھی؟

حسنہ جب رات کو اپنے کمرے میں سونے کے لیے آئی تو امجد کا چہرا اُترا ہوا تھا۔ اس نے امجد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے ہولے ہولے سہلانے لگی۔

''دل چاہتا ہے اپنے بچوں کی خواہش کھڑے کھڑے پوری کردوں لیکن ایک بڑا گھر جس میں سب کے اپنے اپنے کمرے ہوں، نہ جانے میں کب انھیں دینے کے قابل ہوسکوں گا۔ کم از کم ۲۰ لاکھ تو چاہیے، آج کل پراپرٹی کی قیمتیں بھی تو آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ پروگرام کے مطابق اگر ۲ سال تک واپس آگیا تو بمشکل پانچ چھ لاکھ ہی بچت کرسکوں گا۔ میں تو سوچ رہا تھا کسی اچھے علاقے میں فوٹوگرافی کی ہی ایک بہتر دکان کھول لوں گا۔ مگر اب.....''

''آپ بچوں کی فکر نہ کریں۔'' حسنہ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ ''میں انھیں سمجھالوں گی۔ وہ تو ایسے ہی ریس کرنے لگے ہیں لوگوں کی دیکھا دیکھی۔ اگر ممکن نہیں ہے تو انھیں ایسے ہی گزارا کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ بس آپ کی خیر و عافیت سے وطن واپسی ہو، ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ ایک سلیقہ شعار بیوی کی طرح سمجھداری کا ثبوت دے رہی تھی۔

امجد اس کی گود میں سر رکھے ہی سو گیا۔

چھٹی سے واپس امریکا آنے کے بعد امجد پر بس ایک ہی دُھن سوار ہوگئی۔ وہ دن رات پیسا کمانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب تو ایک بڑا سا خوبصورت گھر اسے بھی خیالوں میں آکر رِجھانے لگا تھا۔ اس نے مون لائٹنگ شروع کردی تھی۔ یعنی پارٹ ٹائم چھوٹے موٹے دوسرے کام بھی پکڑ لیا کرتا تھا۔ راجسٹر جسے فلاورسٹی بھی کہا جاتا ہے، اپنی لائی لیگ کی کاسنی پھولوں کی جھاڑیوں کی وجہ سے بہت مشہور شہر ہے۔

مڈٹاؤن پلازا نامی شاپنگ سنٹر میں نائٹ واچ مین کی جاب خالی تھی۔ امجد نے شکیل کے منع کرنے کے باوجود یہ کام لے لیا۔ حالانکہ شکیل کہتا رہا کہ یہ بہت مشکل جاب ہے۔ ایک تو کرائم کی وجہ سے خطرہ بہت ہوتا ہے۔ دوسرے موسم سرما میں جب سیکورٹی گارڈ کو رات رات بھر پیدل چوکیداری کرنی پڑتی ہے تو جان پر بن جاتی ہے۔

''مگر یار اس کی اُجرت ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے اتنی زیادہ ہے کہ میں اس کو مس نہیں کرسکتا۔'' امجد بولا۔

''اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ امریکی لوگ یہ جاب نہیں پکڑتے کیونکہ اس میں تکلیف اتنی ہے، سارے ایشیائی اور ہسپانوی ہی یہ نوکریاں کرتے ہیں۔'' شکیل نے یاد دلایا۔ مگر امجد نہ مانا۔ رات جاگنے میں تو امجد کو کوئی خاص دقت نہیں ہوئی مگر سردی نے واقعی اس کے حوصلے پست کردیے۔ سردی ستمبر سے شروع ہو کر اپریل تک جاری رہتی۔ بیچ بیچ میں کبھی کبھار ایسے شدید برف کے طوفان آجاتے کہ زندگی معطل ہو کر رہ جاتی۔

رات کو برف باری کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ مڈٹاؤن پلازا کے اردگرد چکر لگاتا رہتا۔ موٹے موٹے کوٹ، دستانے، مفلر ٹوپی پہنے روبوٹ کی طرح چلتا رہتا۔ برف میں اس کے قدموں کے نشان بنتے چلے جاتے اور جب تک وہ اپنا دوسرا چکر شروع کرتا نئی گرنے والی برف اس کے نشان مٹا چکی ہوتی۔ اس کے ہاتھ جیبوں میں ٹھنڈے رہتے مگر دل کو بیوی بچوں کی یاد گرمائے رکھتی۔ وہ تازہ دم ہونے کے لیے کافی کا تھرماس کھولتا اور صبح ہونے پر واپس چلا جاتا۔ اس کے بعد اسے اپنی ریگولر جاب پر بھی جانا ہوتا تھا۔

ایک سال گزرنے کو تھا۔

گھر سے آنے والے خطوں میں محبتیں اور فرمایشیں دونوں ہوتیں۔ نئے گھر کے خواب کا ذکر پہلے سے کچھ زیادہ ہونے لگا تھا۔ امجد بے چین ہو ہو جاتا۔ دو دو نوکریاں، رات دن کرنے کے باوجود وہ زیادہ پیسا نہ بچا سکا تھا۔ گھر بھی باقاعدگی سے پیسے بھیجنا ہوتے تھے آخر۔ نیا گھر صحرا میں دکھائی دینے والا سراب تھا۔ آگے ہی آگے بھاگتا نظر آتا تھا۔

''یار دل چاہتا ہے اپنی بھی لاٹری نکل آئے۔ وارے نیارے ہوجائیں پھر تو۔''

امجد کا دوست شکیل اسے ایک دن لنچ بریک میں بتانے لگا کہ ان کے ایک ساتھی کی جو کیوبا سے آیا ہوا تھا، نیویارک سٹیٹ لاٹری نکل آئی تھی۔ اب اس نے ملین ڈالر کا انعام پانے کے بعد کوڈک فوٹو کمپنی میں ٹرک ڈرائیور کی نوکری چھوڑ دی تھی۔

''چھوڑ یار لاٹری پانے والوں کی قسمت اور ہی ہوتی ہے۔ اپنی قسمت میں تو مشقت ہی لکھی ہے۔ یہ بتاؤ وہ مسٹر جان سن آج کل نظر نہیں آرہا۔ وہ بڈھا لفٹ آپریٹر تو بہت پرانا ملازم تھا یہاں، کیا کوئی نیا رکھ لیا گیا ہے۔'' امجد نے اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرتے شکیل سے اس مسٹر جان کے بارے میں پوچھا جو اسے بڑے تپاک سے روزانہ ہیلو ایم جیڈ کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

''ارے تم نے خبر نہیں سنی؟ سمجھو اس کی بھی لاٹری نکل آئی۔'' شکیل نے اطلاع دی، ''کیوں کیا ہوا اسے؟''

''یار پچھلے منڈے کی ہی تو بات ہے تمھیں شاید پتا نہیں لفٹ اچانک خراب ہوگئی۔ الیویٹر سسٹم تو ایک رسی نما چیز پر ہی سفر کرتا ہے نا، اوپر نیچے بہرحال کوئی نقص پڑ گیا اور لفٹ ایک جھٹکے سے جو نیچے آخری منزل سے ٹکرائی تو مسٹر جان سن زخمی ہوگیا۔

''اوہ یار یہ تو بہت برا ہوا، بابا بہت سویٹ تھا۔'' امجد افسوس کرنے لگا۔

''ہاں یار۔ ہسپتال میں پڑا ہے۔ دو آپریشن ہو چکے ہیں مگر چلنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''اف کیا بدقسمتی ہے یار نوکری بھی تو گئی نا۔'' امجد بجھ سا گیا۔

''چھوڑ یار اب اس کو بھی نوکری کرنے کی ضرورت ہی کہاں ہے۔ کمپنی نے ڈس ایبلٹی انشورنس تو کروا رکھی ہوتی ہے نا۔ Compensation کی وجہ سے خرچہ تو ساری عمر ملے گا کیونکہ آن دی جاب چوٹ لگی تھی۔ بابے کو یہ فکر تو نہیں رہی نا۔'' امجد چپ ہو گیا۔

''یار میں تو کہتا ہوں مجھے کسی کا کتا ہی کاٹ لے تاکہ میں اس کے مالک پر مقدمہ کر دوں اور کچھ نہیں تو ایک دو مہینے کے خرچ کے پیسے تو مل ہی جائیں گے نا۔'' شکیل اور امجد ہنسنے لگے۔

حسنہ تار ہاتھ میں پکڑے حیران کھڑی تھی۔ امجد نے اپنے اگلے روز آنے کی اطلاع دی تھی۔ خوشی تو اسے بہت ہو رہی تھی مگر حیرت کا جذبہ اس خوشی پہ غالب آ رہا تھا۔ امجد صبح ۱۱ بجے کی فلائیٹ سے پہنچ رہا تھا اور صرف ایک شام باقی تھی مگر یہ اچانک پروگرام کیسے بن گیا۔ کہیں اداسی اور تنہائی کی وجہ سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وقت سے پہلے تو نہیں آ رہے؟ ابھی تو حساب سے ان کے آنے میں چھ ماہ باقی تھے۔ پیسا بھی کوئی خاص جمع نہ ہو سکا ہوگا، وہ فکرمند ہو گئی مگر بچوں کو پُرجوش دیکھتے ہوئے اس نے ذہن سے سارے بدخیالات کو نوچ ڈالا اور منفی سوچوں کو جھٹک دیا۔

''اگر ابو پہلے سے اطلاع دیتے تو میں ان سے اور جینز اور جوتے منگوا لیتا۔ خیر کچھ نہ کچھ تو لا ہی رہے ہوں گے نا۔'' ندیم قیاس آرائیاں کرنے لگا۔

اس بار امجد کے بھائی جان نے دو گاڑیوں کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ سب لوگ لینے کے لیے ایئرپورٹ جا سکیں۔ جہاز کچھ لیٹ آیا تھا۔ اس لیے حسنہ اور بچے انتظار کر کر کے تھک گئے۔ مسافر آنا شروع ہو گئے مگر امجد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے اسے اتنی دیر کیوں لگ رہی تھی۔

''شاید سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔'' بھائی جان کہنے لگے۔

بالآخر امجد انھیں نظر آ گیا، وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے ہوئے تھا اور اس کا ہینڈ بیگ اس وہیل چیئر کی سائیڈ پر لٹک رہا تھا جس میں وہ بیٹھا اس کو اپنے ہاتھوں سے دھکیلتا چلا آ رہا تھا۔

سب کے پاؤں میں میخیں گڑ گئیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہ پیدا ہوئی کہ وہ آگے بڑھتا۔ ان کے چہروں پہ حیرت اور شاک کے تاثرات دیکھ کر امجد خوش دلی سے ہاتھ ہلاتا خود ہی پاس آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے بھئی؟ کوئی گلے نہیں ملے گا ہمیں؟'' اس نے لپک کر بھائی جان کے آگے بازو پھیلا دیے۔ باری باری سب بغل گیر ہوئے۔ حسنہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک گئے۔ سامان رکھوا کر گاڑی گھر کو چل دی۔

راستہ خاموشی سے کٹا۔ سب کے ذہن سوالات سے بھرے ہوئے تھے لیکن جواب کے خوفناک ہونے کے ڈر سے کوئی بات نہیں چھیڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی حقیقت کے نہ جاننے میں بھی راحت ہوتی ہے، گھر پہنچ کر خود ہی امجد نے بات شروع کی۔

اس نے بتایا کہ ایک روز وہ حسبِ معمول نیچے کے کمپاؤنڈ میں کھڑا خام مال کی ڈیلیوری، ٹرک سے اوپر کو بھجوا رہا تھا کہ وہ رسی جو پُلی (Pulley) کے ذریعے اوپر سامان کھینچتی ہے، ٹوٹ گئی۔ ایک بہت بھاری ڈبوں کا ڈھیر اس پہ آن گرا اور وہ زخمی ہو گیا۔ ایک ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد اسے اس افسوس ناک حقیقت کی خبر کے ساتھ چھٹی دے دی گئی کہ وہ اب اپنی ٹانگوں کے استعمال سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔

''ایک ماہ آپ زخمی اور اکیلے ہسپتال میں پڑے رہے اور ہمیں خبر تک نہ دی۔''

حسنہ رونے لگی۔ بچے بھی اُداس چہرے لیے باپ کے اور قریب آ گئے تھے۔ بھائی جان غصے ہونے لگے۔

''آخر ہم سب مر گئے تھے کیا؟ دکھ سکھ میں ہی ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے خبر کیوں نہ دی۔''

''آپ سب لوگوں کو پریشان کر کے مجھے کیا ملتا؟ آخر آپ وہاں آ تو نہیں سکتے تھے نا؟ ویسے بھی میری بہترین میڈیکل کیئر تو ہوتی ہی رہی تھی۔ کمپنی نے سارا ہسپتال کا خرچہ اٹھایا اور پھر شکیل نے بہت خیال رکھا میرا۔'' امجد نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''چلیں کچھ بھی ہوا۔ اب تو آپ ہمارے پاس ہیں ابو۔ اب ہم آپ کو کہیں نہ جانے دیں گے۔'' نادیہ نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ارے بھئی آپ سب لوگ فکر نہ کریں۔ میں زندہ سلامت ہوں ٹھیک ٹھاک ہوں اور اس وہیل چیئر پر اچھی طرح گھوم پھر سکتا ہوں۔ سب سے ماڈرن لیٹسٹ ماڈل ہے یہ۔ دیکھو اس میں کتنے گیئرز ہیں، کسی کار سے کم نہیں یہ سواری۔''

امجد نے آگے پیچھے وہیل چیئر کو گھما پھرا کر بچوں کو الٹے سیدھے کرتب دکھا کر محظوظ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے چہروں پہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ کھلنے لگی۔ وہ ہمیشہ انھیں مسکرانے پہ مجبور کر دیا کرتا تھا، یہ اس کی خوبی تھی۔

''اور چاہو تو تم لوگوں کو ایک ایک کر کے اس ''میجک کار'' پر سواری بھی کروا دیا کروں گا۔'' اب بچے ہنسنے لگے تھے۔

رات کو آنگن میں چارپائیاں بچھا کر سب ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر حسبِ معمول گپ شپ کرنے لگے۔ امجد جو تحفے ان کے لیے پھر لایا تھا، ان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اس عظیم حادثے کے باوجود امجد کی موجودگی کی وجہ سے ان کے دل مسرت کی دولت سے مالا مال تھے۔ امجد کی ذات ہی خوشی کا باعث بن جاتی تھی۔ وہ سب کے ساتھ اتنی خوش دلی اور دوستی سے پیش آتا تھا کہ اس کی بیوی بچے اس کی کمپنی میں ہر دکھ بھول جایا کرتے تھے۔

ریلوے پر مقدمہ

ریلوے کے اسٹیشن ماسٹر نے دورے پر آئے ہوئے اپنے اعلیٰ افسر سے کہا ''یہ کسان جو سامنے جا رہا ہے، یہ ہماری ریلوے پر اپنی بھینسوں کی وجہ سے مقدمہ کرنے والا ہے۔''

افسر نے کہا ''گویا ہماری ٹرینیں اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ اس کی بھینسیں کٹ کر مر جاتی ہیں؟''

''جی نہیں......! دراصل ہماری ٹرینیں اتنی سست رفتار ہیں کہ لوگ چلتی ٹرین سے اتر کر اس کی بھینس پکڑ کر دودھ دوہتے اور واپس ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔''

(محمد ثاقب، ملتان)

جون کا آخری ہفتہ تھا۔ گرمی زوروں پہ تھی۔ حسنہ نے آم منگوا کر ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں بھگو رکھے تھے اور سب انھیں مزے لے لے کر چوس رہے تھے۔

چاندنی رات تاروں کے زیورات پہنے سجی سجائی لگتی تھی۔ بڑے سے پیڈسٹل فین کی ہوا کے سہارے رات کی رانی کی خوشبو نے بھی سفر کرنا شروع کر دیا۔ حسنہ خاموشی سے برتن اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ امجد کے حادثے سے ان کی زندگی میں نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں آ جائیں گی۔ سب سے زیادہ اسے جو بات پزل کر رہی تھی، وہ امجد کا بے فکری کا انداز اور Casual قسم کا رویہ تھا۔ امجد بے کار ہو کر گھر آ گیا تھا۔ اسے ہول آ رہے تھے مگر وہ مطمئن پُرسکون نظر آتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''سب لوگ ایک اعلان سن لیں۔'' امجد نے کھانے کے بعد اونچی آواز میں کہا۔

''میں ایک دو روز آرام کر لوں پھر ہم سب نیا گھر

تلاش کرنے نکل جائیں گے۔"

سب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"نہیں ابو ہمیں نیا گھر نہیں چاہیے۔ ہم یہیں پر خوش ہیں۔" دونوں لڑکیوں نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ بھئی کیا آپ اپنے اپنے کمرے نہیں چاہتے ہیں؟"

"مگر اب کیسے ممکن ہے یہ سب؟" حسنہ بول اٹھی۔

"بھئی امریکا میں زخمی ہوئے ہیں کوئی اپنے غریب ملک پاکستان میں تو نہیں ہوئے۔ وہاں تو ہر ایک کی انشورنس ہوتی ہے۔ میں نے معذوری کی انشورنس ایک تو پرائیویٹ طور پہ بھی کروا رکھی تھی دوسرے کمپنی کی طرف سے بھی اچھی خاصی رقم مل گئی اور ڈالر تو اب ۲۲ روپے کا ہے۔ اس لیے اللہ کی مہربانی سے ہم اب اپنے سارے خواب پورے کرسکیں گے۔" "ڈونٹ وری، بی ہیپی، سوبی ہیپی۔"

چاند بادل کے ایک چھوٹے سے آوارہ ٹکڑے کے پیچھے گیا اور تھوڑی دیر کے لیے اندھیرا گہرا ہوگیا۔

امجد اتنا پیسا لے آیا تھا کہ اس کی زندگی اچھی طرح سیٹ ہو سکے۔ انھوں نے گلبرگ میں ایک خوبصورت ۵ بیڈرومز کی کوٹھی خریدنے کے بعد گاڑی، ایئر کنڈیشنڈ، فریج اور گھر کا ضروری سامان بھی خرید لیا تھا۔

کوٹھی کے باہر کے حصے میں ایک انیکسی ٹائپ ملحقہ حصے کو امجد نے اپنے لیے فوٹو گرافی سٹوڈیو میں تبدیل کرلیا اور وہیں کام شروع کردیا۔ یہ سٹوڈیو سنت نگر کی اس چھوٹی سی دکان سے بہت مختلف تھا جہاں وہ سارا سارا دن کھڑا گاہکوں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اب وہ آفس ڈیسک پر بیٹھا بیگمات کے عمدہ پوز بنوانے کے نت نئے طریقے سوچتا رہتا اور اپنے اسسٹنٹ کو باقاعدہ اپوائنٹمنٹس بک کرنے کی تلقین کرتا رہتا۔ اب زندگی کتنی سہل ہوگئی تھی۔ ایفلوائنس کی دیوی نے کتنی آسانیاں مہیا کردی تھیں۔

ہر بچے کا علیحدہ علیحدہ کمرا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں خوش، اپنی اپنی پسند کی دنیائیں بسا کر ان میں رہنے لگے تھے۔ اوپر کے تینوں بیڈروم بچوں کو مل گئے تھے اور نچلے حصے میں حسنہ اور امجد رہنے لگے تھے۔ پانچواں گیسٹ روم بنا دیا تھا۔

ندیم کے کمرے میں خوبصورت بیڈروم فرنیچر اور سٹیریو ڈیک موجود تھا۔ اسے امریکن موسیقی بہت پسند تھی اس لیے کمرے میں متعدد میوزک کیسٹیں قرینے سے سجی رکھی تھیں۔ دیواروں پر کھلاڑیوں اور امریکن سنگرز کے مختلف سٹائل کے پوسٹرز اس کے پوری طرح نیو جنریشن کے ساتھ اِن ہونے کا ثبوت دیتے نظر آتے تھے۔ اب اس نے اپنے کالج کے دوستوں کو بڑے آرام سے گھر پر بلانا شروع کردیا تھا۔

اس کے کمرے میں اکثر دوستوں کی منڈلی جمتی رہتی اور قہقہوں کی آوازیں نیچے آتی رہتیں۔ امجد یہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اس کے بیٹے نے خود اعتمادی سے گلبرگ میں رہنے والے دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کردیا تھا۔ سنت نگر کے دوست اب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے لیے گلبرگ تک آنا مشکل ہوگیا تھا اور ندیم کے لیے سنت نگر جانا۔

شازیہ نے اپنے کمرے کو ہلکا پنک رنگ کرایا تھا اور جھالروں والے پردے لٹکا لیے تھے۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر طرح طرح کا میک اپ کا سامان تھا اور بک شیلف فلمی رسالوں اور رومانوی ناولوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے پاس بھی اپنا ایک الگ ٹیپ ریکارڈر تھا جس پر وہ سارا دن فلمی گانے سنتی رہتی تھی۔

یوں تو نادیہ کا کمرہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اس کا کمرا سب سے اچھا ہے۔ اس لیے وہ ہر وقت اپنے کمرے کی صفائی اور سجاوٹ میں لگی رہتی تھی۔ دیواروں پر پینٹنگز اور ڈیکوریشن کی عمدہ چیزیں سجائے وہ اس عجائب گھر سے عشق کرنے لگی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا گویا اللہ میاں نے اس کی دعا سن لی ہو اور اسے "ایلس ان ونڈر لینڈ" بنا دینے کے لیے اس کی سنت نگر کے گھر کی الماری کے خانے کو اتنا بڑا کردیا ہو کہ وہ اس میں آسانی سے چل پھر سکے، آجا سکے، رہ سکے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے کمرے سے باہر قدم نہ رکھتی۔ اپنی دنیا میں ہی ہر وقت رہتی سب اپنے اپنے کمروں میں واقعی بڑے سیٹ ہوگئے تھے۔ امجد اور حسنہ اپنے بچوں کی خوشی دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔

شام کو امجد اپنے سٹوڈیو میں کام ختم کرنے کے بعد جب اپنی وہیل چیئر چلاتا ہوا گھر میں آتا تو نیچے ٹی وی لاؤنج میں سے ہی بچوں کو آوازیں دیتا۔ وہ بھی ابھی آئے ابو! ابھی آئے امی کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے نیچے آجاتے مگر پھر کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی ضروری کام اپنے کمرے میں یاد آجاتا۔ کبھی ندیم کا دوست سہیل اوپر کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوتا تو کبھی شازیہ کیسٹ پلیئر چلتا چھوڑ آئی ہوتی۔ نادیہ کی سہیلیوں کے فون آجاتے اور وہ ٹیلیفون کی تار سنبھالتے ٹیلیفون کو اپنے کمرے میں ہی لے جاتی۔

حسنہ لڑکیوں کو گھر کے کام کاج میں پہلے سے کم دلچسپی لینے پہ ٹوکتی رہتی مگر نوکر کے آجانے کی وجہ سے وہ کچھ سہل پسند ہوگئی تھیں۔ ندیم نوکر کے ہاتھ کھانا بھی اکثر اوپر کمرے میں ہی منگوا لیتا۔

"بھئی بچو! ہمارے پاس بھی آکر بیٹھو کبھی۔" امجد نے ایک بار انھیں پیار سے سرزنش کی۔ حسنہ بھی بڑبڑا رہی تھی۔ ٹی وی پر ڈراما چلنے لگا۔ اس لیے بچے دو گھڑی پاس آکر بیٹھ گئے مگر جونہی ڈراما ختم ہوا اپنے اپنے بلوں میں جا گھسے۔

"دیکھا آپ نے ان کو؟ اپنے کمروں کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی سے غرض نہیں رہی۔" حسنہ نے شکایت کی۔

"بھئی صبر کرو۔ ابھی نیا نیا کمروں کا شوق ہے، پورا کرلینے دو۔ ہمارے پاس ہی ہیں نا بچے کہیں باہر تو نہیں گئے ہوئے۔ ہمیں موجودہ زمانے کے والدین کی طرح ایک نئی انڈرسٹینڈنگ ڈویلپ کرنا ہوگی۔"

"نیا شوق کیا ہے۔ اب تو سال ہونے کو آیا ہے۔ ان کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔" حسنہ ماں تھی مگر اپنے بچوں میں آنے والی تبدیلی سے شاکی تھی۔

امجد سوچنے لگا۔ یہ سال ان سب کی زندگیوں میں کتنی تبدیلیاں لے آیا تھا۔ وہ سنت نگر سے گلبرگ تک آگئے تھے۔ ان کے پاس پیسا تھا اور اب پیسے کے ساتھ آنے والا "پیسا کلچر" بھی دھکے زوری ان کے گھر آن گھسا تھا۔ ہر ایک کے پاس ضرورت کی ہر چیز تھی۔ زندگی سہل تر ہوگئی تھی۔ گھر میں پیڈسٹل فین کی جگہ ایئر کنڈیشنڈ لگے ہوئے تھے، مگر گرمی اب نہ جانے زیادہ کیوں محسوس

ڈینگی کا علاج

ایک دوست (دوسرے دوست سے) "سنا تھا تمھیں ڈینگی بخار ہوگیا تھا۔ تم نے کہاں سے علاج کروایا تھا جو اب ٹھیک ٹھاک پھر رہے ہو؟"

دوسرا دوست "جب میں ہسپتال پہنچا تو وہاں پر ۲ دروازے تھے۔ ایک پر لکھا تھا "طب" اور دوسرے پر "جراحت"۔ کیونکہ مجھے آپریشن تو کروانا نہیں تھا، اس لیے میں طب والے دروازے کے اندر چلا گیا۔ وہاں بھی ۲ دروازے تھے، ایک پر لکھا تھا "شدید بیمار" دوسرے پر لکھا تھا "معمولی بیمار"۔ چونکہ میں معمولی بیمار تھا اس لیے میں اس دروازے کے اندر چلا گیا۔ وہاں بھی ۲ دروازے تھے ایک پر لکھا تھا "سیاسی پارٹی کے آدمی" اور دوسرے پر لکھا تھا "عام آدمی"۔ چونکہ میرا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے میں عام آدمی والے دروازے کے اندر چلا گیا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں ہسپتال کے باہر کھڑا ہوں۔"

وہاں ایک درویش کھڑا تھا۔ اُس نے کہا "مرض سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو ۲ راستے ہیں۔"

میں نے کہا "کون کون سے؟" بولا "دعا کا اور دوا کا۔" میں نے کہا "دعا کا۔" کہنے لگا "جاؤ اب تم ٹھیک ہو، جا کر ۵۰۰ روپے خیرات کردینا۔"

(عبدالسمیع، لاہور)

ہوتی تھی۔ کمرے دلوں میں تعمیر ہو چکے تھے اور ان کی دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں، محبّت کے سبزہ زار پر اجنبیت اور غیریت کی دیواریں کھڑی نظر آنے لگی تھیں۔ تعلق، ربط، انوالومنٹ شیئرنگ جو اکٹھے رہنے سے پیدا ہوتی ہے، غائب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک خاموش سی بے نام سی نفسانفسی کا عالم تھا۔ ایک نظر نہ آنے والی مصروفیت ہر ایک کو پیدا ہو گئی تھی۔

پیسا کلچر اپنے ساتھ مادہ پرستی کے فلسفے کے ساتھ یہ نظریہ بھی امپورٹ کرتا ہے کہ اپنی ذات سب سے اہم ہے۔ اپنی زندگی سب سے اہم ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے اور اپنی دنیا میں خود کو خوش رکھنا چاہیے۔ بند کمرے میں رہنے والے شخص کو اپروچ کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ بند کمرے کا دروازہ ایک اِن وزیبل "ڈونٹ ڈسٹرب" کی تختی ماتھے پر سجائے ہوتا ہے۔ کمرے کے مکینوں نے اپنی ضرورت کی ہر چیز چونکہ کمرے کے اندر ہی مہیا کر لی ہوتی ہے، اس لیے انھیں کمرے سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ گھر کے دیگر مکینوں سے تعلق رکھنا درکار نہیں ہوتا۔

کبھی کبھار حسنہ جب بچوں کے سکول کالج جانے کے بعد ان کے کمروں کی صفائی کرواتی تو ندیم کے کمرے سے سگریٹ کے ٹکڑے بھی مل جاتے۔ وہ امجد سے شکایت کرتی۔ ندیم سے پوچھتے تو وہ کسی دوست کے سگریٹ پینے کا بہانہ کر دیتا۔

حسنہ سوچتی نہ جانے کمرے میں گھسے یہ لڑکے کیا کچھ کرتے رہتے ہیں۔ باہر سب کے سامنے ہوتے تھے تو ہر بات کا پتا چل جایا کرتا تھا کہ کوئی کیا کر رہا ہے۔ وہ پریشان ہو جاتی مگر جوان بیٹے پر سختی کرنے کے خیال سے خود کو روک لیتی۔

ایک شام حسنہ اپنی بہن ثریا کے ساتھ شاپنگ کرنے جا رہی تھی۔ جانے سے پہلے لڑکیوں کو اچھی طرح ہدایات دی تھیں کہ ابو جب شام کو سٹوڈیو سے آئیں تو انھیں کھانا وغیرہ کھلا دیں اور کوئی چیز چاہیے ہو تو دے دیں کیونکہ نوکر چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

امجد حسب معمول اپنی وہیل چیئر پر ڈھلوان کے ذریعے گھر میں داخل ہوا۔ ایسی ایک دو چھوٹی چھوٹی ڈھلوانیں انھوں نے سیڑھیوں کی جگہ بنوا رکھی تھیں تاکہ امجد آسانی سے گھر کے اندر آ جا سکے۔ امجد نے نادیہ کو بتا دیا کہ وہ فی الحال صرف چائے ہی پیے گا اور کھانا حسب معمول حسنہ کے آنے پہ ہی کھائے گا۔ لڑکیاں کچھ دیر کچن میں کھانے کا انتظام چیک کرتی رہیں۔ ندیم کے دوست حسب معمول آئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ تو اپنے کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا۔ اس کے کمرے سے سٹیریو ڈیک کی تیز موسیقی کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

امجد نے ٹی وی آن کر دیا۔ شازیہ کی دوست کا فون آ گیا اور وہ حسب معمول اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نادیہ کو بھی ہوم ورک ختم کرنا تھا، اس لیے وہ اپنے کمرے میں جا گھسی۔ اس کے کمرے سے بھی انڈین گانوں کی آواز آنے لگی کیونکہ وہ میوزک کے بغیر پڑھائی نہیں کر سکتی تھی۔

امجد نے ٹی وی بند کر دیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ان کا گھر کتنا بڑا اور خوبصورت تھا۔ ڈیکوریشن پیسوں سے بھرا ہوا مگر خالی اور سونا سونا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا دل چاہا، حسنہ جلدی سے واپس آ جائے۔ اس کے بغیر وہ خود کو کتنا ادھورا محسوس کرتا تھا، گھر میں اور لوگ تھے مگر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھی نہیں ہے۔

سنت نگر کے چھوٹے سے تنگ گلیوں میں گھنے مکان کے صحن کی اینٹیں دھل کر کتنی لال لال نکھری نکھری لگتی تھیں۔ اس صحن میں بچھی چارپائیوں کی محفلیں نہ جانے کن اجنبی دیسوں کو سدھار گئی تھیں۔

امجد نے باہر چمن میں جانے کی سوچی۔ ٹی وی لاؤنج سے باہر جانے کے لیے اس نے جالی کا سپرنگ والا دروازہ ایک ہاتھ سے پکڑ لیا اور دوسرے سے وہیل چیئر کو ہولے ہولے نیچے ریڑھنے لگا۔ باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، لان میں پھول مہک رہے تھے، ہری ہری گھاس

بہت خوشنما محسوس ہو رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح نیچے اتر جاتا، اس کی فینسی گیئروں والی وہیل چیئر کا فارورڈ گیئر جام ہو گیا اور وہ ایک جھٹکے سے ایک سائیڈ پر آدھی اُلٹ گئی۔ امجد نے خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو پہلو میں لگی سرخ جنگلی گلابوں کی جھاڑی کے کانٹوں نے غرا کر اسے اپنے سے دور کر دیا۔ سپرنگ والا جالی کا دروازہ بند ہو گیا۔ امجد آدھا زمین پر اور آدھا وہیل چیئر میں پھنسا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اسے حسنہ گاڑی اندر لاتی ڈرائیو وے میں نظر آ گئی۔

حسنہ نے یہ خوفناک نظارہ دیکھا تو اچھل کر باہر نکلی اور جلدی جلدی امجد کی مدد کو دوڑی۔ امجد بھاری بھرکم تھا اور وہ ہلکی پھلکی۔ اس کے لیے امجد کو اٹھانا بہت مشکل تھا۔ اس نے جالی والا دروازہ دھکیل کر زور زور سے بچوں کو آوازیں دیں تاکہ کوئی آ کر ہاتھ بٹائے اور باپ کو دوبارہ وہیل چیئر پر بٹھا دے مگر کمرے بند ہونے کی وجہ سے آوازیں ان تک پہنچ نہ پا رہی تھیں۔ ان کے کمروں سے موسیقی کی آواز البتہ نیچے لان تک بخوبی آ رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے گھر کے اندر جھانکا۔ امجد کو یوں آدھا گرا ہوا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھیں، اسے غصہ آنے لگا مگر وہ یکدم ساکت ہو گئی۔ اس کی دی ہوئی آوازیں فضا میں چاروں طرف اڑ رہی تھیں۔ ندیم، شازیہ، نادیہ۔ وہ لپک لپک کر انھیں پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آوازیں بند کمروں کے دروازوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں اور یوں چکنا چور ہوتی نظر آ رہی تھیں جس طرح ٹوٹ کر ان بریک ایبل گلاس کے لاتعداد ذرات فرش پر بکھر جاتے ہیں۔

حسنہ ہوا میں معلق ہو گئی۔ تیرتی تیرتی باری باری ہر ایک کمرے کے آگے جا پہنچی۔ دروازے زور زور سے کھٹکھٹانے پر بھی نہیں کھلے تو ان سے کلہاڑیوں کے پے درپے وار کر کے انھیں چیر ڈالا۔ اب ٹوٹے ہوئے دروازوں میں سے وہ اندر کے مناظر دیکھ سکتی تھی۔ ندیم اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ پی رہا اور تاش کھیل رہا تھا۔ شازیہ کانوں میں واک مین سٹیریو فون لگائے بستر پر الٹی لیٹی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی اور نادیہ ٹیلی فون پر شائستہ سے کوئی مزیدار قصہ سن کر قہقہے لگا رہی تھی۔

"ارے حسنہ جانی! ایسے کیوں سن ہو کر کھڑی ہو گئی ہو۔ کیا مجھے اٹھاؤ گی نہیں۔" امجد کی کھسیانی ہنسی اسے ایک دم حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ وہ یوں بے جان ہو گئی جیسے ہاٹ ایئر بیلون گرم ہوا نکل جانے کے بعد ہو جاتا ہے۔

شکر ہے اسی لمحے مالی بابا لان میں پانی لگانے آ گیا۔ حسنہ اور مالی بابا نے مل کر امجد کو دوبارہ وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔

"آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" حسنہ بار بار پیار سے پوچھتی رہی اور امجد اسے تسلّیاں دیتا رہا۔

"چلو مجھے پھولوں کے پاس لے چلو۔ چڑیوں سے ملاقات کراؤ اور فکر کرنا بند کر دو۔" امجد نے اسے مسکرا کر آرڈر کیا اور وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے اسے لان میں لے گئی۔

رات کھانے پر حسنہ نے تینوں بچوں کو ڈائننگ ٹیبل پر سارا واقعہ سنایا۔

"میں اور مالی بابا نہ ہوتے تو نہ جانے تمہارے ابو کتنی دیر اس تکلیف میں پڑے رہتے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے معنی خیز انداز میں بچوں کی طرف دیکھا۔

"آپ نے ہم میں سے کسی کو آواز دے دی ہوتی۔ ہمیں کیا خبر تھی، ہمیں بلاتیں تو ہم آتے نا۔"

ندیم نے بڑے آرام سے چکن روسٹ اپنی پلیٹ میں ڈال کر اپنا کھانا اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے جواب دیا۔

لڑکیاں سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔

حسنہ اور امجد نے اوپر کمروں کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سیڑھیاں بہت لمبی اور کبھی نہ ختم ہونے والی سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اور جہاں ختم ہو رہی تھیں وہاں اندھیرے اور دھند کے سوا کچھ نہ تھا۔

امریکا بہادر سے

ایک مظلوم بچی کی چشم کشا داستان

جسے انسانوں جیسی تربیت میسر نہ آسکی

جنگلی لڑکی

جواد گیلانی

ایک دل ہلا دینے والی کہانی

دوپہر کا وقت تھا کہ انسپکٹر مارک ہولٹ کو ایک فون موصول ہوا۔ ایک اجنبی نے اُسے بتایا کہ پارک لین روڈ پر واقع گھر میں ایک بچی بڑے بُرے حال میں رہ رہی ہے۔ انسپکٹر مارک نے گھر کا پتا لیا اور پھر اپنے نائب کو حکم دیا کہ وہ بچی کے متعلق چھان بین کرے۔

اگلے دن شام کو نائب نے رپورٹ دی کہ اس گھر میں واقعی ایک بچی کسی حیوان کے مانند زندگی گزار رہی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود جا کر حالات کا جائزہ لیں۔

انسپکٹر مارک امریکی ریاست، فلوریڈا کے ایک قصبے، پلانٹ سٹی میں واقع تین تھانوں میں سے ایک کا انچارج تھا۔ وہ مجرموں پر نظر رکھنے کے علاوہ ان شہریوں کو بھی نگاہ میں رکھتا تھا جو غیر اخلاقی یا غیر انسانی سرگرمیاں انجام دیں۔ اس بچی کا معاملہ اسی زمرے میں آتا تھا۔

اگلی صبح جب انسپکٹر مارک کی ملاقات اپنے نائب سے ہوئی، تو اس نے لڑکی کے متعلق دریافت کیا۔ نائب نے اُسے بتایا ''وہ لڑکی ماں کے ساتھ کرائے کے گھر میں مقیم ہے۔ مجھے پولیس میں دس برس ہو چکے، میں نے اتنا گندہ گھر آج تک نہیں دیکھا۔ آپ ذرا خود چل کر اس کا معاینہ کریں۔''

چنانچہ دونوں پولیس افسر پارک لین روڈ پہنچے۔ وہ گھر باہر ہی سے ویران کھنڈر کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ صحن میں کیاریوں کے اندر پودے نہیں جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو بدبو سے انھیں اپنا دماغ شل ہوتا محسوس ہوا۔ دیکھا کہ دیواروں پر کتے، بلی اور انسانوں کا فضلہ جما پڑا ہے۔ یہ دیکھ کر انھیں متلی ہونے لگی۔

اچانک ایک موٹی عورت گندے کپڑے پہنے ان کے سامنے آ گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ یہیں رہتی ہے اور ایک بیٹی کی ماں ہے۔ انسپکٹر مارک نے دریافت کیا کہ بیٹی کہاں ہے؟ عورت خاموش رہی، بس انگلی سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

انسپکٹر نے کمرے کا دروازہ کھولا، تو وہ بالکل تاریک تھا۔ پولیس افسر آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تبھی اسے پاؤں کے نزدیک سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دیکھا کہ زمین پر ایک میلا کچیلا گدا پڑا ہے۔ اس پر بیٹھی سیاہ آنکھوں والی چار، پانچ سال کی ایک بچی پلکیں جھپکائے بغیر انھیں گھورے جا رہی تھی۔

اس نے چڈی کے علاوہ کچھ پہن نہیں رکھا تھا۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور اتنی کمزور کہ سینے کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ سیاہ بال الجھے ہوئے تھے اور ان میں جابجا جوئیں چل رہی تھیں۔ جسم پر کھٹملوں، مچھروں اور پسوؤں کے کاٹنے کے نشانات واضح تھے۔ گو وہ سکول جانے کی عمر کو پہنچ چکی تھی لیکن اپنے رویے سے ننھی منی بچی لگتی تھی۔

اُسے دیکھ کر مارک ہولٹ کا دل بھر آیا۔ جب وہ اُسے گود میں اُٹھانے کے لیے جھکا، تو وہ ہولے ہولے چیخیں مارنے لگی، تاہم اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ انسپکٹر نے اس سے دریافت کیا ''تمھارا نام کیا ہے؟'' مگر بچی نے کوئی جواب نہ دیا اور بٹر بٹر اُسے تکتی رہی۔

مارک نے اس کے کپڑے تلاش کرنے چاہے، لیکن پورے گھر میں ایک بھی بچکانہ لباس نہ ملا۔ وہ حیران رہ گیا۔ پھر اس نے کوئی کھلونا ڈھونڈنا چاہا، بڑی مشکل سے ایک ملا لیکن وہ سنڈیوں سے بھرا پڑا تھا۔ انسپکٹر بچی کی حالتِ زار دیکھ کر شدید غصے میں آ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماں کو زوردار طمانچہ دے مارے، مگر اپنے نائب کے سمجھانے سے باز آ گیا۔ نائب کی خواہش تھی کہ قانون ہی اس سے نمٹے۔

جب نائب ماں کو لیے تھانے روانہ ہوا، تو انسپکٹر مارک نے مقامی ہسپتال فون کر کے کہا ''میں ایک انتہائی بیمار بچی کو لیے آ رہا ہوں۔ ایمرجنسی کا سامان فوراً تیار کر لو۔ مجھے لگتا ہے، اسے فوری طبی امداد نہ ملی، تو وہ چل بسے گی۔''

بچی کی ماں نے بتایا کہ اس کا نام ڈینلی ہے۔ وہ ساڑھے چھ سال کی ہونے کے باوجود کمزوری کی وجہ سے

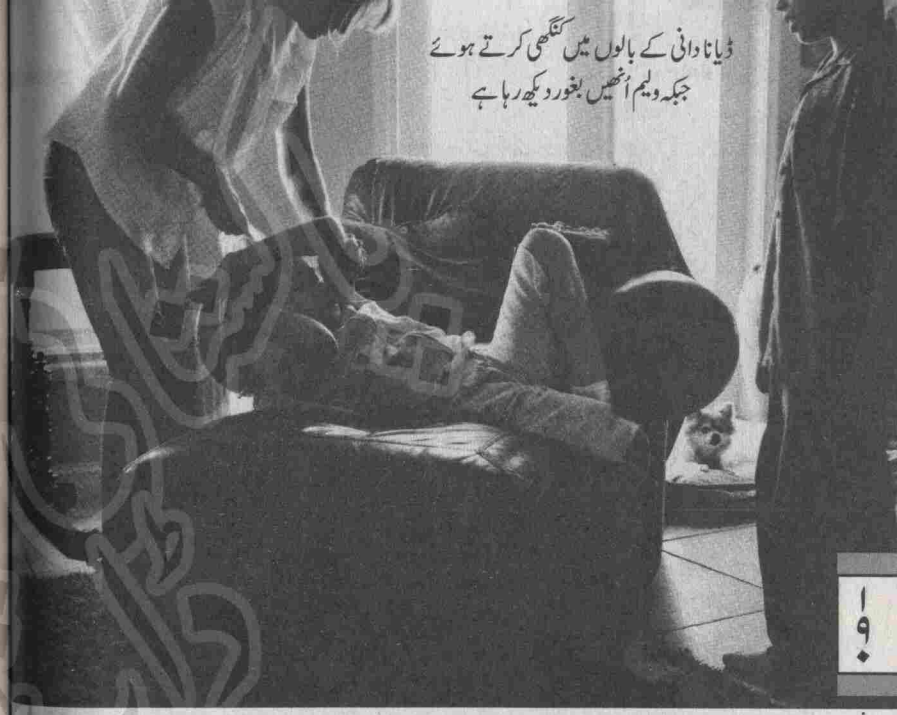

ڈیانا دانی کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے
جبکہ ولیم اُنھیں بغور دیکھ رہا ہے

۴ر سال کی لگتی تھی۔ خصوصی نگہداشت کے کمرے میں نرسوں نے ڈینلی کو کھانا کھلانے کی کوشش کی، مگر وہ ٹھوس غذا چبا یا نگل نہیں سکی۔ چنانچہ انھوں نے اُسے ڈرپ لگائی اور پھر بوتل سے دودھ پلایا۔

نرسوں نے اُسے غسل دیا، چہرے سے پھوڑے صاف کیے اور انگلیوں کے ناخن تراشے۔ پھر اس کے نہایت الجھے بال کاٹے گئے تاکہ سر جوؤں سے پاک کیا جاسکے۔

ڈینلی کی دیکھ بھال پر مامور سماجی کارکن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ کبھی سکول نہیں گئی اور نہ ہی کبھی ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا۔ ڈاکٹروں نے ڈینلی کا معاینہ کیا، تو رپورٹ میں لکھا ''چونکہ اس سے بہت بے توجہی برتی گئی لہٰذا وہ ساری عمر معذور رہے گی۔''

ڈینلی کو جب غصہ آتا، تو وہ زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی اور انگوٹھا چوسنے لگتی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرسکتی تھی اور نہ ہی گرمی، سردی..... یا درد پر ردِعمل کا اظہار کرتی۔ جب اُسے انجکشن لگا، تو اس نے سسکی تک نہ بھری۔ اُسے روتے ہوئے بھی کسی نے نہیں دیکھا۔

ایک بار نرس نے ڈینلی کے ہاتھ پکڑ کر اُسے کھڑا کیا اور چلانا چاہا۔ وہ ایڑیوں کے سہارے کسی کیکڑے کی طرح ٹیڑھی میڑھی چلنے لگی۔ اُسے باتیں کرنا نہیں آتا تھا اور نہ وہ یہ جانتی تھی کہ ہاں یا نا میں سر کیونکر ہلاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بلیوں کی طرح غرانے بھی لگتی۔

یونیورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا میڈیکل اسکول کی ڈاکٹر کیتھلین آرمسٹرانگ پہلی نفسیات داں تھی جس نے ڈینلی کا معاینہ کیا۔ اس کے کئی طبی ٹیسٹ ہوئے، دماغ کی سکیننگ ہوئی، تمام حصوں کو دیکھا گیا۔ اس میں کوئی جسمانی خرابی ظاہر نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر آرمسٹرانگ نے آخرکار یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈینلی ''ماحولیاتی خودشکنی'' (Environmental Autism) کا شکار ہے۔ یعنی وہ انسانوں سے اتنا طویل عرصہ دور رہی کہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گئی۔ ڈاکٹر آرمسٹرانگ کے نزدیک اس کی پوری پیشہ ورانہ زندگی میں یہ پہلا کیس تھا جس میں ایک لڑکی سے اتنی زیادہ بے توجہی برتی گئی تھی۔ یوں ڈاکٹروں کے سامنے انسانوں کی ایک نایاب قسم ..... جنگلی بچی (Feral Child) آگئی۔ ماہرین کے نزدیک یہ ایسے بچے ہیں جنھیں والدین کی آغوش میں اور انسانوں کے درمیان معمول کی تعلیم و تربیت نہیں ملتی۔

ڈاکٹر آرمسٹرانگ بتاتی ہیں ''زندگی کے پہلے پانچ برس ہی میں ۸۵ر فیصد انسانی ذہن نشوونما پاتا ہے۔ انہی برسوں میں بچے بولنا سیکھتے، دوسروں پر اعتماد کرتے اور یہ جانتے ہیں کہ دوسرے انسانوں سے میل جول کیسے رکھا جاتا ہے۔''

انسانوں سے کٹے رہنے کے باعث بیچاری ڈینلی کا دماغ ہی نشوونما نہیں پا سکا۔ ڈاکٹر آرمسٹرانگ کو یقین تھا کہ اب وہ ساری عمر نہیں بول سکتی۔ تاہم وہ یہ بھی سمجھتی تھیں کہ اگر بچی پر توجہ دی جائے، تو وہ زبان سمجھ کر مختلف طریقوں سے ابلاغ کرسکتی ہے۔ اُسے کپڑے پہننا اور خود کھانا بھی آجائے گا۔

ڈینلی نے ۳ر ماہ ہسپتال میں گزارے اور خاصی صحت مند ہوگئی۔ پھر یہ سوال اٹھا کہ وہ کہاں جائے گی؟ ایک جج نے اس کی ماں کو مجرم قرار دے کر جیل بھیج دیا تھا۔ منشیات کی عادی، خودغرض ماں نے ڈینلی کی پرورش میں مجرمانہ غفلت برتی تھی۔ (یہ امریکا کا بڑا المیہ ہے کہ وہاں مائیں اپنے بچوں کو پوری توجہ نہیں دیتیں لہٰذا وہ نوجوان ہوکر عموماً بھٹک جاتے ہیں۔)

آخر فیصلہ ہوا کہ اُسے خصوصی بچوں کے یتیم خانے میں داخل کرادیا جائے۔ وہاں ڈینلی کو بستر، کپڑے اور کھانا ملا۔ نیز ایک آیا بھی جو اس کے پوتڑے تبدیل کرنے پر مامور تھی۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں ڈینلی سات سال کی ہوگئی۔ اسی ماہ وہ زندگی میں پہلی بار سکول گئی۔ اُسے مقامی سکول کی اس جماعت میں داخل کرایا گیا جس میں خصوصی بچے پڑھتے تھے۔ اس کی استانی، کیون اوکیف بتاتی ہے:

''میں نے آج تک اتنے عجیب رویے والی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اگر بچے اس کے نزدیک کھانے کی کوئی بھی شے رکھتے، تو وہ اسے فوراً ہڑپ کرجاتی۔ جب اسے موقع ملتا، وہ کتابوں کی الماری میں گھس کر بیٹھ جاتی۔ کوئی اُسے چھوتا، تو چیخنے لگتی۔ ڈینلی کو جماعت سے ہم آہنگ ہوتے ایک سال لگا، پھر بھی وہ آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالتی اور دیگر بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتی۔''

اکتوبر ۲۰۱۰ء میں یتیم خانے کی منتظمہ، لیون پینک نے فیصلہ کیا کہ ڈینلی کے لیے مستقل گھر ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ اس کی تصویر ان بچوں میں شامل کردی گئی جنھیں گود لینا ممکن تھا۔ ایسے بچوں کی تعداد ۶۰۰ تھی۔ مگر لیون اکثر سوچتی کہ ایسی آٹھ سالہ عجیب بچی کو کون پالے گا جو ابھی تک پوتڑے پہنتی ہے، بول نہیں سکتی اور اسے اپنا نام بھی معلوم نہیں۔

برنی اور ڈیانا لیرو یتیم خانے کے شور سے اُکتا کر باہر آ کھڑے ہوئے۔ وہ ۱۶۰ر کلومیٹر دور واقع فورٹ مائرز سے آئے تھے۔ انھیں اُمید تھی کہ یتیم خانے سے پسند کا بچہ مل جائے گا۔ مگر تقریباً تمام بچے شرارتی، زیادہ بڑے اور دنیا پرست تھے۔

۴۹ر سالہ برنی لیرو ماہرِ تعمیرات تھا جبکہ اُس کی ۴۶ر سالہ بیگم، ڈیانا گھروں کی صفائی کا کاروبار کرتی تھی۔ دونوں کے پہلی شادیوں سے ۴ر لڑکے تولد ہوئے، جو اب جوان ہو چکے تھے۔ اب ان دونوں کا بھی ایک بچہ پیدا ہوا۔ اوائل ۲۰۰۷ء میں جب ولیم ۱۰ر برس کا ہوا، تو انھوں نے فیصلہ کیا، ایک لڑکی گود لے لی جائے۔

لیرو جوڑا چاہتا تھا کہ لڑکی ولیم سے چھوٹی ہو۔ تاہم وہ اس قابل ہو کہ خود کھانا کھائے اور پاخانے بھی جاسکے۔ وہ ایسی بچی نہیں چاہتے تھے جو معذور ہو، اپنی دیکھ بھال نہ

کر سکے یا وکیم کو نقصان پہنچائے۔

برنی اور ڈیانا ٹہلتے ٹہلتے یتیم خانے کے باغ میں پہنچ گئے۔ وہیں انھوں نے پہلی بار ڈینئلی کو دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی درختوں کو تک رہی تھی۔ آنکھوں میں دکھ و غم کی پرچھائیاں تھیں۔ سورج کی روشنی میں اس کے سنہرے بال چمک رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

اسے دیکھ کر ڈیانا نے شوہر سے کہا ''میں ایسی ہی بچی گود لینا چاہتی ہوں۔'' برنی نے بھی بیوی کی بات سے اتفاق کیا۔

لیرو جوڑے کے پاس سب کچھ تھا، عالی شان گھر، کاریں اور آرام و آسائش کی ہر شے...... بس وہ بیٹی سے محروم تھے۔ لیکن جب دفتر سے انھوں نے ڈینئلی کے متعلق معلومات لیں، تو وہ جتنا زیادہ پوچھتے، اتنی ہی نامطلوب باتیں سامنے آجاتیں۔ برنی نے بیگم کو بتایا ''یہ بچی تو وہ سبھی خصلتیں رکھتی ہے جو ہمیں درکار نہیں۔'' اس کے باوجود وہ ڈینئلی کی معصوم صورت اور بے چین آنکھیں نہیں بھلا سکے۔

چنانچہ وہ جماعت میں اُسے دیکھنے پہنچے۔ وہ اس کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈیانا نے ڈینئلی سے چند باتیں کیں، مگر بچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب اچانک برنی نے اس کا ہاتھ پکڑلیا اور اُسے محبت سے سہلانے لگا۔ ڈینئلی نے ہاتھ نہیں چھڑایا اور نظریں نیچی کیے بیٹھی رہی۔ یہ منظر کیون اوکیف نے دیکھا، تو بہت حیران ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ڈینئلی اتنی جلدی کسی اجنبی سے گھل مل گئی تھی۔

برنی شفقت سے اُسے اُٹھائے کھیل کے میدان میں پہنچا اور اُسے جھولے پر بٹھا دیا۔ دھوپ سے وہ کچھ سمٹ گئی مگر مزے سے بیٹھی جھولا لیتی رہی۔ برنی قسم کھا کر بتاتا ہے کہ جب جانے کا وقت آیا، تو ڈینئلی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے ''ٹاٹا'' کہا۔

رشتے داروں، دوستوں، پڑسیوں، دفتر کے ساتھیوں غرض ہر ایک نے لیرو جوڑے کو مشورہ دیا کہ وہ ڈینئلی کو گود نہ لیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یوں وہ بہت بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ لیکن لیری جوڑے نے جواب دیا ''اگر بچی میں ہماری ساری مطلوبہ خاصیتیں موجود نہیں تو کیا ہوا؟ کوئی بھی آرڈر دے کر تو بچہ تیار نہیں کرا سکتا۔''

دسمبر ۲۰۱۰ء کی چھٹیوں میں میاں بیوی ڈینئلی کو گھر لے آئے تاکہ دیکھ سکیں، آیا وہ ان کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہے؟ یہ تجرباتی دور خاصا تباہ کن ثابت ہوا۔ جب انھوں نے اُسے گڑیا دی، تو ڈینئلی نے ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس کو پھاڑ ڈالا۔

ایک دن لیرو جوڑا ڈینئلی کو ساحل سمندر پر لے گیا۔ مگر اس نے ریت پر چلنے سے انکار کر دیا اور خوب چیخی چلائی۔ اُسے چاکلیٹ پر لپٹا کاغذ اتارنا نہیں آتا تھا، چنانچہ اس کو بھی کھانے لگی۔ جب کبھی ڈینئلی کے دانت صاف کرنے کی سعی ہوتی یا بالوں میں کنگھی کی جاتی، تو وہ وحشت سے ٹانگیں چلاتی اور روتی پیٹتی۔

رات کو اُسے نیند ہی نہ آتی اور وہ منٹ منٹ بعد باورچی خانے کے چکر لگاتی رہتی۔ ڈینئلی سبزیوں کے بیگ نکال کر زمین پر رکھتی، پھر ان پر کھڑی ہو کر فریج کا جائزہ لینے لگتی۔ ڈیانا بتاتی ہے ''وہ فریج سے کچھ نہ لیتی۔ شاید وہ یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ اشیائے خورونوش محفوظ ہیں۔ میاں بیوی جب اُسے واپس خواب گاہ لے جانے کی سعی کرتے، تو وہ لڑ پڑتی۔

ناخوشگوار تجربات کے باوجود جون ۲۰۱۱ء میں برنی اور ڈیانا نے باقاعدہ طور پر ڈینئلی کو گود لے لیا۔

☆☆☆

''ارے بھئی اپنے جوتے پہنو، سکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' یہ مارچ ۲۰۱۲ء کا ایک ابر آلود دن تھا اور آج پھر ڈینئلی سکول سے لیٹ ہو گئی تھی۔ وہ کمرے میں کرسیوں اور میز کے نیچے چھپتی پھرتی تھی۔

ڈینئلی کو لیرو خاندان کا جزو بنے ایک برس سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کی شکل و صورت خاصی تبدیل ہو گئی تھی۔ جسم بھر گیا اور ایک فٹ قد بھی بڑھا۔ اب وہ

ڈینئلی پہلے انسانوں کو چھونے سے دُور بھاگتی تھی لیکن اب وہ باپ کے گود لینے اور بوسے دینے پر ردِعمل ظاہر کرتی ہے

مقامی تالاب میں تیراکی کرنے بھی جاتی تھی۔ اس کے بال چمکدار اور زیادہ سنہرے ہو گئے تھے۔ گو اب بھی کوئی ان میں کنگھی کرتا، تو وہ ہولے ہولے چیخیں مارنے لگتی۔

ڈینئلی میں واضح تبدیلیاں نہیں آئی تھیں، مگر برنی اور ڈیانا نا اُمید نہیں ہوئے۔ وہ نیک و بد میں تمیز سیکھ رہی تھی۔ پھر جب اُسے محسوس ہوتا کہ اس نے امی ابو کو افسردہ کر دیا ہے، تو وہ خود بھی یوں شرمندہ سی رہتی گویا ان کی پروا کرتی ہے۔

انھیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ بچی کو معذور بچوں کے سکول میں داخل کرائیں۔ تاہم برنی اور ڈیانا نے اُسے عام سکول میں داخلہ دلایا۔ دراصل انھیں یقین تھا کہ وہ معذور

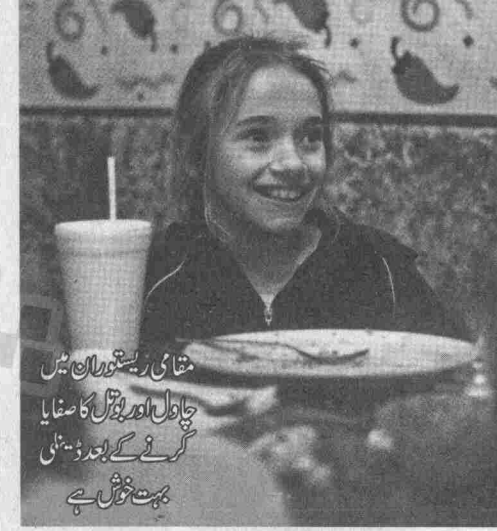

مقامی ریستوران میں چاول اور بوتل کا صفایا کرنے کے بعد ڈینلی بہت خوش ہے

بچوں کی نسبت بہتری دکھا سکتی ہے۔ وہ گفتگو سکھانے والی جماعتیں بھی لینے لگی اور گھڑسواری بھی سیکھی۔ برنی اور ڈیانا نے بیٹی کو فزیکل تھراپی کے کورس بھی کرائے۔ پھر رفتہ رفتہ اُسے بازار اور چرچ لے جانے لگے۔

ڈینلی کے رویے میں معمولی سی بھی بہتری آتی، تو ڈیانا خوش ہو جاتی۔ وہ سوچتی، اگر ریستوران میں وہ لوگوں کا کھانا اٹھا کر کھا جاتی ہے، تو کیا ہوا؟ آخر اُسے از خود کھانا تو آ گیا ہے۔ اگر وہ بار بار پاخانے جاتی ہے، تو کیا ہوا؟ اب ڈینلی کو پوتڑوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بچپن میں انتہائی بے التفاتی کا شکار بچی کو جب والدین کی محبت اور بھرپور توجہ ملی، اس کی شخصیت نشوونما پانے لگی۔ اس میں اتنی تیزی سے بہتری آئی کہ ڈینلی کی استانی حیران رہ گئی۔ اب وہ سیکھنے اور احکامات سمجھنے لگی۔ جب اُسے ٹوائلٹ جانا ہوتا، تو وہ اپنی پتلون اوپر کرنے لگتی۔ جب مزید رس درکار ہوتا، تو ڈبے پر ٹک ٹک کرتی۔ اب وہ پانچ چھ منٹ تک میز پر بیٹھنا بھی سیکھ گئی تھی۔

ڈینلی کو غصہ بھی کم ہی آتا اور جب طیش میں آتی، تو پہلی کی طرح انگلیاں نہ چباتی۔ اس کا بہترین وقت ولیم

کے ساتھ گزرتا، خصوصاً جب وہ ڈینلی کی گدگدیاں کرتا۔ اس کے بھائی نے اُسے ''رکو'' اور ''نہیں'' کہتے سنا ہے۔ ولیم کا کہنا ہے کہ ڈینلی نے ایک بار اُس کا نام بھی پکارا۔

ہم عمر بھائی ہونے سے ڈینلی کو بہت فائدہ ہوا۔ اُسے خوشی ملی اور تحرک بھی۔ اگرچہ ولیم مسکراتے ہوئے بتاتا ہے ''شروع میں تو ڈینلی نے مجھے بہت خوفزدہ کر دیا۔ وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتی تھی۔''

لیکن ولیم کی بڑی تمنا تھی کہ گھر میں کوئی اس کے ساتھ کھیلنے والا ہو۔ اُسے یہ پروا نہیں تھی کہ ڈینلی سائیکل نہیں چلاتی یا مونوپلی نہیں کھیل سکتی۔ وہ خوشی سے بتاتا ہے ''میں اُسے سائیکل پر بٹھا کر سیر کراتا ہوں۔ وہ بار بار گھنٹی بجا کر لطف لیتی ہے۔''

شروع میں ولیم کو یقین ہی نہیں آیا کہ ڈینلی ایسی بچی ہے، جس نے کبھی آئس کریم نہیں کھائی اور نہ ہی کسی کے کوہلایا ہے۔ اسی نے پھر بہنا کو سکھایا کہ مٹی سے کیسے کھلونے بناتے اور تحفے کیسے کھولتے ہیں۔ اسی نے ڈینلی کو یہ بھی بتایا کہ ریت پر چلنے سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا، پلے بنانے سے کتنا مزہ آتا ہے اور یہ کہ رونا فطری عمل ہے۔ تب کوئی نہ کوئی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔

برنی و ڈیانا کو اُمید ہے کہ ایک دن ڈینلی انھیں ''پا اور ''ماما'' کہہ کر پکارے گی، شادی کرے گی یا کم از کم اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا، تو برنی کے مطابق ''یہ بھی قابل قبول ہوگا۔'' ابھی دونوں مطمئن ہیں کہ وہ بے بس لڑکی کو پیار، آسایشیں، توجہ، استحکام اور خاندان فراہم کر رہے ہیں۔

رات ہوئی، تو برنی نے حسب معمول دلار سے ڈینلی کو بستر پر لٹایا اور ماتھا چوما۔ جاتے ہوئے بولا ''شب بخیر۔'' دروازے پر کھڑی ڈیانا نے بھی اُسے ''شب بخیر'' کہا۔ ولیم بھی ساتھ والے اپنے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ وہ بولا ''شب بخیر ممی اور پاپا، شب بخیر ڈینلی۔'' ان تینوں کو آس ہے کہ ایک نہ ایک دن ڈینلی جواب ضرور دے گی۔

مہم جوئی

دُنیا کی ۱۴ چوٹیاں سر کرنے والی کوہ پیما کا سچا واقعہ

اُسے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں فیصلہ کرنا تھا

کبھی کبھی بعض فیصلے زندگی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں

کے ٹو پر

موت و حیات کی کشمکش

وہ ''کوہ پیماؤں'' کے قاتل'' نام سے مشہور اپنی منزل کے قریب ہو رہے تھے

اور نہیں جانتے تھے کہ ایک المناک حادثہ اُن کا منتظر ہے

دُنیا

کے دوسرے بلند ترین پہاڑ پر حالات معمول پر تھے، چنانچہ یہی کوہ پیمائی کا بہترین وقت بھی تھا۔ گویا کوہ پیما گرلینڈی کالٹن برنز کامیابی پا کر سنہرے الفاظ سے تاریخ میں اپنا نام رقم کرا سکتی تھی۔

دراصل آسٹریا کی ممتاز کوہ پیما گرلینڈی کالٹن برنز دنیا کی ۱۳ بلند ترین چوٹیاں سر کر چکی تھی۔ صرف کے ٹو باقی تھی، جسے کوہ پیما دنیا کی سب سے دشوار گزار چوٹی سمجھتے ہیں۔ اب ۳۹ سالہ تربیت یافتہ نرس اُسے سر کرنے کے مرحلے سے صرف چند گھنٹے دور تھی۔ یوں وہ آکسیجن اور کسی مدد کے بغیر بلند ترین چودہ چوٹیاں چڑھنے والی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کر لیتی۔

''فریڈرک!'' گرلینڈی نے اپنے سویڈنی دوست، فریڈرک ایرکسن کو آواز دی جو اس کے ساتھ ہی کے ٹو پر چڑھ رہا تھا۔

فریڈرک کوہ پیما نہیں اسکی اِنگ (Sking) کا ماہر تھا۔ وہ گرلینڈی کے ہمراہ چوٹی پر پہنچ کر وہاں سے نیچے پھسلتے ہوئے اسکی اِنگ کا بھرپور مزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اپنی ساتھی کا حوصلہ بڑھایا۔ صبح کا سورج اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

لیکن دونوں کو خبر نہ تھی کہ ایک المناک حادثہ ان کا منتظر ہے۔ صبح کے ۸ بجے تھے کہ وہ اس انہونی سے دوچار ہوگئے۔ گرلینڈی غمناک آواز میں بتاتی ہے ''ہم ایک چٹان پر چڑھ رہے تھے۔ فریڈرک مجھ سے ۳ میٹر دور ہوگا۔ جب وہ چٹان میں کیل ٹھونکنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے دیکھا، فریڈرک اچانک نیچے گر گیا۔''

اس افسوس ناک واقعے کے بعد گرلینڈی زندگی کے ایک اہم ترین موڑ پر آ کھڑی ہوئی..... سوال یہ تھا کہ کیا وہ چڑھائی جاری رکھے؟ چوٹی صرف ۳۰۰ میٹر دور تھی، یوں وہاں تک پہنچ کر اس کے سبھی سپنے پورے ہو جاتے۔

یا پھر وہ چڑھائی ترک کرتی اور واپسی کی راہ اختیار کر کے گرے ہوئے ساتھی کو ڈھونڈنے پر جُت جاتی۔

اگرچہ کوہ پیمائی کے ۱۷ سالہ تجربے نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنے سویڈنی ساتھی کو بچانے کی خاطر کچھ زیادہ نہیں کر سکتی۔ بہرحال اُسے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں فیصلہ کرنا تھا کہ وہ ''بامِ دنیا'' کی سمت سفر جاری رکھے یا نیچے کا سفر شروع کر دے؟

☆☆☆

جب ۶ اگست ۲۰۱۰ء کا سورج طلوع ہوا، تو مطلع ابر آلود تھا۔ گرلینڈی نے اپنے شوہر، رالف ڈوجموس اور فریڈرک کے ساتھ کے ٹو پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ انھوں نے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا، اب چوٹی صرف ایک ہزار میٹر دور تھی۔

کوہ پیماؤں میں کے ٹو ''قاتل پہاڑ'' کی عرفیت سے مشہور ہے۔ وجہ یہی ہے کہ کے ٹو پچھلے ۵۰ برس میں کئی کوہ پیماؤں کی جان لے چکا۔ یہ دنیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی ۸۶۱۱ میٹر ہے۔ سلسلہ ہائے قراقرم میں یہی سب سے اونچا پہاڑ ہے جو پاکستان، چین اور بھارت تک پھیلا ہوا ہے۔

گرلینڈی اب تک کے ٹو پر چڑھنے کی ۵ کوششیں کر چکی تھی مگر اُسے ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب یہ چھٹی کوشش تھی اور اُسے یقین تھا کہ اس بار وہ ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

وہ چھٹی بار کے ٹو پر چڑھنے کی سعی کر رہی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اب وہ ضرور کامیاب ہوگی

مارچ ۲۰۱۰ء میں اُسے زبردست کامیابی ملی تھی جب وہ ایورسٹ پہاڑ سر کر کے فتح یاب ٹھہری۔ اب اس کا جوش و جذبہ عروج پر تھا۔ کے ٹو سر کرنے کا حقیقتاً اس سے سنہرا موقع شاذ ہی آتا۔

دراصل عالمی میڈیا کے نقطہ نگاہ سے ۳ خواتین کے مابین یہ دوڑ جاری تھی کہ کون پہلے دنیا کی بلند ترین ۱۴ چوٹیاں سر کرتی ہے۔ اس زبردست دوڑ میں گرلینڈی، ہسپانوی کوہ پیما ڈورن پاسبان اور جنوبی کورین کوہ پیما او ان سن شامل تھیں۔ لیکن گرلینڈی کو یہ مقابلہ جیتنے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کوہ پیمائی تو اس کا عشق تھا اور چوٹی پر پہنچ کر جو خاموشی اور جادوئی ماحول ملتا، وہ اس پر جان دیتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ کے ٹو سر کرنے کی ازحد متمنی تھی۔

موسمی پیشین گوئی یہ تھی کہ صبح تک مطلع صاف ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ لیکن ماہرین نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ چٹانوں کی شکست وریخت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ دراصل اس سال شدید گرمی پڑی تھی چنانچہ اس نے وہ برف بھی پگھلا دی جس نے صدیوں سے سیکڑوں چھوٹے بڑے پتھروں کو اپنی جگہ منجمد کر رکھا تھا۔

جب تینوں کوہ پیما چند میٹر اوپر چڑھے، تو وہ پتھر سرک گیا جس پر رالف نے پیر رکھا تھا۔ یہ اعتباہ اس کے لیے بہت تھا، ۷۵۰۰ میٹر کی بلندی سے وہ پلٹ گیا۔

گرلینڈی اس کے متعلق کہتی ہے ''رالف میری طرح جوش و جذبہ نہیں رکھتا۔ پھر وہ ایک بار کے ٹو سر کر چکا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو خوب سمجھتے ہیں لہٰذا اس کی عدم موجودگی سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑا۔''

یوں گرلینڈی اور فریڈرک نے برفانی قاتل پہاڑ پر چڑھائی جاری رکھی۔

وہ تھوڑی دیر رک کر پانی ضرور پیتی۔ وہ کہتی ہے ''جب میں کوہ پیمائی کروں، تو روزانہ چھ سات لیٹر پانی

فریڈرک ایریکسن
جو ناگہانی حادثے
کا شکار ہو گیا

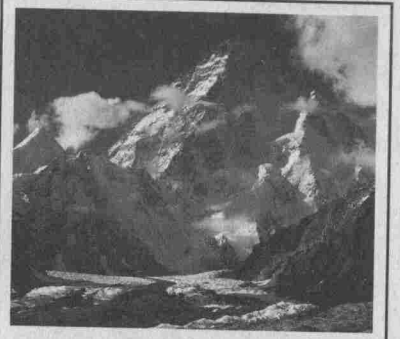

۱۴ بلند ترین چوٹیاں

دنیا میں ۱۴/ پہاڑ ۸/ ہزار میٹر بلند ہیں۔ یہ سب سلسلہ ہائے کوہ ہمالیہ اور قراقرم میں واقع ہیں اور ان میں سے ۵/ پہاڑ تو ہمارے پیارے وطن میں ہیں۔

رینو ہولڈ میسٹر پہلا کوہ پیما ہے جس نے تمام ۱۴/ چوٹیاں سر کیں۔ آخری چوٹی پر چڑھنے کا کارنامہ اس نے ۶/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو انجام دیا۔

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ/ نیپال/ تبت ۸۸۵۰ میٹر
(۲) کے ٹو/ پاکستان/ چین ۸۶۱۱ میٹر
(۳) کنچن جنگا/ نیپال/ بھارت ۸۵۸۶ میٹر
(۴) لہوتے/ نیپال/ تبت ۸۵۱۶ میٹر
(۵) ماکانو/ نیپال/ تبت ۸۲۰۱ میٹر
(۶) شواویو/ نیپال/ تبت ۸۲۰۱ میٹر
(۷) دولھا گری/ نیپال ۸۱۶۷ میٹر
(۸) مانسلو/ نیپال ۸۱۶۳ میٹر
(۹) نانگا پربت/ پاکستان ۸۱۲۵ میٹر
(۱۰) اننا پرنا/ نیپال ۸۰۹۱ میٹر
(۱۱) گیشر برم اول/ پاکستان/ چین ۸۰۶۸ میٹر
(۱۲) براڈ پیک/ پاکستان/ چین ۸۰۴۷ میٹر
(۱۳) گیشر برم دوم/ پاکستان/ چین ۸۰۳۵ میٹر
(۱۴) شیشہ پنگمہ/ تبت ۸۰۱۳ میٹر

پیتی ہوں۔ اس طرح جسمانی و ذہنی توانائی بحال رہتی ہے اور انسان اپنا ذہنی ارتکاز بحال رکھتا ہے۔ مرد کوہ پیما عموماً پانی نہیں پیتے لہٰذا غلطیاں کرتے ہیں۔ خواتین اپنے ذہن و جسم کی زیادہ توجہ سے حفاظت کرتی ہیں۔''

فریڈرک اور گرلینڈی پچھلے برس سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جب مرد کوہ پیما چڑھائی کریں، تو کبھی کبھار وہ بندھن باندھ لیتے ہیں۔ تاہم مسابقتی رجحان اور انا کا معاملہ انھیں زیادہ قریب نہیں آنے دیتا۔ لیکن خواتین کی شمولیت چڑھائی کی کیمیا بھی بدل ڈالتی ہے۔ اسی لیے فریڈرک اس کا بے تکلف اور مخلص ساتھی تھا۔

۲۰۰۹ء میں بھی گرلینڈی اور اس کا خاوند کے ٹو سر کرنے کی نیت سے پاکستان آئے تھے۔ جب وہ پہاڑ کے دامن میں کھڑے قدرتِ خداوندی کا نظارہ کر رہے تھے، تو انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ تب ۳۴/ سالہ سویڈنی فریڈرک اسکی اِنگ کرتے ہوئے برق رفتاری سے کے ٹو سے نیچے اُتر رہا تھا۔

دوربین آنکھوں پر لگائے گرلینڈی اور رالف نے اس کی تیزی دیکھی تو ششدر رہ گئے۔ قاتل پہاڑ سے اس طرح آڑے ترچھے اترنا بڑا خطرناک عمل تھا۔ فریڈرک کسی پوشیدہ چٹان سے ٹکراتا، تو گر کر اس کی ہڈی پسلی ایک ہوجاتی۔ تاہم وہ تجربے کار اسکائر تھا اور تربیت یافتہ بھی۔ تب اس کا اطالوی ساتھی، مائیکل فیٹ بھی فریڈرک کے ساتھ اسکی اِنگ کرتے ہوئے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بھی ماہر اسکائر تھا۔

لیکن پھر ایک المناک حادثہ پیش آیا۔ جب مائیکل نے ایک بلند چٹان سے چھلانگ لگانی چاہی، تو اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے گر گیا۔ فریڈرک دیوانہ وار اسکی اِنگ کرتے ہوئے اس جگہ پہنچا جہاں مائیکل گرا تھا۔ گرلینڈی اور رالف بھی برف میں بڑی دقت سے بھاگتے ہوئے جائے حادثہ پہنچے۔ لیکن اب کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے لاش ایک بیگ میں ڈالی اور دکھی دل کے ساتھ واپس چلے آئے۔

اس واقعے نے فریڈرک کو بہت صدمہ پہنچایا۔ چنانچہ گرلینڈی اور رالف ہی نے اُسے سنبھالا، زندگی کا مثبت چہرہ بھی دکھلایا اور یوں اُسے خاصی حد تک معمول پر لے آئے۔ اس کے بعد فریڈرک اور گرلینڈی جوڑے نے ای میل، موبائل فون اور ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ رکھا اور ان کے مابین خاندانی تعلقات پیدا ہوگئے۔ چنانچہ جب گرلینڈی جوڑے نے کے ٹو پر چڑھنے کا فیصلہ کیا، تو اُسے بھی بلوالیا۔

کوہ پیمائی کے دوران گرلینڈی نے حقیقتاً کئی بار موت کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ۲۴/ سال کی تھی جب ۸/ ہزار میٹر بلند کوہ ہمالیہ پہاڑ، شواویو پر چڑھی۔ تب وہ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے کوہ پیماؤں کی ٹیم میں شامل تھی۔ گرلینڈی کی ایک خاتون آسٹروی کوہ پیما سے دوستی ہوگئی۔ ایک بار انھوں نے سوچا کہ اپنی تصویر کھنچوانی چاہیے۔ لہٰذا پڑوس کے خیمے میں مقیم روسی کوہ پیما کو تکلیف دی گئی۔ روسی لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا، تصویر کھینچی اور پھر غڑاپ سے اندر چلا گیا۔

مرد کوہ پیما عموماً پانی نہیں پیتے، جبکہ خواتین کوہ پیما اپنے ذہن و جسم کی زیادہ حفاظت کرتی ہیں

جب وہ دونوں اگلے مرکز پر پہنچے، تو انھیں یہ جان کر صدمہ ہوا کہ روسی کوہ پیما شدید سردی کا نشانہ بن کر چل بسا ہے اور جب گرلینڈی نے تصویر ڈویلپ کرائی، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ان کی صرف ٹانگیں ہی نظر آرہی تھیں۔ گویا بے چارے روسی کی حالت تب تک دگرگوں ہوچکی تھی۔

بعدازاں گرلینڈی مختلف کوہ پیما ٹیموں کے ساتھ قراقرم اور ہمالیہ کی دیگر چوٹیوں پر چڑھی، تو اُسے یکے بعد دیگرے المیے دیکھنے پڑے۔ ایک بار ۲۴/ سالہ چیک خاتون کوہ پیما نے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے سامنے جان دے دی اور وہ کچھ نہ کرسکی۔

اسی رات، گرلینڈی نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا: ''قدرت کا نجانے کیا اسرار ہے کہ زندگی میں خوشی و لطف اور غم و اندوہ باہم گتھے ہوئے ہیں۔'' لیکن اُسے یہ بھی احساس ہے کہ ہر کوہ پیما اپنی مرضی ہی سے پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام خطرات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔

گرلینڈی پیشے کے لحاظ سے ایک نرس تھی، چنانچہ موت سے آمنا سامنا کرتے ہوئے اُسے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر اُسے کوہ پیمائی کے پہلے اسباق ایک پادری نے پڑھائے جو پہاڑوں پر چڑھنے کا شوقین تھا۔ اسی نے گرلینڈی کو سکھایا کہ پہاڑوں کا مطالعہ کیسے کرنا ہے مثلاً جب سر کے بال کھڑے ہوجائیں، تو اس کا مطلب ہے طوفان کی آمد آمد ہے، چٹانوں کی سطح پر پورے تلوے رکھ کر چلو اور اگر ٹیم میں شامل ہو، تو ہمیشہ کمزور رکن کے آنے کا انتظار کرو۔ سب سے بڑھ کر اسی نے گرلینڈی کو بتایا کہ جب انسان چوٹی پر پہنچے، تو وہاں کا سحر و اسرار مدہوش کر دینے والا ہوتا ہے۔ گرلینڈی کہتی ہے ''میں جب بھی کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچوں، تو رب تعالیٰ کے حضور دعا ضرور مانگتی ہوں۔ یہ اس کی شانِ کبریائی کے سامنے نذرانہ عقیدت ہوتا ہے۔

☆☆☆

کیا گرلینڈی نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگائی کہ اسے فریڈرک کو ڈھونڈنے جانا چاہیے یا نہیں؟ جی نہیں، ایک ثانیہ رک کر وہ فوراً طویل اترائی کی سمت گامزن ہوگئی۔ اگرچہ اسے کسی کتاب میں پڑھی یہ بات یاد آگئی کہ کے ٹو کی چوٹی سر کرنے والے ہر چار کوہ پیماؤں میں سے

ایک ضرور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فریڈرک تقریباً ایک کلومیٹر بلندی سے نیچے گرا تھا۔ چنانچہ اب اُسے تلاش کرنا کارے دارد تھا۔ جب گرلینڈی اُسے ڈھونڈنے میں ناکام رہی، تو وہ اپنے مرکز جا پہنچی۔ وہاں سے پھر بذریعہ سیٹلائٹ فون فریڈرک کے والد کو مطلع کیا گیا کہ اس کا فرزند المناک حادثے میں چل بسا۔ والد نے انھیں ہدایت دی:

''فریڈرک کی لاش تلاش کرنے کی خاطر کسی کوہ پیما کی زندگی خطرے میں نہ ڈالیے۔ اُسے وہیں رہنے دیجیے، یوں وہ تاابد اپنے پسندیدہ پہاڑوں کا نظارہ کرتا رہے گا۔''

اس دلدوز واقعے نے گرلینڈی کا سارا جوش و جذبہ سرد کردیا۔ کمند بھی وہاں ٹوٹی جب لب بام چند سو میٹر رہ گیا تھا۔ اس نے پھر اگلے کچھ ماہ اپنا غم غلط کرنے اور فریڈرک کی موت کا صدمہ بھلانے میں گزارے۔

کے ٹو چوٹی تک رسائی پانے والے چار کوہ پیماؤں میں سے ایک کو ضرور موت کا شکار ہونا پڑتا ہے

اس دوران ہسپانوی ڈرون پاسبان امدادی آکسیجن اور ٹیموں کے بغیر تمام ۱۴ بلند چوٹیاں سر کرنے والی دنیا کی پہلی خاتون کوہ پیما بن گئی۔ تاہم اس خبر سے گرلینڈی کو کچھ فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ اول و دوم کی دوڑ میں شریک ہی نہیں تھی۔ اس کی منزل مقصود تو محض بلند ترین چوٹیاں سر کرنا تھا۔

آخر اگست ۲۰۱۱ء میں گرلینڈی شوہر کے ہمراہ دوبارہ پاکستان پہنچی۔ اس بار بھی دوران چڑھائی انھیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ رالف پھر واپس پلٹ گیا لیکن گرلینڈی کے ٹو کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ یوں اس کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو ہی گیا۔ دنیا کی بلند ترین چوٹیاں سر کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور خصوصاً یہ کارنامہ ایک عورت انجام دے، تو اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

اُمید کہانی

ایک کمزور ماں کی کہانی

وہ یقین اور امید سے بھری تھی

ساٹھوں کے پیچھے

ایک بدمست ڈرائیور کا قصہ جسے اپنی طاقت اور تعلقات کا بڑا زعم تھا اس کا یقین تھا کہ اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا

عالیہ فاطمہ

ڈیبی (ماں) حادثے کا شکار ہونے والے اپنے بیٹے ''کپ Kipp'' کی تصویر اُٹھائے ہوئے

ایک ماں کی محبّت اور محنت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ جرم طاقتور بھی کرے تو سزا پائے گا

رات

۱۲ بجے کا وقت تھا جب دو سال قبل سٹیڈ اپنے بیٹے، کپ ٹرنر کے ساتھ شبینہ سیر کو نکلا۔ موسم اچھا تھا، موسم بہار کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک زیرِ تعمیر سڑک پر جا نکلے۔

سٹیڈ نے ۱۴ دن قبل اپنے بیٹے کی گیارھویں سالگرہ منائی تھی۔ چونکہ صبح اتوار تھا لہٰذا وہ پروگرام بنا رہے تھے کہ قریبی جھیل جا کر مچھلیاں پکڑی جائیں۔ وہ امریکی ریاست ایری زونا کے شہر، سکاٹ ڈیل کے رہائشی تھے۔

باپ بیٹا سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔ جب وہ ایک موڑ پر پہنچے، تو اچانک دوسری سمت سے ایک رولز رائس کار بڑی تیزی سے ان کے سروں پر آ پہنچی۔ اُسے دیکھ کر سٹیڈ زور سے چلایا ''کپ! کار سے بچنا۔''

ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اُسے دھم کی آواز آئی۔ پھر اس نے دیکھا کہ کپ ہوا میں اچھلا اور زمین پر گر گیا۔ خوف و دہشت کے مارے سٹیڈ نے چیخ ماری اور بیٹے کی طرف لپکا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے بیٹے کا نیم بے جان بدن جھک کر آغوش میں لے لیا۔ اُدھر رولز رائس بالکل نہ رکی اور کچھ ہی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ بعد میں پتا چلا کہ کار کا اگلا دایاں کونے والا حصہ کپ کے کولہے اور ٹانگوں سے ٹکرایا۔ لڑکے کا بالائی جسم کار سے لگا اور سر مڈگارڈ سے ٹکرانے کے باعث اُسے شدید ضرب لگی۔ اس خوفناک ٹکراؤ نے کپ کے کولہے کی ہڈیاں توڑ ڈالیں، جبکہ کھوپڑی بھی چٹخ گئی۔ ضربیں اتنی شدید تھیں کہ بے چارہ لڑکا اسی وقت چل بسا۔ یوں وہ پُرلطف زندگی سے محروم کر دیا گیا۔

اطلاع ملنے پر پولیس کا سراغ رساں، شون ٹومپل جائے حادثہ پر پہنچا اور شواہد اکٹھے کرنے لگا۔ ایک جگہ اُسے زرد پلاسٹک کے چمکدار ٹکڑے نظر آئے۔ یہ دراصل کار کے اگلے اشارے کے ٹکڑے تھے۔ شون نے بڑی احتیاط سے ہر ٹکڑا محفوظ کر لیا۔ بڑے ٹکڑے تھے، مگر ایک پر ساختہ برطانیہ (Made in England) درج تھا۔ یہ ٹکڑا اہم ثابت ہو سکتا تھا۔

اگلے دن کپ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ ڈاکٹر کو بھی کپڑوں سے چمٹے ہوئے اشارے کے ننھے ٹکڑے ملے۔ یہ انہی ٹکڑوں جیسے تھے جو جائے حادثہ سے شون کو ملے تھے۔ شون نے سارے ٹکڑے اپنے قبضے میں کر لیے۔ اس نے پھر بڑی عرق ریزی اور محنت سے سارے ٹکڑے اس طرح جوڑ لیے کہ ان پر درج وہ نمبر و حروف سامنے آ گئے جو کمپنیاں بوقت تیاری ثبت کرتی ہیں۔

اب شون نے اس مقامی آٹو کمپنی کی طرف ایک سپاہی بھیجا جو رولز رائس کاروں کی خرید و فروخت کرتی تھی۔ شون خوش قسمت رہا کہ وہاں سے ایک اہم خبر معلوم ہوئی۔ پتا چلا کہ یہ اس اشارے (انڈیکیٹر) کے ٹکڑے ہیں جو صرف ۲۰۰۷ء کے بعد بننے والی رولز رائس یا بینٹلے کاروں میں لگتے ہیں۔

ننھے منے ثبوت

شون نے پھر کمپیوٹر کی مدد سے پتا لگایا کہ قصبے میں کون کون رولز رائس کاریں رکھتا ہے۔ کھوج لگانے سے ۴۰ لوگوں کے نام سامنے آئے۔ شون نے طے کیا کہ ان سب سے پوچھ گچھ کی جائے۔ چنانچہ پولیس کی ۲ ٹیمیں اپنے کام پر لگ گئیں۔

۴ جگہوں سے انھیں کچھ معلوم نہ ہوا۔ پانچویں گھر پہنچے، تو وہاں دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے مہمانوں کو خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ مہمان ایک سفید ویگن میں سوار ہو رہے تھے جس کا نمبر نوٹ کر لیا گیا۔

پولیس نے پھر ۶۷ سالہ ایڈورڈ پالینکاس کو بتایا کہ وہ اس کے گھر کیوں آئی ہے۔ پھر ایڈورڈ سے درخواست کی گئی کہ اس کی ۲۰۰۸ء ماڈل کی رولز رائس دیکھنا مطلوب ہے۔ ایڈورڈ دونوں سپاہیوں کو ڈرائنگ روم میں لے گیا اور انھیں چائے پلائی۔

پھر جب سپاہیوں نے کار دیکھنے کی فرمائش کی، تو

ایڈورڈ کے چہرے پر رعونت چھا گئی۔ وہ پُرغرور انداز میں بولا ''میں آپ لوگوں کو اپنی کار نہیں دکھا سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون اٹھایا اور اپنے وکیل کو بلا لیا۔ ایڈورڈ ماضی میں کاروبار کرتا تھا لیکن اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ سپاہیوں کو شک ہوا کہ یہی ایڈورڈ ان کا مطلوبہ آدمی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ویگن نمبر کی مدد سے معلوم کرالیا کہ ایڈورڈ کے مہمان کہاں گئے ہیں۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مہمانوں سے پوچھ گچھ ہوئی، تو پتا چلا کہ ایڈورڈ نے دوران گفتگو انھیں بتایا تھا کہ پچھلی رات وہ ریستوران سے گھر آرہا تھا کہ کسی سائن بورڈ سے ٹکرا گیا۔

اگلی صبح شون گھر کی تلاشی کے وارنٹ لیے ایڈورڈ کے گھر پہنچ گیا۔ تب کپ ٹرنر کو دنیا سے گزرے ۳۶ گھنٹے بیت چکے تھے۔ اس نے ملزم کو زیرحراست لیا اور ساتھ آئے ماہرین لیبارٹری بیش قیمت کار کا باریک بینی سے معاینہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں اگلے حصے میں وہ گڑھے (Dents) مل گئے جو لڑکے کے ٹکرانے سے پڑے تھے۔ انھیں کار کے روغن سے چپکے کپڑے کے ننھے ریشے، انسانی بافتیں اور خون کے دھبے بھی ملے۔ مڈگارڈ سے چپکے پُراسرار سفید ریشے بھی دستیاب ہوئے۔ باورچی خانے سے سراغ رسانوں کو کار کی انشورنس کے کاغذات اور ایک اخبار ملا جس میں کپ کے المناک حادثے پر مضمون شائع ہوا تھا۔ اس صبح پولیس نے ''غیرارادی قتل'' اور ''مارا اور بھاگ گیا'' (Hit and run) کے الزامات لگا کر ایڈورڈ کو گرفتار کرلیا۔

جب بے چارہ کپ دنیا سے رخصت ہوا، تو اس کی ماں، ڈیبی لگ اپنے دوسرے شوہر، گراہم کے ساتھ ہوائی میں چھٹیاں منا رہی تھی۔ دراصل بعض اختلافات کی وجہ سے ۲/سال قبل سٹیڈ اور ڈیبی میں علیحدگی ہوگئی تھی، تاہم دونوں نے کپ پر توجہ و محبت میں کمی نہ آنے دی۔

پولیس نے فون کرکے ڈیبی کو بتایا کہ اس کا راج دلارا دنیا میں نہیں رہا۔ یہ سن کر ڈیبی دھڑام سے زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ جب بیدار ہوئی، تو رونے پیٹنے لگی۔ اُسے اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت محبت تھی۔ اُسے تھوڑا قرار اُسی وقت آیا، جب اسے پتا چلا کہ ملزم گرفتار ہوگیا ہے۔

ڈیبی پھر واپس سکاٹ ڈیل پہنچی اور سابق شوہر سے ملی۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایڈورڈ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر دم لیں گے۔ ۲/ہفتے بعد یہ جان کر ان کے غم و غصے کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ایڈورڈ کے وکیل اپنے موکل کو غیرارادی قتل کے الزام سے بری کرانا چاہتے ہیں۔

سکاٹ ڈیل، ماریکوپا کاؤنٹی کی حدود میں واقع تھا۔ اسی کی عدالت میں مقدمہ چلنا تھا۔ ان کے وکیل نے ڈیبی وسٹیڈ کو بتایا کہ یہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ حادثے کے وقت ایڈورڈ نشے میں تھا۔ چنانچہ عدالت میں غیرارادی قتل ثابت کرنا کٹھن ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ دوسرے الزام کی بنیاد پر مقدمہ لڑیے اور جیت جائیے۔

پہلی بار جرم کرنے والے مجرم کو غیرارادی قتل ثابت ہونے پر زیادہ سے زیادہ ۲۱/برس قید ملتی تھی جبکہ وہی مجرم دورانِ حادثہ ''مارے اور بھاگ جائے.....'' اور اس حادثے میں مضروب مر بھی جائے تو اُسے صرف ۲/سال قید ہوتی تھی۔ مزید برآں پہلی بار حادثہ کرنے والے عموماً جیل نہ جاتے اور انھیں محض یہ سزا ملتی کہ وہ مخصوص آزمایشی عرصہ (Probation) گزاریں۔ ڈیبی نے فیصلہ کیا کہ قانون میں ''غیرارادی قتل'' اور ''مارو اور بھاگ جاؤ'' کے مابین جو مہمل خلا ہے، وہ اُسے ختم کرکے رہے گی۔

جولائی ۲۰۱۰ء میں ڈیبی اور سٹیڈ نے پریس کانفرنس کی تو اس میں کئی اخباری صحافی اور ٹی وی نیٹ ورکس کے نمائندے شریک ہوئے۔ ڈیبی نے ایڈورڈ پر الزام لگاتے ہوئے کہا ''۱۲/اپریل کو میرا بیٹا قتل کردیا گیا۔ اس نے اپنی شاہانہ کار تلے اُسے روند ڈالا اور کپ کا بے جان جسم سڑک پر چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اُسے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ چونکہ مسٹر ایڈورڈ جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا، لہٰذا ہم یہ نہیں جان سکتے کہ کیا وہ نشے میں تھا؟ لیکن ممکن ہے کہ قصے میں کوئی اور سچ جانتا ہو۔ ہماری باضمیر

لوگوں سے اپیل ہے کہ اگر کوئی اس سلسلے میں سچائی جانتا ہے، تو وہ سکاٹ ڈیل پولیس کو آگاہ کردے۔

ڈیبی وسٹیڈ کی خوش قسمتی کہ کچھ مردوزن سچائی سے واقف تھے۔ ان میں اس ریستوران کی ویٹرس نمایاں حیثیت رکھتی تھی جہاں اسی رات ایڈورڈ نے کھانا کھایا تھا۔ ویٹرس نے بتایا کہ ایڈورڈ اچھی خاصی شراب پیئے ہوئے تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ کھانا کھا کر اُٹھا تو لڑکھڑا گیا۔

ثبوتوں کی تلاش میں

ویٹرس کے بعد اسی ریستوران کے دیگر ملازمین نے بھی شہادت دی کہ اس رات ایڈورڈ نشے میں تھا۔ پولیس نے ان سب سے بیان لیے۔ اب اُسے یقین ہوگیا کہ وہ عدالت میں غیرارادی قتل کا الزام ثابت کرنے میں کامیاب رہے گی۔ جب ویٹرس کی گواہی سامنے آئی، تو قصبے کے لوگ ایڈورڈ کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔

اسی دوران ڈیبی نے ریاست ایری زونا میں عدالتی کمیٹی کی سربراہ، پیٹی نولینڈ سے ملاقات کی۔ پیٹی نے وعدہ کیا کہ وہ ریاستی پارلیمنٹ میں ایسا قانون پیش کرے گی جس کی منظوری کے بعد ''مارو اور بھاگ جاؤ'' کی سزا بھی سخت ہوجائے گی۔

ماہِ اکتوبر میں عدالت نے ڈھائی لاکھ ڈالرز ضمانت پر ایڈورڈ کو رہا کردیا۔ امریکی عدالت بھی ملزم کو اگلی تاریخیں دیتی رہی۔ ہر پیشی پر ڈیبی ضرور پیش ہوتی چاہے سماعت ۱۰/منٹ جاری رہے۔

ان کا مقدمہ کاؤنٹی کی ڈپٹی اٹارنی جنرل، ۳۶/سالہ نیل ملر لڑ رہی تھی۔ اس نے متوحش والدین کو بتایا کہ فیصلے میں دیر ہونا خوش بختی ہے کیونکہ یوں اسے مقدمہ مضبوط تر بنانے میں وقت مل رہا ہے۔

نیل ملر کو سب سے زیادہ یہ سوال تنگ کررہا تھا کہ کار کے اگلے حصے پر بہت تھوڑا خون کیوں ملا؟ حالانکہ ٹکر نے کپ کو اچھا خاصا زخمی کیا تھا اور اس کا بہت سا خون نکلا تھا۔ اُسے شک تھا کہ ایڈورڈ نے خون کسی طور صاف کر

اس ضمن میں نیل نے پولیس سے مشورہ کیا۔ انسپکٹر نے تجویز دی کہ مڈگارڈ پر ایک کیمیائی مادہ، لومینول (Luminol) پھیرا جائے۔ اس مادے کی خصوصیت یہ ہے کہ جب معمولی خون سے بھی میل ہو، تو چمک دار سبز رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ نیل نے فیصلہ کیا کہ یہ مادہ استعمال کیا جائے۔ ماہِ دسمبر میں پولیس لیبارٹری کے اہل کاروں نے یہ تجربہ انجام دیا۔

☆☆

جنوری ۲۰۱۱ء میں پیٹی نولینڈ نے وعدے کے مطابق ریاستی پارلیمنٹ میں بل نمبر ۱۰۲۷/پیش کردیا۔ اگلے ماہ اس بل کی خوبیاں بتانے کے سلسلے میں ڈیبی کو بھی پارلیمنٹ بلایا گیا۔ ریاستی ارکان کے سامنے ڈیبی بڑے اعتماد سے بولی اور بل کے حق میں جوشیلی تقریر کی۔ اس نے بتایا کہ ریاست میں بھی لوگ چاہتے ہیں ''مارو اور بھاگ جاؤ'' کے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو بھی سخت سزا ملے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بل منظور ہونے پر ایسے مجرموں کو ۲/سال نہیں ۷/برس کی قید کی سزا ہوگی۔

ڈیبی اپنے ساتھ کپ کی ایک بڑی سی تصویر لائی تھی۔ یہ اس کی آخری تصویر تھی۔ تصویر میں وہ اپنی پسندیدہ سفید ٹوپی اور سیاہ ٹی شرٹ پہنے ایک پُرفضا مقام پر کھڑا ہے۔ ڈیبی نے تصویر بلند کرتے ہوئے کہا:

''آج ایری زونا میں میرے بیٹے کو قتل کرنے کی سزا صرف ۲/سال ہے جبکہ تصویر میں تھوہر کے جو درخت نظر آرہے ہیں، انھیں کاٹنے کی سزا ۳۱/سال ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ قانون کی نگاہ میں اوّلیت کسے حاصل ہے؟''

چونکہ اس بل کو عوام اور ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل تھی، لہٰذا وہ تمام قانونی مراحل سے تیزی سے گزرا۔ یوں ۱۲/اپریل ۲۰۱۱ء کو یہ بل پارلیمنٹ نے منظور کرلیا۔ یہ وہی دن ہے جب کپ کے غمگین والدین نے نم ناک آنکھیں لیے اپنے بیٹے کی پہلی برسی منائی۔ اس کو ''کپس قانون''

انگریزی ادب

۲ بھائیوں کا دلچسپ ماجرا

ایک کو بڑا زعم تھا کہ وہ چیونٹی کی طرح سیانا ہے
آخر کوئی ایک دن تو جھینگر کا بھی ہوتا ہوگا

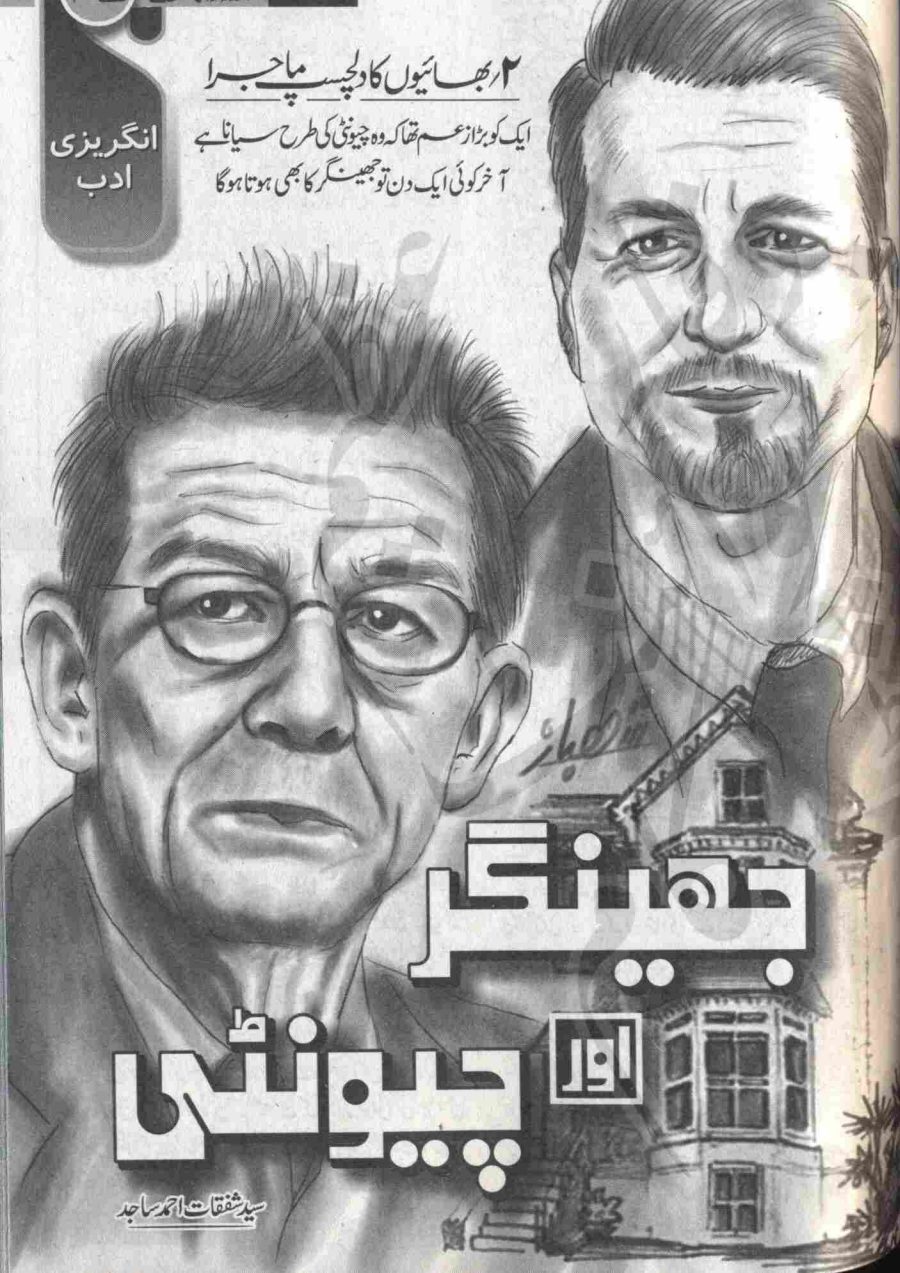

جھینگر اور چیونٹی

سید شفقت احمد ساجد

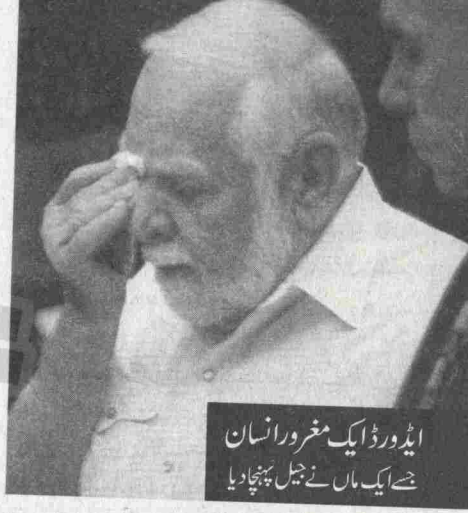

ایڈورڈ ایک مغرور انسان
جسے ایک ماں نے جیل پہنچا دیا

فیصلہ

آخر کار مئی کے وسط سے مقدمے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ استغاثہ نے کپ کے قاتل، ایڈورڈ کے خلاف ثبوت پیش کیے۔ کار کے اگلے حصے پر موجود گڑھے، خون کے دھبے، کپڑے کے ریشے اور اترا روغن۔

بعد ازاں ایڈورڈ نے جس ریستوران میں کھانا کھایا تھا، اس کے ملازمین نے گواہی دی کہ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ ان تمام ثبوتوں کے ذریعے نیل ملر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ دولت اور اثر و رسوخ نے ایڈورڈ کو بدمست کر دیا تھا۔ چنانچہ اس پر غیر ارادی قتل کا الزام لگانا جائز ہے۔

ملر اور اس کے نائب، پیٹرک گان سب سے ڈرامائی گواہی آخر میں سامنے لائے۔ تب پولیس لیبارٹری کا سربراہ، سٹیو گارنیٹ کٹہرے میں کھڑا ہوا۔ اس نے بتایا کہ رولز رائس کے مڈگارڈ سے ملنے والے سفید ریشے دراصل ٹشو پیپر کے تھے۔

پیٹرک نے پھر سٹیو سے لومینول تجربے کی بابت دریافت کیا۔ سٹیو نے بتایا کہ جب گاڑی کے اگلے حصے پر یہ کیمیائی مادہ لگا تو خون کے مزید دھبے نمودار ہو گئے۔ اسی تجربے سے یہ بھی دریافت ہوا کہ مڈگارڈ پر محلول کی ایک لکیر اوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ لکیر خون کی نہیں تھی۔ دراصل لومینول کا جب گھریلو صفائی کے کیمیکلز سے تعامل ہوا، تو یہ لکیر نمودار ہو گئی۔

پیٹرک نے دریافت کیا ''اس کا مطلب ہے کہ مڈگارڈ کو کیمیائی مادوں سے صاف کیا گیا؟''

سٹیو گارنیٹ نے جواب دیا ''جی ہاں! یہ ممکن ہے کہ مڈگارڈ سے خون لگا ہو۔ چنانچہ وہ دھونے سے صاف ہو گیا۔''

گواہیاں مکمل ہونے کے بعد کیس خاصا واضح ہو گیا۔ مڈگارڈ پر موجود گڑھے، خون کے دھبے، ٹشو پیپر کے ریشے اور نیچے تک جاتی کیمیائی محلول کی لکیر۔ جیوری کو اب اس بابت سوچنا تھا کہ ایڈورڈ جانتا تھا کہ اس نے کپ کو گاڑی تلے کچل ڈالا ہے، چنانچہ اس نے سعی کی کہ لڑکے کا خون صاف ہو جائے۔

لیکن ایڈورڈ نے ایک مختلف کہانی سنائی۔ ایڈورڈ نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ کار کپ سے ٹکرائی اور اسے مار ڈالا۔ اس کے وکیل، مارک بدوف نے بھی بحث کے دوران یہ بات تسلیم کی۔ ایڈورڈ کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے لڑکا نظر ہی نہیں آیا اور پھر جب کار کو جھٹکا لگا تو وہ یہی سمجھا کہ کوئی گڑھا تھا۔ اخبار میں مضمون پڑھ کر اسے معلوم ہوا کہ کیا ماجرا پیش آیا ہے۔

مقدمہ ایک ہفتے چلا۔ جب دلائل مکمل ہوئے، جیوری صلاح مشورے کرنے لگی۔ جب یہ کام بھی مکمل ہوا، تو عدالت کے کلرک نے فیصلہ سنایا۔ پہلا الزام، جس سے بھاگ جانے والا تھا۔ اس میں ایڈورڈ ''مجرم'' ثابت ہوا۔ یہ سن کر ڈیبی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایڈورڈ پر جس سے اہم الزام ''غیر ارادی قتل'' کا تھا۔ جب کلرک نے بابت پکار کر ''مجرم'' کہا، تو ڈیبی رو پڑی۔ وہ پھر بھاگ کر ملر اور پیٹرک سے ہم آغوش ہو گئی۔ یوں اس کی جدوجہد رنگ لے آئی اور ایک مغرور انسان جیل کی سلاخوں کے پیچھے گیا۔ ڈیبی کی یوں بھی جیت ہوئی کہ آج ''کپس قانون'' بدولت ریاست میں سبھی ڈرائیور دیکھ بھال کر ڈرائیو کرتے ہیں کیونکہ انھیں علم ہے کہ ان کے ہاتھوں کوئی مضروب ہوا، تو ۷ برس جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

جب

میں چھوٹا بچہ تھا تو مجھے اخلاقی حکایات سنائی جاتیں اور ہر حکایت کے اخلاقی پہلو سے روشناس کرایا جاتا۔ میں کہانی کے کرداروں کو بالکل حقیقی سمجھتا، چنانچہ کسی کردار سے چاہت اور کسی سے نفرت کا رشتہ استوار کرلیتا۔ اُنہی کہانیوں میں سے ایک کہانی ''جھینگر اور چیونٹی'' کی تھی، جس سے نونہالوں کو یہ سبق دیا جانا مقصود تھا کہ اس دارِفانی میں محنت کا صلہ اور بدچلنی کی سزا ضرور ملتی ہے۔ اس سبق آموز کہانی میں چیونٹی موسم گرما میں سخت محنت کے ساتھ موسم سرما کے لیے خوراک جمع کرتی ہے۔ جبکہ جھینگر گھاس کے پتے پر بیٹھا جھوم جھوم کر گاتا اور دادِعیش دیتا رہتا ہے۔ سرما کا موسم آتا ہے تو چیونٹی بڑی طمانیت سے بچوں کے ساتھ اپنے بل میں گھس بیٹھتی ہے مگر جھینگر کے پاس نعمت خانہ میں کوئی جمع شدہ اناج نہیں ہوتا۔ وہ چیونٹی کے پاس جاتا ہے اور بڑی لجاجت سے کہتا ہے ''بہن! بہن! مجھے تھوڑا سا اناج دے دو۔''

چیونٹی اپنے بل سے سر نکال کر پوچھتی ہے ''تم موسمِ گرما میں کیا کرتے رہے؟''

جھینگر نے انکسار سے کہا ''میں گانا گاتا رہا، گاتا رہا، بس دن رات گاتا ہی رہا۔''

چیونٹی بولی ''اچھا گاتے رہے ہو تو جاؤ، اب ڈانس کرو۔''

میں اسے اپنی کج فہمی یا اخلاقی بے راہ روی پر محمول نہیں کرتا۔ میرے بچپنے کی غیر منطقی اور ناپختہ سوچ کہیے کہ میں مذکورہ کہانی کے اخلاقی پہلو سے اپنے بچپن میں کبھی اتفاق نہ کرسکا اور میری تمام تر ہمدردیاں ہمیشہ جھینگر کے ساتھ رہیں۔ بعض اوقات تو چیونٹی کو دیکھتے ہی بے اختیار میرا جی چاہتا کہ پورے وزن کے ساتھ اُس پر اپنا پاؤں رکھ دوں۔ مگر والدہ کی یہ نصیحت کہ ''اللہ تعالیٰ کی ہر ذی روح مخلوق کے ساتھ بے رحمی سے نہیں بلکہ شفقت، نرمی، احسان اور درگزر سے پیش آنا چاہیے۔'' مجھے اس ارادے سے باز رکھتی۔

مجھے یہ کہانی جارج رمزے المعروف جیری کو دیکھ کر یاد آئی جو دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں الگ تھلگ سا بیٹھا نہایت افسردگی کے عالم میں خلا میں گھور رہا تھا۔ جیسے جہان بھر کا بوجھ اسی کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہو۔ اُسے یوں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب کی بار پھر اُس کے ناہنجار بھائی نے کوئی نئی مصیبت کھڑی کی ہوگی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''یار! بہت پریشان ہوں۔'' اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''پھر ٹوم ہی نے کچھ کر دکھایا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں! اُسی نے۔'' اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ دیکھیے! آپ نے اُس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اب تو آپ کو معلوم ہوجانا چاہیے کہ اُس کا معاملہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔'' میں نے اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرا خیال ہے ہر خاندان میں ایک نہ ایک ایسا نکھٹو ضرور ہوتا ہے۔ ٹوم رمزے نے عملی زندگی کا آغاز کاروبار شروع کرکے اچھے پیرائے سے کیا تھا۔ پھر شادی کی اور دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ مگر ایک روز اچانک اُس نے اظہار کیا کہ اسے موجودہ کاروبار تو کیا کوئی بھی ذریعہ معاش پسند نہیں اور یہ کہ وہ شادی کے لیے بھی موزوں شخص نہیں تھا اور صرف اپنی ذات کے لیے عیش وعشرت پسند کرتا ہے۔ چنانچہ اُس نے آفس جانا ترک کیا، بیوی بچوں کو خیرباد کہا اور جو تھوڑی بہت رقم تھی، جیب میں ڈال ملکوں ملکوں سیر وتفریح پر روانہ ہوگیا۔ گاہے گاہے اُس کے عزیزوں کو اُس کی الٹی سیدھی حرکتوں کی خبریں ملتیں تو وہ پریشان ہوجاتے اور ہمیشہ یہی سوال اٹھتا کہ جب اُس کے پاس رقم ختم ہوجائے گی تو پھر کیا ہوگا؟ مگر وہ تھا آزاد

منش اور خوش وقت آدمی۔ پھر جلد ہی معلوم ہوا کہ اُس نے رقوم اُدھار حاصل کرنا شروع کردیں۔ میں نے آج تک اُس جیسا پُرکشش اور فسوں گر شخص نہیں دیکھا کہ وہ اُدھار مانگے اور دوسرے سے انکار ہوسکے۔ چنانچہ وہ مسلسل دوستوں سے قرض لے کر گزر اوقات کرتا رہا اور دوست بنا لینا اُس کے لیے بہت آسان کام تھا۔ اُس کا ہمیشہ یہی کہنا رہا کہ جو رقم آپ روزمرّہ کی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں، وہ بیزار کن ہے۔ مگر جو خرچ عیاشیوں پر اٹھتا ہے، وہ اطمینان اور سکون کا باعث ہے۔ اپنی اور بچوں کی ضروریات زندگی کے لیے وہ ہمیشہ جیری کا دستِ نگر رہا۔ اس مد پر خرچ کرنے کو وہ دولت کا ضیاع خیال کرتا تھا۔

ایک مرتبہ جیری نے ٹوم کے جھانسے میں آکر اُسے معقول رقم بھی دے ڈالی تاکہ وہ نئے سرے سے کاروبار شروع کرسکے۔ مگر ٹوم نے رقم ہاتھ لگتے ہی ایک نئی موٹر خریدی اور بقایا رقم قیمتی گھڑی اور زیور خریدنے پر صرف کردی۔ جب جیری کو اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ اس کا بھائی سدھرنے والا نہیں تو اس نے اس سے ترکِ تعلق کرلیا۔ مگر ٹوم نے خاندانی حمیت کو تج کر چھوٹے موٹے کام شروع کردیے۔ جیری کو وہ کبھی لاٹری ٹکٹ فروخت کرتا اور کبھی خوردہ فروش کے طور پر بازار کی نکڑ پر کھڑا نظر آتا۔ جیری نے اُسے ایسے کاموں سے باز رہنے کو کہا تو اُس نے مطالبہ کیا کہ اگر اُسے ۲۰۰ر پاؤنڈ مل جائیں تو وہ ایسے کام نہیں کرے گا، چنانچہ جیری نے اُسے یہ رقم ادا کردی۔

ایک مرتبہ جیری یہ سن کر بہت آزردہ ہوا کہ ٹوم جیل جانے والا تھا۔ چنانچہ اُسے بادلِ نخواستہ معاملے میں مداخلت کرنا پڑی۔ ٹوم ناشائستہ، نامعقول اور لالچی تو تھا مگر اُس نے آج تک کوئی ایسی بددیانتی نہیں کی تھی جو قانونی نکتۂ نظر سے قابلِ تعزیر ہوتی۔ مگر اب کی بار اگر اُس پر نالش ہوتی تو عدالت سے یقیناً اُسے سزا ہوجاتی۔ مگر کون ہے جو اپنے اکلوتے بھائی کا جیل جانا پسند کرے گا؟ جیری کو معلوم ہوا کہ ٹوم نے گرانشاء نامی شخص سے کچھ رقم ہتھیالی تھی اور وہ شخص ہر قیمت پر معاملہ کو عدالت میں لے کر جانا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹوم جیسے بدقماش شخص کو عدالت سے قرارِواقعی سزا ہونی چاہیے۔ جیری کو اس معاملے کو نبٹانے کے لیے بہت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے پانچ سو پاؤنڈ کا چیک بحق گرانشاء جاری کرکے معاملہ رفع دفع کرایا۔

میں نے جیری کو آج تک اس قدر غصہ میں نہیں دیکھا جتنا اُس روز دیکھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ چیک کیش کراتے ہی ٹوم اور گرانشاء مل کر مونٹی کارلو چلے گئے تھے جہاں انہوں نے ایک ماہ بڑی عیش وعشرت میں گزارا۔

عرصہ ۲۰ر سال تک ٹوم کسی نہ کسی طور رقوم حاصل کرکے اچھے سے اچھا لباس زیب تن کرتا، جوا کھیلتا، ہوٹلوں میں ڈانس پارٹیوں میں شرکت کرتا اور ہر طرح دادِعیش دیتا رہا۔ وہ ایسے بن سنور کر رہتا جیسے کسی شوکیس میں لگا نقلی مجسّمہ ہو۔ اُس کی عمر ۴۶ر سال ہوچکی تھی مگر وہ ۳۵ر سے زیادہ کا نہیں دکھتا تھا۔ وہ نہایت دلچسپ مجلسی آدمی تھا۔ خواہ کسی کو معلوم ہی ہوتا کہ ٹوم معاشرتی اعتبار سے بے راہ رو تھا مگر وہ اس کی صحبت سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ ہمیشہ شگفتہ مزاج، شادماں اور فسوں کار سا ہوتا۔ اُس نے جب کبھی اپنی ضروریات کے لیے مجھ سے کچھ رقم طلب کی، میں نے انکار نہ کیا۔ میں اس کے مطالبہ پر اُسے ۵۰ر پاؤنڈ بھی ادھار دیتا تو اُس کی شخصیت اور اندازِ طلب سے اس قدر متاثر ہوتا کہ مجھے لگتا جیسے اُس نے مجھے ۵۰ر پاؤنڈ اُدھار دیے ہوں۔ ٹوم کو ہر کوئی جانتا تھا اور

تبصرہ

تبصرہ نگار نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''زیرِ نظر کتاب کے مختلف ابواب میں گہرا اور مضبوط ربط دکھائی دیتا ہے اور یہ سارا کمال جلد ساز کا ہے، لکھنے والے کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

(عرفان رشید، لاہور)

وہ ہر کسی کو جانتا تھا۔ آپ بے شک اُس کی زندگی کے چلن کو ناپسند کریں مگر اُسے پسند کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جیری اپنے بھائی ٹوم سے صرف ایک سال بڑا تھا۔ مگر وہ ۶۰ر سال کا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے گزشتہ ربع صدی کی ملازمت کے دوران کسی ایک سال میں کبھی ۲ر ہفتے کی دفتری رخصت نہ لی تھی۔ وہ صبح ساڑھے نو بجے دفتر آتا اور کبھی ۶ر بجے سے پہلے گھر کے لیے روانہ نہ ہوتا۔ وہ لائق فائق تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ نہایت ایماندار اور محنتی تھا۔ اُس کی بیوی ایک وفاشعار خاتون تھی اور جیری نے بھی کبھی اُس کا جی میلا نہیں ہونے دیا تھا۔ اُس کے ۴ر بچے تھے جن کی نظر میں وہ ایک مثالی باپ تھا۔ اپنے ہی وضع شدہ اصول کے مطابق وہ ماہانہ آمدنی میں سے ایک تہائی رقم پس انداز کرلیتا۔ اُس کا خیال تھا کہ پچپن کی عمر کو پہنچ کر وہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لے گا۔ پھر مضافاتی علاقہ میں ایک خوبصورت چھوٹا سا گھر بنائے گا۔ باغ لگائے گا اور گولف کھیلا کرے گا۔ وہ معصومانہ سی زندگی گزار رہا تھا اور خوش تھا کہ وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ٹوم بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ ایک بار اُس نے اپنے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا ”کتنا اچھا زمانہ تھا جب ٹوم ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا ہی تو ہے۔ آج سے ۴ر سال بعد وہ ۵۰ر سال کا ہوجائے گا۔ تب اُسے زندگی اتنی آسان نہیں لگے گی۔ جب میں ۵۰ر سال کا ہوں گا تو میرے پاس پورے ۳۰ر ہزار پاؤنڈ ہوں گے۔ گزشتہ ۲۵ر سال سے میری اُس کے بارے یہی رائے رہی ہے کہ ٹوم کا انجام خستہ حالی ہے۔ تب دیکھیں گے کہ اُس کو اپنا ویسا انجام کیسا لگے گا۔ بہرحال اُسے یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ نکما رہنے سے کام کرنا ہی بہتر ہے۔“

پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ جیری نہایت غمگین صورت لیے بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب ہو بیٹھا اور ازراہِ ہمدردی اُس سے دریافت کیا کہ ”آج پھر ٹوم نے کوئی بُری حرکت کر ڈالی ہے؟“

”کیا تمھیں معلوم ہے کہ اب کیا ہوا ہے؟“ اُس نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں کوئی بدترین خبر سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اب کی بار شاید پولیس نے ٹوم کو کسی جرم میں گرفتار کرلیا تھا۔ جیری بہت مشکل سے بول پایا:

”آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے زندگی بھر اَن تھک محنت کی ہے اور معاشرہ میں شائستہ مزاج، معزز اور صاف گو شخص کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ میں نے محنت سے کام کیا اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کی اور ہمیشہ منشاءِ ایزدی کو مدِنظر رکھ کر فرائض منصبی ادا کیے۔“

”بالکل سچ ہے۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”اور آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ ٹوم نوعمری سے تاحال نکما، ناشائستہ، فریبی، سیاہ کار رہا ہے۔ اُس کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی محتاج خانہ میں پڑا ہوتا۔“

”بالکل درست ہے۔“ میں نے کہا۔

جیری کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بولا ”چند ہفتے قبل کی بات ہے، ٹوم نے اپنی والدہ کی عمر کی ایک خاتون سے شادی کرلی جو اب اچھا خاصا ترکہ چھوڑ کر فوت ہوگئی ہے۔ ترکے میں اُسے نصف ملین پاؤنڈ، ایک بجرہ برائے سمندری سیر و تفریح، ایک گھر لندن میں، دوسرا گھر مضافاتی علاقہ میں واقع ہے، ملے ہیں۔“ جیری نے پھر زور سے میز پر مُکا مارتے ہوئے کہا:

”یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں یہ بالکل ٹھیک نہیں ہوا۔ لعنت بھیجو ایسا ہونے پر، یہ ٹھیک نہیں ہوا۔“

جیری کا غصہ سے لال بھبوکا، قہر آلود چہرہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں اتنا ہنسا کہ لڑھک کر کرسی سے زمین پر آرہا۔ جیری نے میری اس حرکت پر مجھے کبھی معاف نہیں کیا۔ لیکن ٹوم مجھے اکثر اپنے مے فیئر میں واقع خوبصورت گھر میں بلاتا رہتا ہے اور کبھی کبھی عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے اُدھار بھی مانگتا ہے لیکن ایک آدھ پاؤنڈ سے زیادہ کا نہیں......

سچی داستان

ایک زائر کا قصۂ دل پذیر

اسے نیاز تقسیم کرنے کا بے حد شوق تھا
نیاز ختم ہوجاتی تو اس کا دل دکھ سے بھر جاتا
پھر ایک روز عجیب واقعہ ہوا
اب تک اس کی حیرت نہیں جاتی

کھُلا دل خالی ہاتھ

فرحان ولایت بٹ

اُس کی آنکھوں میں مایوسی تھی اور چہرے پر دکھ کے آثار۔ میرے لیے ان آنکھوں کا سامنا کرنا بے حد دشوار تھا لیکن سب سے بڑی اذیت تو وہ پھیلا ہوا خالی ہاتھ تھا، جسے وہ دھیرے دھیرے اپنی جانب واپس موڑ رہی تھی۔ وہ تیس بتیس سال کی دبلی پتلی عورت تھی، جس کا معمولی لباس اور ملتجیانہ انداز اس کی غربت اور لاچارگی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ اس کا بایاں ہاتھ تقریباً سات آٹھ سال کے بچے نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا جو قدرے بے رونق اور خالی خالی نگاہوں سے میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ کتنی ویرانی تھی اس کے چہرے پر۔ شاید وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ اُسے یہاں سے خالی ہاتھ ہی واپس لوٹنا پڑے گا۔ دائیں جانب ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی سی بچی میلے سے فراک میں ملبوس کھڑی تھی۔ اُس کا دھیان یقیناً ہماری جانب نہ تھا کیونکہ وہ ایک چھوٹی سی ٹوٹی ہوئی گڑیا سے کھیلنے میں مگن تھی۔ میلے میلے ہاتھوں میں پیار سے تھامی ہوئی وہ میلی سی گڑیا...... میں نے ایک نظر بچی کے چہرے پر ڈالی۔ میلے چیکٹ بالوں میں ادھ ڈھکا وہ معصوم چہرہ دنیا کے جھنجھٹ اور پریشانیوں سے بالکل مبرا دکھائی دے رہا تھا۔ ’کیا ایک بھی روٹی نہیں بچی بھائی‘؟ اور یکدم میری نگاہ اُنھی مایوس آنکھوں کی جانب واپس لوٹ گئی، جنھیں دیکھنے کا حوصلہ مجھ میں باقی نہ رہا تھا۔ میں نے قدرے توقف سے سر کو نفی میں ہلایا اور اُس کے خشک لب کچھ کہنے سے پہلے ہی خاموش ہو گئے۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ جیب سے بٹوہ نکال کر میں ابھی کھولنے ہی والا تھا کہ وہ فوراً دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے واپس پلٹ گئی۔ ”نہیں بھائی، میں بھیک نہیں مانگ رہی“ ...... اور میں وہیں کھڑا دل مسوس کر رہ گیا۔

یہ حضرت میاں میرؒ کا دربار تھا، جہاں میں اپنے چند رشتے داروں کے ساتھ مل کر نیاز تقسیم کرنے آیا تھا۔ خالہ جان نے ۲۰۰ر روٹیاں اور ڈھیر ساری حلیم تیار کروا کر ہمیں روانہ کیا تھا کہ مزار پر جا کر بطورِ نیاز تقسیم کر دیا جائے۔ مزارات پر نیاز کی تقسیم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور ۲۰۰ر لوگوں کی نیاز چند ہی لمحوں میں یوں تقسیم ہو گئی کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اندازہ تو تب ہوا، جب خالی برتن سنبھالتے ہوئے میں نے ان تینوں کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ”شکر ہے خدا کا، کہیں تو کوئی سبیل دکھائی دی۔ بچے صبح سے مسلسل بھوکے ہیں۔ نیاز کی ۲ر روٹیاں ہی عنایت کر دیجیے“۔

میں نے پہلی بار سر اٹھا کر ان تینوں کا جائزہ لیا۔ ’نیاز تو تقسیم ہو چکی ہے۔“ میں نے قدرے جھجکتے جواب دیا۔ لمحہ بھر میں وہ آنکھیں ویران ہو گئیں۔ ایک آس، ایک امید کی جو کرن مجھے اُس کی آنکھوں میں دکھائی دی تھی، اُس کی آخری رمق بھی ماند پڑ گئی۔ میں نے بے بسی سے اُس کا خالی ہاتھ واپس لوٹتے ہوئے دیکھا اور پھر اُس دن کے بعد میں کئی دنوں تک اُس خالی ہاتھ اور ویران نگاہوں کو بھلا نہ پایا۔

چند ماہ گزرے کہ بابا غیب علی شاہؒ کا عرس قریب آگیا۔ پھر کیا تھا، مجھ سمیت چند خالہ زاد اسی ذمے داری پر مامور کر دیے گئے کہ مزار پر آئے زائرین میں نان حلوہ بطورِ نیاز تقسیم کیا جائے۔ خوش قسمتی کہوں یا بدبختی، کہ نیاز تیار کرانے، سامان لانے اور لے جانے کی ذمے داریاں دوسروں کے حصے میں آئیں اور تقسیم کی ذمے داری پھر مجھ پر عائد کر دی گئی۔ لوگوں کا ہجوم اور دھکم پیل دیکھ کر میں کچھ گھبرایا تو سہی، لیکن پھر برق رفتاری سے نیاز کی تقسیم کا کام شروع کر دیا۔

۵۰۰/ نان کب تقسیم ہو گئے، کچھ سمجھ ہی نہ آیا۔ لیکن جب پلٹ کر انھی زائرین کی جانب دیکھا، تو اس روز کتنے ہی خالی ہاتھ، کتنے ہی پرامید چہرے، کتنے ہی غریب لوگ دکھائی دیے۔ 'نیاز ختم ہو چکی ہے بھائی'۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا، جب میں نے ڈھیر ساری مایوس نگاہوں کو اپنے چہرے کا طواف کرتے ہوئے پایا۔ پھر وہی مایوسیاں، پھر وہی ویرانیاں..... کتنے ہی خالی ہاتھ جیسے میرا دامن پکڑنے لگے اور میں چکرا کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ''نہیں، یہ کام اب مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔ میں ان ویران نگاہوں اور مایوس چہروں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں ان پھیلے خالی ہاتھوں کو واپس لوٹتا نہیں دیکھ سکتا۔''

گھر واپسی پر میری عجیب حالت تھی ''امی جان، کتنے ہی لوگوں میں نیاز تقسیم نہیں ہو سکی۔ لوگ بہت حسرت اور لاچارگی سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ مایوسی سے خالی ہاتھ واپس چل دیے اور ہاں..... کچھ لوگ بدستور اسی طرح ہاتھ پھیلائے انتظار کرتے رہے۔ انتظار..... کہ شاید میں عمرو عیار کی طرح زنبیل میں ہاتھ ڈالوں گا اور ان سیکڑوں ہاتھوں میں نیاز تھمائے چلا جاؤں گا۔ لیکن اُن خالی ہاتھوں کو خالی ہی لوٹنا پڑا''۔

دل عجیب کشمکش سے دوچار تھا لیکن شاید میری والدہ کو یہ کیفیت میرا بچپنا اور ناسمجھی کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولیں ''اللہ اپنے بندے کو جس قدر توفیق عطا فرمائے، وہ اپنی قوت اور استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ وہاں پر کبھی سیکڑوں اور کبھی ہزاروں زائرین نظر آئیں گے لیکن ۵۰۰/ زائرین سے زائد افراد کے لئے نیاز کا بندوبست ہمارے لیے واقعی ممکن نہیں تھا۔ اللہ نے ہمیں جتنی توفیق عطا فرمائی، ہم نے اس کے مطابق کھل کر خرچ کیا۔''

لیکن میں اس جواب سے مکمل طور پر مطمئن نہ ہو پایا۔ بے شک اللہ جس قدر توفیق عطا فرمائے، اس سے ایک قدم بھی آگے بڑھنا کسی ذی روح کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن میرے سامنے مایوس نگاہوں اور خالی ہاتھوں والے لوگ آجاتے۔ میرا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ کیا میں بہت حساس ہوں یا پھر بزدل؟ لوگ تو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کو خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر نہیں گھبراتے، پھر میں خود خالی ہاتھ ہو کر بھی کسی کو خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے کیوں نہیں دیکھ سکتا؟ کیوں میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے؟ یہی سوچتے سوچتے کبھی راتیں جاگتے ہوئے گزر جاتیں، تو کبھی دن بے سکونی کی حالت میں گزرتے۔ لیکن مجھے کوئی حل سجھائی نہ دیتا تھا۔ کتنے ہی دن اس عجیب کشمکش میں بیت گئے۔ آخر ایک دن میں نے مسئلے کا حل تلاش کر ہی لیا۔ ''چاہے اب کچھ بھی ہو جائے، میں اب اپنے ہاتھ سے نیاز تقسیم نہیں کروں گا''۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ جانے یہ میرا مصمم ارادہ تھا، یا پھر ایک مستقل ضد، یا شاید میری ہٹ دھرمی کہ میں نے اگلے ۱۵/ سال تک کبھی بھی نیاز کی تقسیم کی ذمے داری اپنے سر نہ لی۔ کبھی چھوٹے بھائی کو اس ذمے داری پر مامور کر دیا، تو کبھی دیگر عم زادوں کی موجودگی میں عین موقع پر خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ پندرہ سال..... میری پرانی یادداشتوں پر گرد جمانے کے لیے کافی تھے۔ لیکن کبھی کبھی مجھے تنہائی میں بہت سے خالی ہاتھ اپنے آس پاس پھیلے محسوس ہوتے اور میں اچانک گھبراہٹ کے عالم میں تنہائی سے اُٹھ کر دوستوں کی محفلوں میں خود کو بہلانے کی کوششیں کرنے لگتا تھا۔

اپریل ۲۰۱۱ء کی شروعات تھی، جو میری زندگی کا مبارک ترین مہینا بن گیا۔ ایک دن دفتر سے گھر آیا تو امی جان نے مسکراتے ہوئے میرا ماتھا چوما اور خبر دی کہ ہمارے عمرے کا ویزہ لگ چکا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایک عجیب سی ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی کہ کبھی خوشی کے عالم میں گلے لگ کر ایک دوسرے کو ڈھیروں مبارکباد دیتے، تو کبھی دھیرے دھیرے اپنے آنسو پونچھنے لگتے کہ آخر اللہ کے در سے بلاوا آ ہی گیا۔

مکہ میں ۵/ روز پلک جھپکتے میں گزر گئے اور پھر مدینے والے کا بلاوا بھی آگیا۔ عجب سرشاری کے عالم میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور پھر جب مدینے کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا تو یوں لگا کہ رحمتوں والے کی سرزمین پر چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اپنے مہمانوں کو گلے لگا کر خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ مدینے کی دھرتی پر ۱۳/ روز کا قیام..... یا الٰہی، ہم سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو گا کہ ہر صبح مدینے کی اذانوں سے آنکھ کھلی اور ہر رات اسی آس پر نیند آئی کہ کاش یہی زندگی کی آخری رات ہو کہ اگلے دن میں خود کو مدینے کی مٹی کی نذر ہوتے دیکھوں۔

۳/ دن زیارات سے آنکھیں خیرہ ہوتی رہیں اور جب چوتھا دن چڑھا، تو امی جان کو اچانک خیال آیا۔ ''فرحان، آج نمازِ عصر کے وقت چار پانچ کلو کھجوریں ساتھ لے چلنا۔ نمازِ عصر کے بعد گنبدِ خضریٰ کے نزدیک نمازیوں میں تقسیم کر دیں گے''.....

''جی؟'' چائے کا کپ یقیناً میرے ہاتھوں سے چھوٹنے ہی والا تھا۔ ''جی، بہت بہتر''۔

ظہر کے بعد تمام وقت نہایت پریشانی میں کٹا اور جب نمازِ عصر کے لیے روانہ ہونے لگے تو امی جان کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جم سی گئیں۔ ''کھجوریں نہیں لائے؟ میں نے کہا بھی تھا نمازِ عصر کے بعد نمازیوں میں تقسیم کرنی ہیں''۔

یقیناً انھیں میری اندرونی کیفیت کا علم نہ تھا۔ ''..... میں بھول گیا''۔ جلدی میں اور کوئی بہانہ بھی نہ سوجھا۔ اگلے ۲/ روز بھی انھیں کسی نہ کسی طرح ٹالتے ہوئے گزر گئے اور پھر تیسرے دن انھوں نے پوچھ ہی لیا۔ ''آخر کیا بات ہے فرحان، میں گزشتہ ۳/ دنوں سے ایک ہی بات بار بار دہرا رہی ہوں۔ کیا مسجدِ نبوی میں کھجوریں تقسیم کرنے میں کسی قسم کی قباحت ہے؟''

میرے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ تھا، مگر وہ چپ نہ رہیں۔ ''بیٹا! آپ دیکھ ہی چکے ہو، کتنے ہی لوگ عقیدت اور محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر عصر سے مغرب کا درمیانی وقت گنبدِ خضریٰ کی زیارت میں گزار دیتے ہیں۔ یہ لوگ عام لوگ نہیں، بلکہ سرکارِ دوعالم ﷺ کے مہمان ہیں۔ ہمارے لیے اس سے بڑی اور کیا سعادت ہو گی کہ ہم آقائے دوجہاں ﷺ کے مہمانوں کی مہمان داری کریں''..... ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور میں نے اگلے دن کا وعدہ کر کے انھیں مطمئن کر دیا۔

اُس روز نمازِ عصر کے بعد میں بارگاہِ الٰہی میں دیر تک دعا کرتا رہا۔ ''اے میرے پروردگار، تو اپنی مخلوق کے دل کا حال جانتا ہے۔ تجھے خوب معلوم ہے کہ میں کسی کی آنکھوں میں مایوسی اور کسی کا لوٹتا ہوا خالی ہاتھ نہیں دیکھ سکتا۔ میرے رب مجھ پر کرم فرما اور مجھے اس کڑے وقت سے بچ نکلنے کی توفیق دے۔''

آنکھیں تھیں کہ چھلکنے کو بے تاب ہونے لگی اور گلے میں آنسوؤں کا ایسا پھندا لگا کہ میں خود کو رونے سے باز نہ رکھ پایا۔ آس پاس دیگر نمازیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے میں ربِ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر آہ و زاری کرنے لگا۔ ''اے میرے مالک و مولا، ہم پر اس سے بڑھ کر اور کیا کرم ہو گا کہ ہمیں سرکارِ مدینہ ﷺ کے مہمانوں کی مہمان داری کا شرف حاصل ہو لیکن اگر آج یہاں ایک بھی ہاتھ خالی گیا تو روزِ محشر میں تیرے حبیب ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ ان کے در پر آئے مہمانوں کی مہمان داری تک نہ کر پایا۔ میرے رب میری مدد فرما اور اپنے حبیب ﷺ کے صدقے ہمیں اتنی برکت سے فیض یاب فرما کہ کسی ایک مہمان کا ہاتھ بھی خالی نہ

لوٹ پائے۔"

اگلے دن میری ہمت اور حوصلے کا کڑا امتحان تھا۔ نمازِ عصر کے وقت ہم مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوئے۔ حسبِ معمول نماز کے بعد گنبدِ خضریٰ کے سامنے پاکستانی، بھارتی، ایرانی اور بنگلہ دیشی لوگوں کا ہجوم آموجود ہوا۔ کوئی تسبیح میں مصروف تھا تو کوئی درودِ پاک کے ورد میں مشغول اور کچھ لوگ بس ایک ٹک سبز گنبد کا دیدار کیے جا رہے تھے۔ میں نے ایک بار چاروں طرف نگاہ دوڑا کر سیکڑوں لوگوں کا جائزہ لیا اور پھر کھجوروں کی اس قلیل مقدار پر نظر ڈالی، جسے دیکھتے ہوئے یقیناً میری آنکھوں میں کسی حد تک خوف اور بے یقینی کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک لمبا سانس بھر کر اللہ عزوجل کا نام لیا اور نمازیوں میں کھجوریں تقسیم کرنے لگا۔ میری نظریں جھکی ہوئیں اور چہرہ سپاٹ تھا، ہر طرح کے تاثرات سے عاری..... کتنی ہی نظریں میرے تعاقب میں تھیں اور ایک کے بعد ایک کتنے ہی ہاتھ میرے سامنے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے کھجوروں کی مقدار پر دوبارہ نظر نہ ڈالی اور بس ایک ایک کر کے ہر پھیلے ہوئے ہاتھ کو مٹھی بھر کھجوروں سے بھرتا چلا گیا۔ اُس روز رب تعالیٰ کی پاک ذات نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے مجھ گناہگار انسان پر وہ کرم کیا کہ جس کا میں جتنا چاہے شکر ادا کروں، کم ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے کھجوروں کی ایک قلیل مقدار کو سیکڑوں نمازیوں میں بھر بھر کر تقسیم کیا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، سبھی لوگوں میں ڈھیروں کھجوریں تقسیم ہوئیں لیکن میرے ہاتھوں میں موجود کھجوروں کا تھیلا پھر بھی خالی نہ ہوا۔ کون کہتا ہے کہ آج کے دور میں معجزے رونما نہیں ہوتے؟ حد تو یہ ہے کہ جب لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں کھجوریں تقسیم ہو چکیں تو میں نے آخری بار تھیلے میں نگاہ ڈالی، وہاں ۲/ کھجوریں اب بھی باقی تھیں۔ خوشی کے آنسو آنکھوں سے یوں چھلکنے لگے، جیسے اُسی وقت رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کو بے تاب تھے۔ میں نے اسی وقت اللہ عزوجل کی بارگاہ میں شکرانے کے نوافل کی نیت باندھ لی۔

نمازِ مغرب کے لیے وضو کرتے ہوئے مجھے داہنے ہاتھ سے آتی کھجوروں کی مٹھاس بھری خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے دو تین بار صابن سے اچھی طرح ہاتھ دھوئے لیکن نماز کے دوران اور بعد از نماز بھی اُس خوشبو میں رتی برابر کمی نہ آئی، تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ خواتین کے دروازے سے امی جان کو ساتھ لیا تو بے اختیار ان کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا "کیا آپ کو میرے ہاتھ سے میٹھی کھجوروں کی خوشبو آ رہی ہے"؟ اگلے ہی لمحے میری حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، جب انھوں نے سوال کیا..... "کیا یہ کسی عطر کی خوشبو ہے؟"

میں آج تک وہ شام بھول نہیں پایا۔ ہماری کھجوریں مقدار میں صرف ۵/ کلو تھیں، وہ اتنی زیادہ نہ تھی کہ سیکڑوں لوگوں میں وافر مقدار میں تقسیم ہو پاتی۔ وہ تو عام کی کھجوریں تھیں، کوئی مہنگی اور خوشبودار کھجوریں نہیں تھیں کہ جنھیں چھونے یا پکڑنے سے ہاتھ بھی معطر ہونے لگتے۔ یہ تو بس میرے سوہنے رب کا ایک معجزہ تھا، جو اُس نے اپنے پیارے محبوب ﷺ کے مہمانوں کی مہمان داری کے لیے دکھایا۔ یہ معجزہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ اُس روز کے بعد اگلے کئی دنوں تک ہم یونہی بعد از نمازِ عصر تمام نمازیوں میں کھجوریں تقسیم کرتے رہے اور اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے ہمیں ایک بار بھی کمی بیشی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

کہتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے در پر جانے والوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی معجزہ رونما ہوتا ضرور ہے۔ میں اُن معجزات کو مرتے دم تک فراموش نہیں کر پاؤں گا، جنھوں نے مکمل طور پر میری کایا ہی پلٹ دی۔ اب بھی اکثر جی چاہتا ہے، کہ مدینے کا وہی شہر ہو، سبز گنبد کے وہی نظارے ہوں، سرکارِ مدینہ کے ڈھیر سارے مہمان ہوں اور میں کھلے دل سے مہمانوں کے خالی ہاتھ بھرتا چلا جاؤں..... بھرتا چلا جاؤں..... بھرتا چلا جاؤں.....

بڑے بچوں کے لیے ایک کہانی

ایک بادشاہ کا ماجرا

اُسے نئے وزیر کے انتخاب کا مشکل مرحلہ درپیش تھا

انتخاب

سید سلیم گردیزی

بچے ضد کرتے ہیں کہ میں انھیں کہانی سناؤں۔ انھیں کہانی سناتا ہوں تو اس سے کوئی نتیجہ بھی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ آج بھی ضد سے مجبور ہو کر آپ کو کہانی سنا رہا ہوں کیونکہ یہ بڑے بچوں کے لیے ہے۔

بادشاہ سلامت اپنے رعب داب اور شاہانہ جلال کے ساتھ بھاری بھرکم قافلے کے ہمراہ شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور بادشاہ سلامت کا موڈ خوشگوار تر۔ نوکر، ملازم شکار کو گھیر گھار کر یا منت سماجت کر کے بادشاہ سلامت کے تیر کی زد میں لے آنے کے لیے شاہی قافلے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شہنشاہ معظم کی نشانہ بازی کی مہارت اور مہم جوئی کی داد دینے کے لیے وزرا، مشیران عظام، روسائے مملکت، مصاحبین اور دیگر عمائدین سلطنت شریک قافلہ تھے۔ سلطنت میں امن و امان کی مثالی صورت حال اور شیر اور بکری کے ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے کی تاریخی صداقتوں کی گواہی دینے اور جہاں پناہ کے عدل و انصاف کے واقعات رقم کرنے کے لیے شاہی مؤرخ بھی اپنے قلم و قرطاس سمیت قافلے میں شامل تھا۔ مستقبل کی پیشین گوئی کرنے والے رمّال اور منجم بھی قافلے کی رونق تھے۔

اتنے میں ایک ناخوشگوار صورت حال پیدا ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک غریب کمہار اپنے گدھے پر مٹی لادے برتن بنانے کے لیے لے جا رہا تھا کہ شاہی قافلے سے اس کا آمنا سامنا ہوگیا۔ راوی اس بارے میں خاموش ہے کہ کمہار اور اس کے گدھے پر خود کش حملہ آور ہونے کا شبہ کیا گیا یا نہیں۔ اس بارے میں بھی مؤرخ نے کچھ نہیں لکھا کہ کمہار اور اس کے گدھے کی جامعہ تلاشی عمل میں لائی گئی یا نہیں اور اگر لائی گئی تو کیا "برآمد" ہوا وغیرہ وغیرہ۔ تاہم راوی اتنی بات بیان کرتا ہے کہ کمہار اور اس کا گدھا دونوں احتراماً راستے سے ایک جانب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ سلامت جب ان کے پاس سے گزرے تو کمہار نے ان سے یہ پوچھنے کی جسارت کی "بادشاہ سلامت آج کدھر کا ارادہ ہے؟" عوام کو اور وہ بھی کمہار کی سطح کے یہ حق تو نہیں دیا جاسکتا کہ وہ بادشاہ سلامت سے اس بے تکلفی سے ہم کلام ہوں تاہم جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے، بادشاہ سلامت کا موڈ بڑا خوشگوار تھا لہٰذا انہوں نے ازراہِ رعایا پروری شاہانہ تمکنت سے جواب مرحمت فرمایا:

"آج مابدولت کا جی شکار کرنے کو چاہتا ہے۔ اس لیے مابدولت شکار کے ارادہ سے جنگل میں رونق افروز ہونا چاہتے ہیں۔"

کمہار نے شاہی فرمان سننے کے بعد اپنے گدھے کے سراپے کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور مڑ کر بادشاہ سلامت کی خدمت میں عرض گزار ہوا:

"بادشاہ سلامت میری مانیں تو آج شکار کا ارادہ ترک فرماتے ہوئے واپس چلے جائیں کیونکہ آج شدید بارش کا امکان ہے اور ہوسکتا ہے تند آندھی بھی چلے اور اولے بھی پڑیں۔"

کمہار کی یہ پیشین گوئی سن کر بادشاہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا کیونکہ دربار کے تمام ماہرین موسمیات نے

موسم کے خوشگوار ہونے کی خوش خبری دی تھی۔ بادشاہ نے فوراً اپنے وزیراعظم کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔ وزیراعظم نے بادشاہ سلامت کو یقین دلایا کہ موسم ان کی حسبِ منشا (بلکہ حسبِ حکم) خوشگوار رہے گا اور یہ کہ کمھار پرلے درجے کا جاہل، گنوار اور بے وقوف قسم کا ''عامی'' ہے جس کی رائے کو اہمیت دینا بادشاہوں کے شایاں نہیں۔ لہٰذا بادشاہ سلامت شکار کے ارادہ کو ترک نہ فرمائیں بلکہ کمھار کو اس بے جا جسارت کی سزا دی جائے کہ اس نے ''عام آدمی'' ہو کر بادشاہ سلامت کو مشورہ دینے کی نامعقول حرکت کی۔ وزیر با تدبیر کی یقین دہانی پر بادشاہ سلامت سفر جاری رکھنے پر رضامند ہوئے تاہم کمھار اور اس کے گدھے کو تاحکم ثانی جیل میں ڈال دینے کے احکامات صادر ہوئے تاکہ بادشاہ سلامت واپسی پر ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ کرسکیں۔

شاہی قافلہ آگے بڑھا اور جنگل میں داخل ہوگیا۔ شکار کو گھیر گھار کر بادشاہ سلامت کے سامنے لا حاضر کرنے کے لیے جنگل کا محاصرہ کرلیا گیا۔ بادشاہ سلامت کے شایانِ شان مچان تیار کی ہی جارہی تھی کہ اُفق سے کالے بادل نمودار ہوئے جنھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بادل گرجے، بجلی چمکی اور موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش نے طول پکڑا تو اولے بھی پڑنے لگے۔ اسی اثناء میں شام ہوگئی اور شام بھی جنگل میں..... شاہی قافلہ تتر بتر ہوگیا۔ بادشاہ سلامت اپنے قافلے سے بچھڑ گئے۔ رات کی تاریکی میں بھٹکتے بھٹکتے بمشکل واپس اپنے محل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ وزیرصاحب کسی نہ کسی طرح بچتے بچاتے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن بادشاہ سلامت غصے سے آگ بگولہ ہو چکے تھے کہ وزیر کے غلط مشورے نے اُنھیں اس صورتِ حال سے دوچار کیا تھا۔ اُنھوں نے فوراً وزیر کو معزول کرتے ہوئے اسے حوالۂ زنداں کردیا۔

اب نئے وزیر کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ بادشاہ سلامت کسی افلاطون، کسی بزرجمہر، کسی برمکی جیسے پیکر عقل وخرد کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز کرنا ہی چاہتے تھے کہ معاً ان کے ذہن میں گزرے دن کے واقعات تازہ ہوگئے اور انہیں وہ گدھے والا کمھار یاد آیا جس نے موسم خراب ہونے کی پیشین گوئی کی تھی جو کہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ لہٰذا بادشاہ سلامت نے اس گدھے والے کو دُنیا کا عقلمند ترین انسان تسلیم کرتے ہوئے وزارت کا تاج اس کے سر سجانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے بادشاہ سلامت کے حکم سے اسے حوالۂ زنداں کیا گیا تھا، اب تازہ فرمانِ شاہی جاری ہوا کہ مسمّی کمھار عرف گدھے والا کو مع گدھے کے، لباسِ فاخرہ پہنا کر پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ شاہی دربار میں لایا جائے تاکہ اسے وزارت کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاسکے۔

کمھار اور اس کے گدھے کو شاہی پروٹوکول کے ساتھ دربار میں حاضر کیا گیا۔ بادشاہ سلامت نے کمھار کی قابلیت، عقلمندی اور بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے فرمان جاری کیا کہ اس نے بادشاہ سلامت کو درست مشورہ دیا تھا، لہٰذا اسے مملکت کے وزیر کے منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔ کمھار نے دست بستہ عرض کی ''حضور! اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اصل کمال میرے گدھے کا ہے۔ جب موسم خراب ہونے لگتا ہے تو اس کے کان ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ آج اس کے کان زیادہ ہی ڈھیلے ہو کر لٹک رہے تھے جنھیں دیکھتے ہوئے میں نے خرابی موسم کی پیشین گوئی کردی تھی۔'' کمھار کی عرضداشت پر بادشاہ سلامت نے حکم شاہی میں ترمیم کرتے ہوئے کمھار کے بجائے گدھے کو وزارت کے منصب پر فائز کردیا۔ اس کے بعد کے بارے میں راوی خاموش ہے.....

صاحبان.....! یہ محض ایک کہانی ہے۔ اگر آپ کو آج کی مخصوص صورتِ حال سے اس کی کوئی مماثلت نظر آئے تو اسے اپنے فہم کا قصور اور عقل کا فتور سمجھیں۔ اسی میں آپ کا بھی بھلا ہے اور.....

امریکی ادب

معجزہ

ایک گرم رات کا خون سرد کردینے والا ماجرا

ایک مہربان دُکاندار کو کچھ نامہربان گاہکوں سے واسطہ آن پڑا تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ مہربانی کیا ہوتی ہے

ترجمہ: ڈاکٹر حافظ محمود ترمذی

یہ جولائی ۱۹۸۸ء کی ایک گرم رات کا واقعہ ہے۔ ۸ بجے کا عمل تھا ٹرائے سیلی (Troy Sallee) نے اپنی ویڈیو کی دکان کو تالا لگا دیا کیونکہ ہیڈفورڈ انڈیانا کا شاپنگ سینٹر تقریباً بند ہو چکا تھا۔ چند دکانیں چھوڑ کر صرف ایک میڈیکل سٹور ہی اس وقت کھلا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ اس شام سیلز مین بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں آسکا تھا لہٰذا سیلی شام کی شفٹ میں خود ہی آگیا تھا۔ اس نے کسی دوسرے ملازم کو بلانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ دکان کو تالا لگا کر وہ اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا کہ ایک سلور سیڈان اس کے پاس آکر رکی جس میں ۴ آدمی سوار تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے مخاطب کیا ''ہم ایک ویڈیو فلم کرائے پر لینا چاہتے ہیں؟'' ۲۷ سالہ سیلی نے کچھ دیر سوچا کیونکہ وہ دیر سے آنے والے گاہکوں کو کبھی خالی نہیں لوٹاتا تھا اسی لیے وہ ویڈیو کا ایک کامیاب تاجر تھا اور شہر میں اس کے ایسے ۳ ویڈیو سٹور تھے۔

سیلی نے ان کی خاطر دوبارہ دکان کھولی اور پھر آرام سے ان کے انتخاب کا انتظار کرنے لگا جبکہ ایک شخص فلموں کے ٹائٹل دیکھنے لگا۔ ۵ منٹ بعد اس کے دوسرے ۲ ساتھی بھی سٹور میں آگئے اور اسے ایک شوکیس کے پاس بلایا جہاں وہ کھڑے تھے۔ پھر ان میں سے ایک بولا ''ہم دراصل گاہک نہیں ڈاکو ہیں اگر آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے تو ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے بصورتِ دیگر ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

سیلی کے پاس تعاون کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس

نے اپنی تمام دن کی آمدنی سے بھرا کیش بکس ان کی طرف بڑھا دیا اور دل میں سوچا اگر اسی پر چھوٹ جاؤں تو بھی غنیمت ہے۔ تینوں نے اس کی رقم بھی لے لی اور سٹور کی چابیاں بھی۔ ان میں سے ایک نے سٹور کا دروازہ اندر سے بند کردیا اور باقی ۲ نے اُسے سٹور کے عقبی حصے کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اس نے بے چون و چرا ان کے حکم کی تعمیل کی۔ وہاں انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اور اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی۔ اس کی دونوں ٹانگوں کو بھی رومال سے باندھ کر اسے بالکل بے دست و پا کردیا۔ ان کی دھمکی کے پیشِ نظر وہ ان کی ہر بات ایک مداری کے معمول کی طرح مانتا رہا یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک نے اسے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکانے کو کہا تو اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اچانک اس نے اپنے گلے پر ایک تیز دھار آلے کا دباؤ محسوس کیا۔ وہ سمجھا یہ اسے مزید خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب اسے اپنے سینے پر گرم گرم خون کی دھار بہتی محسوس ہوئی تو اسے خطرے کا احساس ہوا اور اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کو رومالوں کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے زور لگانا شروع کردیا۔ اسی زور آزمائی میں اس کے ہاتھ کھل گئے اور اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے چاقو کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اسی کشمکش میں اس کی ۳/انگلیاں چاقو کی تیز دھار سے زخمی ہوگئیں۔ ایک تو تقریباً کٹ ہی گئی۔ اسی اثناء میں اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھل گئی۔ اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر ڈاکو اور غضب ناک ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے گالیاں بکتے ہوئے سیلی کے سر پر وار کیا اور اسے فرش پر گرا دیا۔ دوسرے نے اس کے چہرے پر گھٹڑوں کی بارش کردی۔ سیلی نے اٹھنے کی کوشش کی تو چاقو بردار نے چاقو سے پے درپے اس کے سینے اور پشت پر کئی کاری وار کیے۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے سیلی نے کافی کمزوری محسوس کی۔ پھر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے مزاحمت ترک کردی کہ شاید حملہ آور اُسے مردہ سمجھ کر چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ ڈاکوؤں نے اسے بے حس و حرکت پا کر چھوڑ دیا کہ کسی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مرجائے گا۔ جاتے جاتے وہ اس کا وی سی آر (VCR) لے کر عقبی دروازے سے گلی میں نکل گئے۔

تھوڑی دیر تک تو سیلی اس ڈر سے بے حس و حرکت پڑا رہا کہ کہیں ڈاکو اپنا کوئی ساتھی یہ دیکھنے کے لیے نہ چھوڑ گئے ہوں کہ وہ واقعی مرگیا ہے یا نہیں لیکن پھر اس نے سوچا کہ اگر اس نے مدد کے حصول میں دیر کی تو وہ واقعی نہ مر جائے کیونکہ وہ شدید زخمی تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے پچھلے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی جو خود بخود تالا بند ہوگیا تھا۔ وہ بڑی کوشش سے اسے کھولنے میں کامیاب ہوگیا لیکن پچھلی گلی سنسان پڑی تھی۔ ڈاکو بھاگ گئے تھے۔ پھر اسے خیال آیا کہ پچھلی گلی میں شاید کوئی اس کی مدد کو نہ آئے۔ اب اسے دکان کے اگلے دروازے سے ہی مدد ملنے کی امید تھی جو ۶۰/فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے زخموں کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے زخم گہرے ہیں اور ان سے بہت تیزی سے خون بہہ رہا ہے۔ اسے یہ سوچ کر کچھ نقاہت سی بھی محسوس ہونے لگی اور ہمت بھی جواب دینے لگی کہ دور دور تک کوئی اس کی فوری مدد کو بھی موجود نہ تھا۔ اسے یہ سوچ کر جھرجھری سی آگئی کہ اس کے والدین اسے اس جان کنی کی حالت میں دیکھیں، تو اُن کا کیا حال ہو؟

پھر اس پر طاری نقاہت میں اچانک کمی آگئی اور اسے اپنے اندر کوئی غیر معمولی غیبی طاقت سی محسوس ہوئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا ہے۔ شدید زخمی حالت میں یوں ایک دم اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی معجزہ ہونے والا ہے۔ پھر اسے لگا کوئی اس کے کان میں سرگوشی کر رہا ہے ''ایک وقت میں ایک قدم۔ سیلی! ایک ایک قدم اٹھا کر چلو، تم ایسا کر سکتے ہو۔'' پہلے پہل اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ الفاظ اس کے لاشعور میں گونج رہے ہوں لیکن رفتہ رفتہ اسی آواز نے ایسے غیر محسوس طور پر حوصلہ دیا جس طرح بچپن میں اس کا والد اسے گڈولنے کی مدد سے چلنا سکھاتے ہوئے کہتا تھا شاباش سیلی! تم یہ کر سکتے ہو، تم چل سکتے ہو اور اس نے واقعی ایسا کیا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم چل کر اپنے کاؤنٹر تک آیا۔ ۴۵/فٹ کا یہ فاصلہ خون کی لکیر چھوڑتے ہوئے اس نے طے کیا۔ سٹور کی روشنیاں جل رہی تھیں لیکن ان روشنیوں میں اس کا چہرہ پیلا زرد لگ رہا تھا۔ پھر اس نے عجیب سی طاقت اپنے اندر محسوس کی جس کی مدد سے وہ کاؤنٹر تک آگیا تھا۔ اب اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس کی مدد سے وہ تالا بند فرنٹ دروازے کو توڑ سکے۔ پھر اس کی نظر خالی کیش بکس پر پڑ گئی، اس نے کچھ قوت مجتمع کر کے اسے اٹھایا اور شیشے پر دے مارا۔ لیکن زور سے نہ لگنے کی وجہ سے شیشہ ٹوٹا نہیں صرف اس میں دڑاریں پڑ گئیں۔ سیلی نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اسے ٹیلی فون کا خیال آیا۔ بڑی دقت سے رینگتے ہوئے وہ ٹیلی فون تک پہنچا پھر تار کو زور سے اپنی طرف کھینچا تو ٹیلی فون میز سے گر کر اس کے پاؤں میں آگرا۔ پھر اس نے زخمی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایمرجنسی پولیس کا نمبر ۹۱۱/ڈائل کرنے کی کوشش کی۔ ۲/مرتبہ غلط نمبر ملتا رہا، بالآخر وہ ۹۱۱/ملانے میں کامیاب ہوگیا اور فوری مدد کی درخواست کی۔

چند لمحوں بعد اسے سٹور کے باہر ایمرجنسی پولیس کی گاڑیوں کی بریکوں کی آوازیں آئیں۔ پھر جب پولیس نے شیشوں سے جھانک کر سیلی کی حالتِ زار دیکھی اور دروازہ اندر سے بند پایا تو میجر کین بیل کو احساس ہوگیا کہ اگر جلد ہی دروازے کے شیشے نہ توڑے گئے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میجر کین بیل بڑی سرعت سے اپنی گاڑی میں بیٹھا، اسے تھوڑا پیچھے لے گیا اور پھر شیشوں میں ٹکر ماری۔ پیرامیڈیکل سٹاف نے جلدی سے سیلی کو سٹریچر پر ڈالا اور ایمبولینس میں ڈال کر بیڈفورڈ کے میڈیکل سنٹر کے ناگہانی حادثات کے کمرے میں پہنچا دیا۔ راستے میں سیلی نے واردات کی پوری تفصیل پولیس کو سنائی اور اس نے کہا کہ چوتھا آدمی کار میں ہی موجود رہا۔ کار کا رنگ تک بتایا۔ اسی اثنا میں سیلی پر صرف ان چند لمحوں کے لیے غشی طاری ہوئی جب اسے ایمرجنسی روم سے آپریشن تھیٹر لے جا رہے تھے۔

سرجنوں نے تمام رات سرتوڑ کوشش کی اور اس کے جسم پر لگے ۲۵/سے زیادہ زخموں کو ٹانکے لگاتے اور حیران ہوتے رہے۔ ایک زخم تو بالکل دل کے قریب لگا تھا۔ وہ سب حیران تھے کہ سیلی اتنے خطرناک وار سہ کر بھی زندہ کیسے بچ گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششیں اور سیلی کے غم سے نڈھال والدین اور بہن کی دعائیں رنگ لائیں اور اس کے مہلک زخم مندمل ہوگئے۔ اگرچہ ان کے نشان اس کے جسم پر باقی رہ گئے ہیں۔

سیلی کے اپنے حواس قائم رکھنے اور واقعہ کی ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرنے کے باعث مستعد پولیس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر ویڈیو سنٹر سے ۲۵/میل کے فاصلے پر مجرموں کو جا لیا۔ اب چاروں مجرم جیل کی کال کوٹھری میں سزا بھگت رہے ہیں۔ مائیکل جی ریگلر کو جس نے چاقو کے مہلک وار کیے، عدالت نے مجموعی طور پر ۱۲۰/سال قید بامشقت، پال آرملر سینئر جس نے سیلی کے جبڑوں کو ٹھڈوں سے ضربیں لگائیں ۹۰/سال قید، کرسٹوفر سی مُلر بندوق بردار کو ۴۰/سال، پال آرملر جونیئر جو کار چلا رہا تھا کو ۱۵/سال قید کی سزا سنائی گئی۔

امریکن پولیس کی اِس قابلِ رشک کارکردگی سے کاش ہماری پولیس بھی کوئی سبق سیکھے جو صرف ''مٹھیاں'' اور ''عیدیاں'' وصول کرنے اور خالی کارروائیاں ڈالنے کے لیے بدنامی کی حد تک عادی ہے۔

وہ لمحات جبکہ حملہ آور ڈاکو سیلی کو مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے، سیلی کے لیے بھی حیرت کا باعث ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے صرف سُنا اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ کبھی کبھی معجزے بھی ہوتے ہیں۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ معجزے واقعی ہوتے ہیں۔ میرا زندہ بچ جانا واقعی ایک معجزہ ہی تو تھا۔

المناک واقعہ

جذبات کے منہ زور گھوڑے پر سوار ایک ناراض بیٹے کی ماں کے آنسو جو لفظوں میں ڈھل گئے

تمھیں کیسے کہوں کہ جیتے رہو

خوف زدہ کرنے والی یادوں کو بھلانا شاید ممکن بھی ہو جاتا مگر بیٹے کے خالی کمرے کے پہرے کا کوئی کیا کرے جس میں نہ یہاں کی خوشی آباد ہے نہ وہاں کی آسودگی

ثریا خانم

مسافر کے نام......

میرے پیارے بچے سعدی!

ڈھیروں دعائیں

تمھیں یہ کیسے کہوں کہ جیتے رہو۔ تم تو جی چکے۔ آج میں تم سے وہ ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں جسے سننے کے لیے تمھیں عدم سے لوٹنا ہوگا۔ میرے لختِ جگر! جانتے ہو کس طرح میں نے لخت لخت اکٹھا کر کے تمھیں وجود دیا؟ تم نے کیا کیا؟ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں بھی نہیں سوچا کہ یہ لہو جو تم اتنا بے وقعت سمجھ کر بہا رہے ہو اس میں میری کتنی ریاضتیں ہیں۔ میری کتنی بے خواب راتیں بسی ہوئی تھیں۔ میرے بچے! تم نے سوچا کہ اب کون گیٹ کے باہر کھڑے ہو کر کہے گا اماں! آپ کا لفتِ جگر آ گیا۔ میں کسے کہوں گی نالائق لفتِ جگر نہیں لختِ جگر ہوتا ہے۔ اب کون کہے گا اماں جی! آپ کا ایم اے اردو ہمیں جینے نہیں دیتا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اُس ہر چیز سے کنارہ کر لیتی جو تمھیں جینے نہیں دے رہی تھی۔ میرے چاند آج میں تمھاری وہ غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں جس نے تمھیں ہمیشہ بدگمان رکھا۔ تم نے ہمیشہ یہ سوچا کہ تمھارا رنگ گندمی ہے اس لیے شاید تمھیں کوئی پسند نہیں کرتا۔ تم نے ہمیشہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے میرے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھا۔ اپنا کندھا میرے کندھے سے اوپر دیکھ کر فاتحانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھا لیکن اندر ہی اندر بھائی بہن کا گورا رنگ، لمبے قد تمھیں کُچلتے رہے۔ پھر وہ لمحہ اذیت دیتا ہے جب کوئی مہمان آتا اور تمھارے ننھّے دل کا خیال کیے بغیر پوچھتا آپ کا یہ بچہ کس پر ہے؟ اُس وقت جو رنگ تمھارے چہرے پر لہرا جاتا وہ میں دیکھ سکتی تھی۔ تمھاری ماں تھی نا میرا گمان تھا کہ پڑھائی میں کمزور جسمانی طور پر کمزور یہ بچہ میرے کام آئے گا۔ بڑی بے فکر تھی میں کہ سب چلے جائیں گے تم میرے پاس رہو گے۔ شاید میری یہ خودغرضی تم نے بھانپ لی یا پھر میرے وہ احسانات جو میں تم پر کرتی رہتی تھی ان کے بوجھ تلے دب کر تم جی نہ سکے۔ تمھیں یاد ہے! جب میں یہ کہتی تھی بیٹا پڑھ لو! کل کس کے در پر جاؤ گے کون تمھیں روٹی دے گا، بہن بھائی بھی دھتکار دیں گے۔ یہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو تم جیسی اولاد کو بھی سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ تمھارے کتنے بلّے میں نے توڑے کہ شاید تم کھیل چھوڑ کر پڑھنے لگو مگر تم تو ہر مرتبہ اِک نئی امنگ سے کھیلنے جاتے۔ میری جان میں جان نہ سکی جس پرندے کو میں پنجرے میں بند کرنا چاہتی ہوں وہ تو ایک روز یوں اُڑے گا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ صبح سویرے نماز کے بعد میں باہر کا گیٹ دیکھتی کہ تم میچ کھیلنے تو نہیں نکل گئے۔ جون، جولائی کی تپتی دوپہروں میں کئی بار تمھیں دیکھنے تمھارے کمرے میں آئی کہ تم باہر تو نہیں۔ رات گئے آنکھ کھلتی تو تمھارے موبائل پر بیل مار کر دیکھتی کہ جاگ رہے ہو یا سو چکے۔ میں نے تمھارا جینا حرام کر رکھا تھا پھر کیا تم اسے میری نفرت سمجھتے تھے۔ کاش بیٹا! تمھیں ماں کا دل پڑھنا آتا۔

آج میں تمھیں وہ سب اندیشے بتاؤں جو مجھے پریشان کیے رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے تم نڈر اور لڑاکے تھے۔ تمھیں دیر ہو جاتی اور میں خیال کی آنکھوں سے دیکھ لیتی کہ تمھاری لڑائی ہو گئی ہے اور تمھیں کسی نے مار کر پھینک دیا ہے۔ سچ مانو دل تڑپ جاتا تھا۔ یہ تمھاری سب سے بُری عادت تھی کہ موبائل بند کر کے رکھتے تھے۔ یہ بات مجھے مزید اندیشوں میں مبتلا کر دیتی۔ تم بے خبری میں کھیلتے رہتے اور میں لمحہ لمحہ مرتی رہتی۔ تم گھر لوٹتے میں تمھیں بہت ڈانٹتی مگر اندر سے شکر ادا کرتی۔ آؤ آج میں تمھیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ تمھارے جانے سے ایک ماہ پہلے ہر نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے ایک عجیب سا جملہ میرے لبوں سے نکلتا ”اے اللہ میں تیری رضا میں راضی ہوں۔“ مجھ جیسی جاہل مطلق ماں کو یہ علم نہیں تھا کہ اُس کی رضا کیا ہے؟ کیا مجھ جیسی کمزور عورت اُس کی رضا پر پورا اُتر سکتی ہے؟ کیا میں اتنی اعلیٰ ظرف تھی کہ اُس کی دی ہوئی نعمتوں میں سے کچھ اُسے لوٹا سکوں۔ مگر دیکھو نا میں تو بے وقوف تھی ہی وہ تو قادرِ مطلق تھا اُس نے کیوں میری اس بے خبری کی رضا کو سچ جانا اور یہ مان لیا کہ میں تمھیں کھو کر بھی راضی رہوں گی۔

ہاں بیٹا میں بہت ناراض ہوں اپنے آپ سے جسے یہ دعویٰ تھا کہ اللہ اُس کی کوئی بات رد نہیں کرتا سعدی! جمعے کی وہ رات میری راتوں کا عذاب بن گئی ہے جب تم خاموشی سے اوپر گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ یاد ہے اُس شام تم نے مجھے کہا تھا اماں جی! آپ کا بچہ مصوری کی دنیا میں دھوم مچا دے گا۔ میرے بچے آج تمھاری سکیچ بک، تمھارے بنائے ہوئے ہاتھ، تمھاری تمام

ڈرائنگ میرے سامنے ہیں، تمام رنگ سرخ پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف تمھارے لہو کا سرخ رنگ بکھرا ہوا ہے۔ آج مجھ سے لوگ پوچھ رہے ہیں آپ نے اُسے کیا کہا تھا؟ کیا اتنا ڈانٹا تھا کہ اُس نے یہ قدم اُٹھالیا؟

میری جان تمھیں مجھ سے محبّت نہیں تھی، نہ سہی مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم مجھے ایسا مجرم بنا کر دنیا کے سامنے کھڑا کر گئے ہو جسے اپنے جرم کا بھی پتا نہیں۔ کوئی فردِ جرم تو عائد کرتے پھر دیکھتے تمھاری یہ خوش فہم ماں کوئی صفائی پیش کیے بغیر ہی سزا لے لیتی۔ تم نے آزمایا تو ہوتا، تم نے تو کبھی مجھے یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ میری کون سی بات تمھیں اچھی لگتی ہے اور کون سی بہت بُری۔ پھر مجھے یہ کب اور کیسے پتا چلتا کہ تم بدگمانی کی اس حد تک پہنچ چکے ہوں جہاں زندگی جیسی نعمت بھی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ مجھے اس وقت بھی یاد ہے کہ رات کے ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا جب تم باہر سے آکر اپنے کمرے میں گئے ہو اور پھر نجانے کس منحوس گھڑی وہ ریوالور تمھارے ہاتھ لگ گیا جو سفر سے واپسی پر تمھارے ابو نے سامنے کپڑوں والی الماری میں رکھ دیا تھا۔ نجانے کیا سوچ کر تم نے یہ جان لیوا کھلونا اُٹھایا؟ نجانے کہاں فائر کیا اور پھر سارا منظر ہی بدل گیا۔ میری تو آنکھ تب کھلی جب تم اطمینان بھری اَبدی نیند سو چکے تھے۔ آج بھی فائر کی آواز کہیں میرے کان میں سنائی دیتی ہے تو دہل جاتی ہوں اور پھر میرے بچے دوسرا سانس لیے بغیر تم چل دیے۔ نہ دعا نہ سلام۔ ہمیشہ کی طرح خودغرضی دکھائی۔ اتنا لمبا سفر نہ گلے ملے، نہ پیشانی پر بوسہ دیا۔ نہ مجھ سے رختِ سفر باندھنے کی اجازت چاہی، نہ زادِ راہ مانگا۔ میرے سارے احسانات میری دہلیز پر رکھ کر چل دیے۔ میرے دودھ کا قرض، میری جاگتی راتوں کا قرض، میری محبّتوں کا قرض۔ سب کچھ ادا کیے بغیر چل دیے۔ میرے بچے باقی قرض تو دور کی بات ہے تم تو میرے آنسوؤں کا قرض بھی نہیں چکا سکتے جو تمھاری جدائی میں رات دن میری آنکھوں سے رواں رہتے ہیں۔ کیونکہ موت تمھیں یہ قرض چکانے کے لیے دنیا میں آنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اس عورت کو تسلّی کے دو بول کون کہے جواب اپنے گھر میں نہیں رہتی۔ بدروح کی طرح تمھارے کمرے کے باہر بھٹکتی رہتی ہے۔ اُس ماں کے بہتے آنسو کون پونچھے جسے آنسوؤں کی دُھند میں تمھارے دوسرے بہن بھائی دکھائی نہیں دیتے۔ کیا میں ہمیشہ سے سعدی کی ماں تھی۔ اُس سعدی کی جس نے کبھی اُسے ماں جانا ہی نہیں۔

سعدی......!

تم تو کچے جذبات کے گھوڑے پر سوار ایک بڑی نافرمانی کر کے چلے گئے۔ تیری ماں کیا کرے۔ تو یہاں میرے پاس ہوتا تو شاید سات خون بھی معاف کر دیتی مگر تم نے اب ماں کی نہیں رب کی حدود کو توڑ ڈالا۔ وہ جو مہربان ہے، وہ جو زندگیاں اور خوشیاں دیتا ہے۔ تم نے اسی کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ تمھیں کس نے حق دیا تھا اپنی جان لینے کا اور پھر عمر بھر اپنی ماں کو دکھ کا عذاب دینے کا۔ اس نافرمانی پر تو معافی بھی نہیں ملتی۔

ساری دنیا کی مائیں اپنی اولاد کے مرنے کے بعد بخشش کی دعائیں کرتی اور اطمینان پاتی ہیں۔ مجھے تو آخری سانس تک یہ اطمینان بھی نہیں مل پائے گا۔ کیا خبر رب کے حضور حاضری ہو تو سارا قصور میرا ہی نکل آئے جو نہ تم کو اپنے آپ پر اعتماد کرنا بتا سکی، نہ رشتوں سے محبّت سکھا سکی۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے اللہ اور رسولؐ کے احکام بھی نہ سمجھا سکی۔ تو زندہ تو رہتا، تیری ماں تجھے دن میں کتنی بار دعائیں دیتی، جیتے رہو۔

کل تیرے بچے ہوتے، تمھیں ان سے خوشی اور سکھ ملتے۔ کیا خبر ان کے رنگ ہی گورے ہوتے۔ مگر سعدی! تو نے لمحے بھر کو بھی نہیں سوچا جو گورے نہ ہوں وہ جیتے نہیں ہیں کیا؟ کاش تو زندہ ہوتا۔ کاش تو اتنی بڑی نادانی اور نافرمانی نہ کرتا۔

مگر کوئی مجھے بھی تو بتائے۔ میں کیا کروں۔ اپنے دل اور آنکھوں کو کہاں لے جاؤں۔ جب تک زندہ ہوں سعدی کے کمرے کا پہرہ دینا ہی میرا مقدر ہو گیا ہے کیا؟

بیتے دن

نامور مزاح نگار کا بیٹا میڈیکل نہیں کرنا چاہتا تھا
ٹرین کے آگے لیٹ کر زندگی بھر کے لیے دُکھی کر گیا

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا...

ڈاکٹر ندیم اکرام
راولپنڈی

کتابِ

زندگی کے اوراق پلٹے جائیں تو جوانی کے دن یاد آ ہی جاتے ہیں۔ میری جوانی کے وہ دن تحصیل علم اور حصولِ مہارت میں کے ای میں صرف ہوئے۔ اس دور کی اچھی بری یادیں سرمایہ جاں ہیں۔ ان یادوں میں امروز کی چاشنی، فردا کی فکر، فراق کا کرب، وصیال کی آرزو، نہ ہونے سے اٹھ کر بہت کچھ کر گزرنے کا عزم، تلخی ایام کے لیے خندہ استہزا سبھی کچھ ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

مادرِ علمی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور میں ہر وضع قطع اور مزاج سے واسطہ پڑا۔ ان میں اپنی رائے پر اَڑنے والے بھی تھے اور وہ بھی جو با آسانی ہر کسی کا مشورہ ماننے اور دھوکا کھانے پر مائل تھے۔ وہ بھی کہ جو دن کی اک اک بوند کو گراں سمجھتے اور وہ بھی جو بالکل فرصت سے زندہ تھے۔ حفاظ الکتب بھی اور وہ بھی جو کتاب میں درج ہر بات کی دلیل ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوئے جاتے تھے۔ یہیں کہیں، شاہراہِ عشق پر یک طرفہ دوڑ دوڑ کر ہلکان ہونے والے کئی فرہاد، مجنوں اور رانجھے بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ کتابی صلاحیت والے، شخصیت جتانے اور شیخی بگھارنے والے، ہنگامہ پرور، مقرر، فقرہ باز، محفل باز، شرارتی، بور بلکہ مہابور۔

متانت، لیاقت، محنت، شرارت، صلاحیت اور صالحیت کے مرقعے مادرِ علمی کی رونقوں کو دوبالا کر رہے تھے۔ وہاں گزرے ۵/سال صرف ۵/سال نہ تھے، کئی ۵/سالوں کا حاصل تھے۔ ڈگری ملی اور پھر دھیرے دھیرے نوکری، روزگار، بیوی بچوں کے ''میری گوراؤنڈ'' Marry go round میں اکثر شہروں اور ملکوں کی بھیڑ میں خلط ملط ہو گئے۔

ہائے وہ لوگ خوب صورت لوگ
جن کی دھن میں حیات گزری ہے

اس دور کی کچھ تلخ یادیں بھی ذہن میں چپک کر رہ گئی ہیں۔ ان میں سرِ فہرست روداد ہے ان کی جنھوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں جامِ زیست توڑ ڈالا۔

ایک طالبہ کا بے روح جسم کئی روز بعد ہوسٹل کی چھت پر پڑا ملا۔ ایک اور نے ٹرین کے سامنے لیٹ جانا اور اپنے گھر والوں کو زندگی بھر کے لیے دُکھی کرنا پسند کیا۔ یہ دونوں اپنی پسند کے علی الرغم، صرف والدین کی خواہش پر، میڈیکل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ثانی الذکر خلیل الرحمٰن اس نامور مزاح نگار جرنیل کا لختِ جگر تھا جس نے پڑھنے والوں کے لبوں کو مسکراہٹوں کا تحفہ دیا۔ افسوس وہ اپنے ہی گھر کے ایک فرد کو مسکراہٹیں عنایت کرنے میں ناکام ہو گئے۔

ان دنوں فائنل پروفیشنل کی اذیت بے انتہا تھی۔ وارڈ ٹریننگ، تین چار مہینے کی تیاری، دو اڑھائی مہینے جاری رہنے والا امتحان اور اس کے بعد ۲۰/ سے ۳۰/ فیصد کامیابی کا

سناسب۔ ان دھلے منہ، ان دھلے کپڑے دنیا و مافیہا سے بے نیاز و بے پروا نیم باگل، نیم جنونی تو ہر طرف نظر آتے تھے مگر انہی میں سے ایک ظالم نے ہمت چھوڑ دی۔ اس سب کچھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے ایک ساتھی نے اپنے آپ کو ایک نہر کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے گم کرلیا۔ ہمارے ناظم ہوتے تھے بابر امین۔ میں ان کے پاس بیٹھا تھا جب سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والا ایک لڑکا مبارک آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ ناظم صاحب نے اسے چند روز کے لیے گھر جانے کا مشورہ دیا تاکہ آرام کرلے اور اس کے ذہن پر آیا بوجھ کم ہوجائے۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ گھر جاتے ہوئے اپنی پریشانی پر قابو نہ پاسکا اور عمر بھر کا عذاب مول لے لیا۔ اس نے نہر میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ انس معین جو ڈاکٹر وزیر آغا کا بھانجا اور بڑا اچھا شاعر بھی۔ اس نے بھی کراچی کے سمندر میں کود کر خودکشی کرلی تھی۔ اس کا شعر مجھے یاد ہے:

نہ تھی جہان میں وسعت مری نظر جیسی
بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

☆☆

ان دِنوں مریض ابھی اشرف المخلوقات ہی تھا، کوئی کموڈٹی (Commodity) نہیں بنا تھا۔ ابھی پنج ستارہ ہوٹلوں کی کشش نے حملہ نہیں کیا تھا۔ ابھی کاٹا اور لے دوڑی کا زمانہ شروع نہیں ہوتا۔ یہ بات منکشف نہیں ہوئی تھی کہ تجربے اور مشاہدے کی بڑھوتی کے لیے ''شاہی مہمان'' بن کر بیرون ملک دورے ناگزیر ہیں۔ عظیم تر طبی مفاد کے نام پر ھل من مزید کا نعرہ نہیں لگا تھا۔ دنیا کی دوسری بڑی صنعت کے عفریت نے اپنا دامِ ہزار رنگ ابھی پوری طرح نہیں پھیلایا تھا۔ ابھی پاپولر ہونے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ تصویر اور تشہیر کا آزار جان کا روگ نہیں بنا تھا۔ ''مقبول ہونے کے طریقے'' اور ''نگاہوں میں رہنے کے حیلے'' جیسے کتابچے ابھی مارکیٹ میں نظر نہیں آئے تھے۔

سمجھا جاتا کہ جو استاد سختی کرتا ہے وہی اچھا ہے جیسا کہ سیانا ڈینٹسٹ وہی ہے جو خراب دانت نکالتے وقت مریض کی ''آہ'' سے نہیں گھبراتا۔ ابھی گرمیوں میں بھی کوٹ اور ٹائی کا رواج نہیں پڑا تھا۔ ہسپتال کے اوپر والی منزل میں، سخت گرمی میں بغیر اے سی کے کمرے میں، بنیان کے اوپر اوورال پہن کر جب کوئی پروفیسر طبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا درس دیتا تھا تو یقین جانیے اس میں پیغمبرانہ شان دکھائی دیتی تھی۔ یہ وہ تھے جو پرانی روایات کے امین اور نئی بنتی ابھرتی روایات کے پہریدار تھے۔ یہ وہ تھے جو خالق کائنات کے حقیقی حسن کی شمع روشن کیے زندگی کے پل صراط پر ہنستے مسکراتے محوِ سفر تھے۔ کسی ایک کا کیا ذکر کہ یہ تو چراغوں کی لو، سایہ دار اشجار کی قطار، علم کی بہار، تجربات کا نکھار اور پروفیشن کا وقار تھے۔ وہ کمیٹیڈ، اصول پسند اور تعلیم و تربیت میں یکتا لوگ اب بھی کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں نگاہوں کے سامنے سے قطار باندھے گزر جاتے ہیں تو ایک عجیب سی سرخوشی طاری ہوجاتی ہے۔

مجھے کے ای کے تینوں ہوسٹلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ بروم، ہال روڈ، نیو ہاسٹل۔ کیا زمانہ تھا کیا لوگ تھے۔

ڈاکٹر یونس بٹ آج ملک کے معروف و مقبول مزاح نگار اور ڈراما نگار ہیں۔ ایک سال جونیئر تھے۔ فورتھ ائیر میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب لکھ ڈالی۔ ''چاہ خنداں'' نام تھا۔ اس کی تقریبِ رونمائی میں بڑے بڑے لوگ آئے۔ حسنِ اتفاق سے تقریب کی میزبانی اور نظامت کی ذمے داری اور خوشی میرے ہاتھ آئی۔

ہوسٹل میں شام کو سب لوگوں اپنی اپنی مصروفیات ہوتی تھیں۔ اکثر گپیں مار کر، گھوم پھر کر وقت گزارتے۔ ہم مرکز جمعیت عصر سے عشاء جاتے۔ میرے ذمے فارن افیئر تھے۔ راشد نسیم صاحب کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ پاکستان جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اللہ جانے انھوں نے مجھ میں کیا خوبی دیکھی کہ فارن افیئر کا سیکریٹری بنا دیا۔ ایک سال تک اچھرہ جا کر اپنی ذمے داری نبھاتا رہا۔ وہاں بہت قیمتی اور محنتی لوگ تھے۔ سارے ہی طالب علم اور اپنے اپنے کام میں ماہر اور لگن سے کام کرنے والے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں گے، ہاں مگر ایسے بھی تھے

جاپانی اہلِ وفا

پاکستان سے محبت کرنے والے ۲؍ جاپانی

جن میں پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے

سید احسان اللہ وقاص

ٹوکیو میں سونامی کے متاثرین کی امداد کو پہنچنے والے تازہ پاکستانی نان اور چکن کری نے اہل جاپان کے دل جیت لیے

گزشتہ دنوں ایک وفد کے ہمراہ ٹوکیو جاپان جانے کا موقع ملا۔ جاپان اپنی معاشی اور تکنیکی ترقی کی جس معراج کو چھو رہا ہے۔ اُس کی بڑی وجہ جاپانی قوم کی بے حد لگن، محنت، دیانت داری اور بے پناہ حب الوطنی ہے۔ اُنھیں اپنے وطن سے ٹوٹ کر پیار ہے اور اس حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اَزحد دیانت و محنت کے ساتھ ہر وقت اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔

ٹوکیو میں ایک جگہ ہم ہسپتال کیلئے بیڈز دیکھنے گئے تو ایک جاپانی میزبان خاتون نے مجھے شلوار قمیص میں ملبوس دیکھ کر پوچھا ''کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟'' میرے ہاں میں جواب پر اس نے مجھے کہا کہ پاکستانی اگرچہ غریب ہیں۔ ان کے پاس وسائل کم ہیں، وہ خراب کارکردگی والی حکومتوں کا شکار ہیں لیکن اس کے باوجود بہت عظیم لوگ ہیں۔ بیرونِ ملک ایک مدت کے بعد ایک غیر ملکی سے پاکستان کی تعریف سن کر ازحد خوشی ہوئی تو میں نے اس سے پاکستان کی تعریف کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ سونامی کے موقع پر ہماری حکومت نے سونامی کے متاثرین کیلئے کسی قسم کی بیرونی امداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ پاکستانی یہاں پہنچ گئے اور انہوں نے جاپان میں مقیم پاکستانیوں کی مدد سے سونامی متاثرین کے کیمپس میں جا کر پاکستانی نان اور چکن کری تقسیم کی۔ اس سے ہمارے لوگوں کو ان کی روزانہ کی روٹین سے نہ صرف مختلف قسم کا تازہ کھانا نصیب ہوا بلکہ اس سے وہ پاکستانی کھانوں اور اس کی لذت سے آشنا ہوئے اور اُنھوں نے پاکستانی کھانے کو ازحد پسند کیا۔ اس خاتون نے بتایا کہ سونامی متاثرین کی پاکستانیوں کی طرف سے خدمت کی تفصیل میڈیا میں شائع ہوئی اور تمام ٹی وی چینلز نے بھی اسے مناسب جگہ دی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ پاکستان سے جو وفد آکر یہ خدمت کرتا رہا۔ وہ الخدمت فاؤنڈیشن کا وفد تھا اور اس ادارے کے ساتھ ہی راقم کا تعلق ہے تو اس پر وہ مزید سراپا شکر گزار ہوگئیں۔

وہاں ۲؍ ایسے جاپانی افراد سے ملنے کا موقع ملا جن میں پاکستان سے محبّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان سے ان کی اس محبّت کا عام پاکستانیوں کو علم ہے اور نہ ہی حکومت نے کبھی ان کی اس محبّت کی قدر اور نہ ان کی عزت افزائی کی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں افراد پاکستان سے محبّت، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کاوا موتو

(وہ اپنے طلبہ کا وفد لے کر ہر سال پاکستان آتے ہیں)

ٹوکیو کے نواح میں واقع SAINTIYAMA یونیورسٹی کے شعبہ خصوصی تعلیم جو ذہنی معذور اور خصوصی افراد کی تعلیم کیلئے بہت ہی اعلیٰ معیار کی تعلیم مہیا کرنے کا ادارہ، کے سربراہ اور ڈین پروفیسر ڈاکٹر کاوا موتو ہیں۔

ہر سال ان کی یونیورسٹی کی طرف سے طلبہ اور اساتذہ کو کسی بیرونی ملک جا کر وہاں کے ذہنی معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے معیار کا جائزہ لینے کیلئے فنڈز (Matching Grant) مہیا کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر کاوا موتو اس کے باوجود کہ وہ دنیا کے کسی بھی ملک جا سکتے ہیں۔ اپنے ۱۰/ سے ۱۵/ افراد پر مشتمل طلبہ وطالبات کا وفد لے کر تقریباً ہر سال پاکستان آتے ہیں۔ پاکستان کے سخت گرم موسم جو عام جاپانی کیلئے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور پاکستان کے غیر محفوظ ہونے اور دہشت گردی کے واقعات کی میڈیا میں بڑے پیمانے پر تشہیر کے باوجود وہ ہر سال صرف اور صرف پاکستان آتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ مجھے پاکستان اور پاکستانیوں سے محبّت ہے۔ ان کے خیال میں پاکستانی بڑے باصلاحیت لوگ ہیں۔ یہاں اگر اچھی ساکھ کے حکمران آجائیں تو پاکستان کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اپنے شعبہ کے طلبہ وطالبات کے والدین سے پاکستان جانے کی اجازت حاصل کرنا اُن کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اور والدین آسانی سے اجازت دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ میرے عزم اور میری یقین دہانی پر تقریباً ہر سال ایک وفد تیار ہو جاتا ہے۔ پاکستان آ کر وہ مختلف خصوصی تعلیم کی یونیورسٹی کی سطح کے اداروں میں طلبہ کو وزٹ کرواتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذہنی افراد کا علاج کرنے والے ادارہ خصوصاً فونٹین ہاؤس لاہور اور الخدمت فاؤنڈیشن کے یتیم بچوں کے ادارے ''آغوش'' ضرور جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک طالبہ کو ۶/ ماہ کے لیے پاکستان آ کر فاونٹین ہاؤس لاہور میں ذہنی مریضوں کی تکملی خدمت کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔ پروفیسر کاوا موتو ہر سال ہمارے ساتھ مل کر معاشی لحاظ سے پسماندہ علاقوں مثلاً لاہور میں کوٹ لکھپت میں مختلف اداروں میں جا کر یتیموں اور ذہنی معذور بچوں کی خدمت کرتے اور دیگر غریب مگر ذہنی طور پر صحت مند بچوں میں تحائف بھی تقسیم کرتے ہیں۔ ہم پروفیسر کاوا موتو کو ملنے جب ٹوکیو کے نواح میں واقع عظیم الشان یونیورسٹی پہنچے تو ان کے طلبہ و طالبات اور خود اُنھوں نے نہایت محبّت سے ہمارا پُر جوش استقبال کیا۔ پروفیسر کاوا موتو سے ہمیں متعارف کروانے میں اہم کردار چند سال قبل اسلام آباد میں مقیم جناب فیصل شاہ صاحب جو جاپان کے ساتھ تجارتی روابط رکھنے والے ایک ادارے کے سربراہ ہونے کے ساتھ پاکستان کی محبّت سے سرشار نوجوان ہیں، نے ادا کیا ہے۔ پروفیسر کاوا موتو کا انگ انگ پاکستان کے ساتھ محبّت سے سرشار ہے۔ وہ کہتے ہیں پاکستان دہشت گردی کا شکار اور غیر محفوظ ملک ہونے کے بین الاقوامی پراپیگنڈہ کا شکار ہے۔ اس کے باوجود پاکستان کے ساتھ محبّت اور میرے تعلق میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ اس سال بھی وہ مارچ میں پاکستان تشریف لائے اور سیلاب سے متاثرہ اکثر مقامات کا الخدمت فاؤنڈیشن کے عہدے داران کے ساتھ دورہ کیا اور ہر مقام پر اپنی طرف سے متاثرین میں تحائف تقسیم کیے۔ تحائف کا تقسیم کرنا جاپانی قوم کے مزاج میں بسا ہے۔ کبھی کوئی کسی کے ہاں مہمان ہو یا کسی کو ملنے جائے تو خلوصِ دل سے تحائف ضرور دیے جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی تحائف دینے کو باہمی محبّت کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا تھا۔

نیشی مورا

(ٹوکیو سے کچرا کنڈی کراچی تک)

جاپان میں پاکستان سے محبّت کرنے والوں میں ایک اور عظیم جاپانی سوشل ورکر اور JASF نامی خدمت خلق کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل جناب نیشی مورا بھی شامل ہیں۔

ان کے ساتھ ایک بڑی ٹیم پاکستان کے عوام کی محبّت سے سرشار ہے۔ ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی جو ان کے تکملی کام کی وجہ سے بہت متاثر کن رہی۔ محترم نیشی مورا ٹوکیو میں ایک جھونپڑی نما گھر میں مقیم ہیں۔ پورے جاپان سے استعمال شدہ پرانے کپڑے اور دیگر سامان جمع کرتے ہیں۔ اس سامان میں سے کچھ منتخب سامان اور کپڑے جو پاکستان میں قابل استعمال نہیں ہوتے، اُنھیں وہاں ڈرائی کلین کر کے خوبصورت پیکنگ میں اپنے شوروم میں فروخت کر کے اس سے اپنے دفتر وشوروم کا کرایہ اور دیگر اخراجات پورے کرتے ہیں۔ اس کے بعد تمام کپڑے ڈرائی کلین کر کے ان کے بنڈل بنائے جاتے ہیں، جنھیں کنٹینرز کے ذریعے پاکستان لایا جاتا ہے۔ جناب نیشی مورا خود سامان کے ساتھ آ کر فروخت کرتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے انھوں نے کراچی میں کچرے کے ڈھیر پر واقع ''کچرا کنڈی'' نامی علاقے (جس میں رہنے والے تمام لوگ کراچی کے شہریوں کے پھینکے ہوئے کچرے کے ڈھیروں سے مختلف اشیاء جمع کر کے فروخت کرتے ہیں) ان کے بچوں کے لیے اسی جگہ پر ایک سکول قائم کیا ہے۔ اس سکول میں اس وقت ۲۵۰۰/ سے زائد طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان تمام طلبہ وطالبات کا تعلق کچرا جمع کرنے والے خاندانوں سے ہے۔ اس سکول میں نہ صرف مفت تعلیم مہیا کی جاتی بلکہ تمام طلبہ وطالبات کو مفت یونیفارم، بغیر ناشتا کیے گھر سے آنے والے طلبہ کو ناشتا اور ضرورت مندوں کو دوپہر کا کھانا بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ طلبہ وطالبات کے علاج کے لیے ڈسپنسری بھی قائم ہے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اس سکول سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات میں بہت سے طلبہ وطالبات ڈاکٹرز اور انجینئرز بن چکے ہیں۔

ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ اگر میں یہ سکول نہ بناتا تو ان طلبہ وطالبات میں سے بیشتر افراد ٹارگٹ کلرز اور بے راہ روی کا شکار ہو چکے ہوتے۔ اُنھوں نے بہت افسوس سے کہا کہ پاکستان کے سرکاری محکمے وبالِ جان اور بہت تنگ کرتے اور ہر کام میں پیسے مانگتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا جب وہ سکول جاتے اور طلبہ وطالبات سے ملتے ہیں تو ان کے روشن اور جگمگاتے چہرے دیکھ کر کام کی ساری تھکن دور ہو جاتی اور وہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے اس پسے ہوئے طبقے کی انتہائی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ خدمت کرنے والے جاپانی نیشی مورا کہتے ہیں کہ جاپان امن اور انصاف کا علم بردار ملک ہے اور اس پسے ہوئے طبقے کی خدمت جاپانی حب الوطنی کا تقاضا ہے کیونکہ ہر طبقے کی خدمت کر کے وہ دُنیا میں امن وانصاف کے فروغ کے جاپانی مشن میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اُنھیں یقین ہے کہ جس دن اس ملک میں دیانت دار قیادت محبّ وطن حکمران پُر خلوص انتظامیہ میسر آ گئی پاکستان بہت تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتا ہوا دنیا میں اپنا مقام بنائے گا۔

میری حکومتِ پاکستان اور پاکستان کے دیگر تمام محبّ وطن لوگوں سے درخواست ہے کہ پاکستان سے اس طرح ٹوٹ کر محبّت کرنے والے ان عظیم جاپانی قوم کے فرزندوں کی عزت افزائی اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ سعودی عرب اور ترکی کے علاوہ یہ واحد ملک ہے کہ جس کے عوام میں بھی بڑی تعداد میں ایسے افراد موجود ہیں جو ہم سے محبّت کرتے ہیں۔ سیلاب، زلزلہ اور قدرتی آفات کے موقع پر جاپان ہماری امداد اور تعاون میں ہمیشہ سرفہرست رہا ہے۔ جاپان کی مدد، تعاون اور قرضہ غیر مشروط ہوتا ہے اور امریکا کے برعکس جاپانی حکومت اور عوام امداد دے کر کبھی محبّت کرتے ہیں، کسی کی تذلیل نہیں کرتے۔ پاکستان کی معیشت میں اہم ترین کردار ادا کرنے والا یہ بے مثال ملک اب کراچی میں ہمارے اپنے ہاتھوں سے تباہ شدہ سرکلر ریلوے نئے سرے سے تعمیر کرنے جا رہا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ یہ ملک اور اس کے لوگ ہمیشہ سلامت رہیں اور ہر طرح کی قدرتی آفات مثلاً زلزلہ اور سونامی جس کا اُنھیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، سے محفوظ رہیں آمین۔ پاکستان جاپان دوستی زندہ باد۔

چشم کشا رپورٹ

ایک راجھستانی گاؤں کا دردناک پہلو

دیودا میں ۳۰۰ لڑکے اور صرف ۴ لڑکیاں ہیں

جہاں گھروں میں بیٹیاں نہیں ملتیں

نعیم احمد

وہاں کے باشندے سب سے زیادہ اپنی لڑکیوں کو مارتے ہیں

اس گاؤں میں گزشتہ ۱۰ سالوں میں صرف ۲ شادیاں ہوئیں کیونکہ وہاں لڑکیاں ہی نہیں تھیں

سیتا کنور خوف کے عالم میں زندگی گزار رہی ہے۔ اس پر مسلسل ڈر سوار رہتا ہے۔ اُسے خطرہ ہے کہ اس کے پانی یا کھانے میں زہر ملا دیا جائے گا۔ سیتا رات کو دیر تک جاگتی اور کوئی کھٹکا سن کر فوراً چوکنا ہو جاتی ہے۔ اُسے اندیشہ ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ دراصل ۸ سالہ لڑکی کو یقین ہے کہ اس کے باپ، سانگ سنگھ کا کہا ہے ”مجھے نہیں معلوم کہ سیتا میں یہ خوف کہاں سے پیدا ہوا۔ دیودا کے باسی تو بہت پہلے بیٹیوں کو مارنا چھوڑ چکے۔“

راجھستان بلکہ بھارت کے اکثر علاقوں میں بیٹیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ وجہ؟ وہی جہیز کا عذاب۔ آج کل بھارت میں اسی لڑکی کو اچھا رشتہ ملتا ہے جس کے والدین کم از کم ۱۰ لاکھ روپے کا جہیز دے سکیں۔ جہیز کی شرح پھر کروڑوں روپے تک جاتی ہے۔ اسی معاشی بوجھ سے بچنے کی خاطر بھارت میں ہزارہا خاندان بچیاں پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ یہ خوفناک اور انسان دشمن رجحان ان علاقوں میں زیادہ ہے جہاں تعلیم اور شعور کی کمی ہے۔

راجھستانی صدر مقام، جیسلمیر سے ۵۰ میل دور واقع گاؤں، دیودا بھی ایسا ہی مقام ہے۔ اس گاؤں میں بھٹی راجپوتوں کے ڈیڑھ سو گھرانے آباد ہیں، لیکن وہاں لڑکی خال خال ہی نظر آتی ہے۔

سہ پہر ہوتے ہیں وسیع و عریض صحرا میں بنے اس نخلستان میں بچے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ درختوں سے جھولا جھولتے یا میدان میں من پسند کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن ان بچوں میں کوئی لڑکی بمشکل ہی دکھائی دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیودا میں تین سو لڑکے ہیں تو صرف چار لڑکیاں..... بقیہ بیٹیاں اس رسم کی بھینٹ چڑھ چکی جو جہیز کی صورت لڑکیوں کے والدین پر تلوار بن کر لٹکتی رہتی ہے۔

حد یہ ہے کہ پچھلے ۱۰ برس میں دیودا میں صرف دو شادیاں ہوئی ہیں۔ گاؤں میں اتنی لڑکیاں ہی نہیں تھیں کہ ان کی شادیاں ہوتیں۔ پچھلے مہینے یہ گاؤں اچانک قومی افق پر نمایاں ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بیٹیاں قتل کرنے کا گھناؤنا عمل بھی!

ہوا یہ کہ مقامی تھانے دار کو اطلاع ملی کہ دیودا کے رہائشی جوڑے، گلاب سنگھ اور بانی نے اپنی نوزائیدہ بیٹی مار ڈالی ہے۔ جب تھانے دار نے تفتیش کی تو اُسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ مقتول بچی کے دادا، اندر سنگھ نے دعویٰ کیا کہ وہ بیمار ہونے کی وجہ سے چل بسی۔ لیکن خاندان میں پھیلی بے چینی اور گھبراہٹ دیکھ کر تھانے دار کو شک ہو گیا۔

پھر وہ اس ہسپتال پہنچا جہاں بچی کا جنم ہوا تھا۔ بچی کو جنم دینے والی ڈاکٹرنی نے اسے بتایا کہ بانی کی بچی صحت مند پیدا ہوئی اور اُسے کوئی بیماری نہ تھی۔ تھانے دار کو یقین ہو گیا کہ گلاب سنگھ اور بانی نے اپنی بیٹی کو ٹھکانے لگایا ہے۔

تھانے دار بیٹیوں والا اور راجھستانیوں کی اس روش سے واقف تھا کہ وہ اپنی بچیاں قتل کر ڈالتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اس مکروہ فعل کو سامنے لانے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ اس نے جوڑے کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ اندازہ لگائیے کہ یہ راجھستان میں بیٹی کو قتل کرنے والے ماں باپ کے خلاف درج ہونے والی پہلی ایف آئی آر ہے۔

دراصل کئی سال پہلے بھارتی میڈیا نے بیٹیاں قتل کرنے والوں کے خلاف مہم چلائی تھی۔ اس کے بعد والدین چوری چھپے اپنی نوزائیدہ بیٹیاں ٹھکانے لگانے لگے۔ لہٰذا اب خاندان یا قریبی رشتے داروں کے علاوہ کوئی جان نہیں پاتا کہ چپ چاپ ایک بچی مار ڈالی گئی۔ چونکہ دیہات میں خاندانی نظام بہت مضبوط ہے لہٰذا کوئی بھی جرم افشا کر کے نکو نہیں بننا چاہتا۔ بس یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ بچی بیمار تھی لہٰذا چل بسی یا کوئی اور وجہ ڈھونڈ لی جاتی ہے۔

پھر تھانے دار نے بچی کی لاش حاصل کی اور اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ لیکن لاش گل سڑ چکی تھی لہٰذا ڈاکٹر موت کی وجہ نہ جان سکے۔ چنانچہ اُسے فوریزک لیبارٹری بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے آنے والی رپورٹ نے انکشاف کیا کہ بچی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس خبر کو مقامی میڈیا نے نمایاں انداز میں پیش کیا۔

عورت کا مقام

دیودا میں لڑکی کو دس گیارہ سال کا ہوتے ہی گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہ پھر اشد ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتی ہے۔ تب بھی وہ اوڑھنی ضرور لیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کی سرپنچ (کھیا) ایک عورت ہے، کیونکہ دیہی پنچایتی نظام میں خواتین کا کوٹہ مخصوص ہے۔ لیکن اتنت کور عوامی اجتماع سے خطاب نہیں کر سکتی، بھٹی راجپوت روایات کے مطابق وہ زنان خانے میں رہتے ہوئے سارے کام نمٹاتی ہے۔ باہر وہ اسی وقت نکلتی ہے جب مندر جانا ہو۔

بعض لوگوں کے نزدیک خواتین کو گھر کی چار دیواری میں رکھنا انھیں قید کرنے کے مترادف ہے جبکہ دیگر لوگ کہتے ہیں کہ خاتون گھر ہی میں اچھی لگتی ہے اور یہ اُسے عزت دینے کا انداز ہے۔ بہرحال یہ اپنے اپنے نقطہ نظر کا معاملہ ہے۔ تاہم راجھستان کے دیگر دیہات میں اب خواتین کو آزادی مل گئی ہے۔ نیز وہاں آباد مردوں کو یہ احساس بھی ہو چلا ہے کہ لڑکیوں کی کمی بڑا مسئلہ بھی ہے۔ دراصل وہاں لڑکوں کو دُلھن نہیں ملتی، لہٰذا بیٹیوں والے والدین کی چاندی ہوگئی۔ اب وہ حسب دلخواہ لڑکے سے بیٹی کی شادی کرتے ہیں اور جہیز بھی زیادہ نہیں دیتے۔

مزید براں راجھستان میں وٹے سٹے کی شادیوں والی پرانی رسم بھی لوٹ آئی۔ چنانچہ اب لڑکے والوں کو کسی خاندان سے بیٹی لیتے ہوئے انھیں اپنے ہاں سے بھی ایک لڑکی دینی پڑتی ہے۔ گو اب اس نظام کو پسند نہیں کیا جاتا، لیکن وٹے سٹے کے چند فوائد بھی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک فائدہ یہ ہے کہ کوئی مسئلہ جنم لے، تو بات عموماً زیادہ نہیں بڑھتی۔ کیونکہ شوہروں کو علم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کی بیٹی بھی بیوی کے میکے میں ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ والدین کو یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ بیٹی کو استطاعت سے باہر جہیز دیں۔ کیونکہ انھیں علم ہوتا ہے کہ بیٹی کا مستقبل محفوظ ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض والدین لڑکیوں کی شدید کمی دیکھ کر بیٹیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ انھیں مالی فائدہ ہوسکے۔ سچ ہے، دنیا کے رنگ نرالے! دریں اثنا حکومت نے کم از کم سرکاری ہسپتالوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ ہونے والے بچے کی جنس والدین کو نہ بتائیں تاکہ اسقاطِ حمل میں کمی آسکے۔ کئی والدین یہ جان کر کہ بیٹی کا حمل ہے، اُسے گرا دیتے ہیں۔

بعض سماجی تنظیموں نے حکومت کو یہ تجویز دی ہے کہ جوں ہی کوئی لڑکی جنم لے، اس کے نام سے مخصوص رقم فکسڈ ڈیپازٹ میں رکھوا دی جائے۔ پھر جب شادی کا موقع آئے، تو وہ اسے مل جائے، تاہم حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ریاست میں احتجاج

جب میڈیا میں یہ خبر عام ہوئی کہ دیودا میں والدین ہی کے ہاتھوں ایک بیٹی قتل ہوگئی، تو راجھستان کے شہروں میں سماجی راہنماؤں اور خواتین نے اس خوفناک روایت یا عمل کے خلاف مظاہرے کیے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ یہ سنگین جرم کرنے والوں کو کڑی سزائیں دی جائیں تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جیسلمیر میں ہونے والے مظاہرے میں کئی بھٹی راجپوت خواتین بھی شوہروں کے بغیر شریک ہوئیں۔ انھوں نے بیٹیوں کو قتل کرنے کی رسم کے خلاف زوردار نعرے لگائے اور زبردست احتجاج کیا۔

سانگ سنگھ کے گھرانے یا خاندان تک تو یہ بات درست ہو، لیکن دیودا ہی نہیں بلکہ پوری ریاست راجھستان میں روزانہ سیکڑوں لڑکیاں اپنے والدین یا رشتے داروں کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہیں۔ ایک غیر سرکاری تنظیم کے مطابق یہ تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے

ان میں سرخ گھاگھرے اور سیاہ اوڑھنی میں ملبوس ۴۰ سالہ ریکھا دیوی بھی شامل تھی۔ وہ کہتی ہے ''سال قبل مجھے مجبور کیا گیا کہ اپنی بچی کو مار ڈالو۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس جرم کے خلاف احتجاج کیا جائے جو میری جیسی عورتیں مجبوراً روزانہ انجام دیتی ہیں۔''

راجھستانی عورتوں کے عزم اور استقلال کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس بھارتی علاقے میں تبدیلی کی ہوا چل پڑی۔ شاید مستقبل میں وہ وقت بھی آجائے جب سیتا کنور جیسی سیکڑوں بچیاں اور لڑکیاں آرام وچین کی نیند سوسکیں گی۔

طلبہ وطالبات کے لیے تحفۂ خاص

کیریئر کونسلنگ

سوشل سائنسز

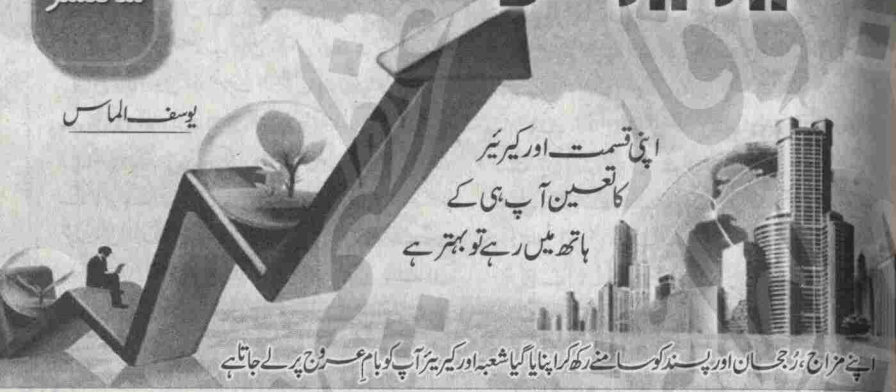

یوسف الماس

اپنی قسمت اور کیریئر کا تعین آپ ہی کے ہاتھ میں رہے تو بہتر ہے

اپنے مزاج، رُجحان اور پسند کو سامنے رکھ کر اپنایا گیا شعبہ اور کیریئر آپ کو بامِ عروج پر لے جاتا ہے

سماجی

علوم انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میں فرد کی خواہشات اور ضروریات، انفرادی برتاؤ اور اجتماعی رویے، گھریلو حالات اور ان کے اثرات شامل ہیں۔ معاشی ضروریات اور انتظامی معاملات، عدل وانصاف کی فراہمی اور بالادستی حتیٰ کہ قومی اور بین الاقوامی تعلقات بھی اسی زُمرے میں آتے ہیں۔ انسان کی صحت اور اس کی نشوونما، زندگی کی سہولت اور آسایش کے لیے تحقیق اور ایجادات بھی سوشل سائنس ہی کا موضوع ہیں اور سکول، کالج اور یونیورسٹی کے اداروں میں دی جانے والی تعلیم و تربیت بھی اسی میں شمار ہوتی ہے۔ مذہب کی تعلیم، اخلاقیات کی تعلیم وتلقین، شعروادب اور آرٹ سب آج سوشل سائنسز میں شمار کیے جاتے ہیں۔

سماجی علوم کے ماہرین ہی اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ محصولات کا نظام درست سمت میں رہے تاکہ ان لوگوں کی مدد ہوسکے جو وسائل نہیں رکھتے۔ نیز منڈی یا بازار کو ذخیرہ اندوزی اور افراطِ زر سے بچایا جائے تاکہ ضروریات زندگی مسلسل فراہم ہوتی رہیں۔ ہسپتالوں اور کارخانوں کا وسیع نیٹ ورک قائم کیا جائے جو عوام کے لیے مفید بھی ہو اور جہاں تمام پیشہ وارانہ ماہرین اپنی ذمے داریاں بہ طریقِ احسن ادا کرسکیں۔ ملک میں ایسے نظامِ تعلیم کا قیام اور نفاذ بھی جو قومی اقدار اور روایات سے ہم آہنگ اور بہترین مہارتوں سے آراستہ نسل تیار کرسکے، ماہرین سماجی علوم ہی کی ذمے داری ہے۔

غرض سماجی علوم سے مراد زندگی کے اُن تمام امور کا مطالعہ وتحقیق ہے جو کسی بھی لحاظ سے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی مطالعہ وتحقیق معاشرے کے تمام طبقات کو اپنے فیصلوں کے متعلق، اختیارات کے استعمال اور دن رات میں آنے والی تبدیلیوں سے متعلق راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کے پس منظر میں حالاتِ حاضرہ کا تجزیہ اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کی اہلیت وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

خصوصیات

سماجی علوم کے تمام تر شعبوں میں تجزیہ اور تحقیق کا کام بالعموم بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایسی فہم و فراست چاہیے جو وقت، حالات اور انتظامیہ کے دباؤ کا خوش اسلوبی سے مقابلہ کر سکے۔ اس کے لیے وسعتِ مطالعہ اور زورِ قلم چاہیے۔ دل کش اسلوبِ بیان، دلیل کی کاٹ، مضمون کی گہرائی، محاوروں اور ضرب الامثال، تاریخی حوالوں اور ماہرین کی آراء سے مزین تحریریں، مضامین، تجزیے اور رپورٹیں درکار ہیں۔ قرآن و سنت کی راہنمائی سماجی علوم کے ماہر کے اثرات کو بہت وسعت دیتی ہے۔ ہم عصر تہذیبوں اور ثقافتوں سے شناسائی، علاقائی اور خطے میں رائج دیگر زبانوں کے ساتھ دوستانہ ماحول بنانے اور نبھانے کی صلاحیت انسانی معاشرے کو سمجھنے اور راہنمائی دینے کا اہل بناتی ہے۔

ہمارا رویہ

آج ہمارا ذہین بچہ نیچرل سائنس (Natural Science) ہی کو سب سے بہترین سمجھتا ہے۔ ایسے بچے جو آرٹس (Social Sciences) پڑھیں یا اس شعبے میں اپنے شوق کا اظہار کریں تو انہیں نالائق اور کمزور سمجھا جاتا ہے۔ جس کے پاس وسائل ہوں گے وہ ہر قیمت پر اپنے بچے کو ڈاکٹر یا انجینئر ہی بنانا چاہے گا خواہ بچہ اس کا رجحان اور صلاحیت رکھتا ہو یا نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہی سب کچھ نہیں۔ صرف انجینئرنگ کی جامعات بنا کر اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا رونا رو کر ہی ترقی اور کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ آرٹس سمجھے جانے والے سماجی علوم بھی معاشرے کی ترقی کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فہم و فراست اور ذہانت و فطانت کا گہوارہ سماجی علوم ہی ہیں۔ انہی علوم سے آنے والی فطری قیادت تیار ہوتی ہے جو اس کی اہل ہوتی ہے کہ ترقی کا راستہ متعین کرے اور اس کے لیے حالات بھی سازگار بنائے۔ سماجی علوم کی ترقی و ترویج سے مجرمانہ غفلت نے ہمیں تعلیمی دنیا کی تباہی، سیاسی نظام کی ناکامی، منصوبہ بندی کی پستی، معیشت کی کمزوری، جرائم، اخلاقی بگاڑ، بے روزگاری، مایوسی، ذہنی دباؤ اور خودکشی کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب ان علوم کے حوالے سے اپنے رویے کو درست کریں تاکہ ہمارے قدم آگے بڑھ سکیں۔

اچھے، ذہین اور اہل طلبہ و طالبات جو اس کا رجحان رکھتے ہیں انہیں شروع سے ہی ان مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس سے ایک جانب ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی اور دوسری جانب ایک رُوبہ زوال معاشرے میں بہتری کے آثار نمایاں ہوں گے۔

سماجی علوم کے شعبے

سماجی علوم ایک ایسا پیچیدہ باب اور کھلا سمندر ہے جس کی گہرائی میں نہ اترا جائے تو حقیقت کو سمجھنا دشوار اور اپنے لیے کیریئر پلاننگ مشکل ہو جاتی ہے۔ ہم ان علوم کو ۸/شعبوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ یہ تقسیم یونیورسٹیوں کی انتظامی تقسیم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ عملی زندگی میں حالات کار کی بنیاد پر ہے۔

۱۔ تعلیم و تربیت
۲۔ سیاست/انتظامیہ/عدلیہ
۳۔ اقتصادیات/مالیات/کاروباری انتظامیہ
۴۔ دینیات
۵۔ لسانیات
۶۔ تاریخ/عمرانیات/نفسیات
۷۔ ابلاغ عامہ
۸۔ دیگر

ذیل میں ہم ایک ایک شعبے کا تعارف، تفصیل اور اس شعبے سے متعلق پاکستان میں پڑھائے جانے والے ڈسپلن (مضامین) دے رہے ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ ڈسپلن اہمیت کے لحاظ سے ترتیب نہیں دیے گئے بلکہ حروفِ تہجی (Alphabetic) کے مطابق ہیں۔

تعلیم و تربیت

اس شعبے میں پیشہ وارانہ اہلیت کے حامل درج ذیل افراد خدمات انجام دیتے ہیں:

۱۔ استاد جن میں سکول کے اساتذہ سے لے کر یونیورسٹیوں کے لیکچرار اور پروفیسر شامل ہیں۔
۲۔ تعلیمی اداروں کے سربراہان جیسے ہیڈ ماسٹر، پرنسپل، وائس چانسلر وغیرہ۔
۳۔ تعلیمی ماہرین جن میں نصاب ساز، درسی کتب، تصنیف و تالیف کرنے والے، کتب اور نصاب کا پیشہ وارانہ جائزہ لینے والے۔
۴۔ لائبریرین۔
۵۔ ٹیکنیکل انسٹرکٹر (ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں میں پڑھانے اور سکھانے والے)
۶۔ جسمانی تعلیم کے انسٹرکٹر (جیسے پی ٹی آئی) اور ماہرینِ کھیل۔
۷۔ وارڈن۔
۸۔ تعلیمی انتظامیہ کے اہل کار اور افسران (ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سے لے کر سیکرٹری تعلیم تک)
۹۔ دیگر تعلیمی شعبہ جات میں نمایاں حیثیت میں کام کرنے والے۔

تعلیم و تربیت کے ان شعبوں میں سے جس کسی سے بھی آپ کی شخصیت، اہلیت اور اقدار ہم آہنگ ہوں، ضرور اختیار کریں اور اس میں مثالی انداز اور کردار پیش کریں۔ آج ملک و قوم کو اس کی شدید ضرورت ہے اور اگر آپ استاد بننے کا فیصلہ کریں تو ۴/ باتوں کو لازماً پیشِ نظر رکھیں۔

۱۔ آپ میں سیکھنے اور جاننے کی شدید طلب ہو۔
۲۔ آپ کھلا ذہن رکھتے ہوں، تنگ یا محدود نظر نہ ہوں۔
۳۔ آپ دوسروں کو راہنمائی فراہم کرنے والے ہوں نہ کہ حکم دینے والے۔
۴۔ آپ کو پڑھانے اور سکھانے سے طبعی محبت ہو اور اس سے خوشی محسوس کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ ۲/ باتیں ایسی ہیں جو کسی صورت آپ میں نہیں ہونی چاہئیں:

۱۔ آپ کسی صورت صرف ملازمت اختیار کرنے کے لیے استاد نہ بنیں۔
۲۔ اگر آپ اپنے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تو اس شعبے کا رخ نہ کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ہمارے پہلے استاد ہمارے والدین ہیں اور بعد میں ہمارا اپنا تجربہ ہمارا استاد بنتا ہے جو قدم قدم پر ہمیں سکھاتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان میں ایک وہ ذات بھی ہے جو کبھی ہمیں اچھی لگتی ہے اور کبھی نہیں۔ کبھی بہت پُرکشش شخصیت کی مالک اور کبھی کم، مگر اس نے ہمارا معصوم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر "ا" (الف) لکھنا سکھایا اور جس نے "۱، ۲" گننا سکھایا اور پھر دنیا کے ہر بڑے نے یہیں سے زندگی کی ساری منزلیں طے کیں۔

پاکستان میں تعلیم کے شعبے میں درج ذیل ڈسپلن پڑھائے جا رہے ہیں:

۱۔ ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن (Early Childhood Education)
۲۔ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ
۳۔ ایجوکیشن پلاننگ اینڈ مینجمنٹ
۴۔ ایجوکیشنل ٹیکنالوجی
۵۔ ایجوکیشنل لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ
۶۔ ایلیمنٹری ایجوکیشن
۷۔ آرٹس ایجوکیشن
۸۔ بزنس ایجوکیشن
۹۔ تعلیمی نفسیات
۱۰۔ ٹیچر ایجوکیشن

۱۱۔جسمانی تعلیم
۱۲۔سائنس ایجوکیشن
۱۳۔سپورٹس، سائنس اینڈ فزیکل ایجوکیشن
۱۴۔سپیشل ایجوکیشن
۱۵۔سیکنڈری ایجوکیشن
۱۶۔سیکنڈری سپیشل ایجوکیشن
۱۷۔صحت وجسمانی تعلیم
۱۸۔علم التعلیم
۳۔فاصلاتی اور غیر رسمی تعلیم

سیاسیات/ انتظامیہ/ عدلیہ

انگریز کا راج ہو یا مغلوں کا عہد، برصغیر ہو یا کوئی اور براعظم، ماضی قریب ہو یا ماضی بعید حتیٰ کہ عہدِ حاضر میں برسرِ اقتدار رہنے والے اور طویل عرصے تک حکومت قائم رکھنے والے، ان سب نے سیاسی فراست اور انتظامی سوجھ بوجھ رکھنے والے وزراء اور زیرک، دانا، جرأت مند اور حقیقی معنوں میں عدل کرنے والے منصفوں کو ہمیشہ ہر سطح پر سب سے زیادہ اہمیت دی۔ سوشل سائنسز کی یہ اہم ترین شاخ معاشرہ اور اس کے نظام کو مضبوطی سے قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں سیاستدان، دانشور، انتظامی اہل کار وافسران، ماہرینِ قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے وابستہ لوگ، منصف اور وکیل سب شامل ہیں۔

سیاسیات: سیاسیات کا علم درحقیقت ریاست اور حکومت کے امور ہی نہیں سماجی اور تعلیمی امور میں بھی راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ہر وہ فرد جو کسی بھی طرح کے سیاسی اور قومی فیصلوں میں شریک ہو، اس کے لیے سیاسیات کا علم ضروری ہے۔ ہر وہ ریاستی اور حکومتی عہدیدار اور اہل کار جو سیاسی نظام بنانے' اس میں بہتری لانے اور اسے چلانے کا ذمے دار ہو، سیاسیات کے علم کا محتاج ہے۔ ہر وہ عوامی نمائندہ اور سیاستدان جسے قومی اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق فیصلے کرنا، عوامی ضروریات اور ترجیحات کو سمجھنا، اداروں اور جماعتوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا ہے، اسے سیاسیات کا طالب علم بننا ہوگا۔

ایسے سیاستدان جو ملکی آئین، قانون، بین الاقوامی قوانین، بین الاقوامی تعلقات اور بنیادی سیاسی تعلیم اور فلسفے سے آگاہ ہوں، وہ یقیناً زیادہ بہتر طور پر سیاسی پالیسی اور حکمت عملی بنا اور چلا کر اپنے لیے بھی اور ملک وقوم کے لیے بھی کامیاب سیاست کر سکتے ہیں۔

ملکی انتظامیہ: ملکی انتظامیہ ملک کے ہر شعبے کو چلانے والی ہوتی ہے۔ اس میں:

۱۔ضلعی، صوبائی اور قومی انتظامیہ شامل ہے۔

۲۔صوبائی اور قومی سطح پر داخلہ، خارجہ، دفاع، خزانہ، قانون، زراعت، صحت، مواصلات، تعلیم، تجارت، پیداوار، نشرواشاعت وغیرہ سے متعلق سترھویں گریڈ کے افسر سے لے کر سیکرٹری تک تمام افسران شامل ہیں۔

اس کے لیے حکومتی سطح پر سی ایس ایس کے ذریعے افرادکار کا ایک وسیع نیٹ ورک بنایا جاتا ہے۔

عدلیہ: عدلیہ ضلع سے لے کر قومی سطح تک لوگوں کے درمیان ہر قسم کے تنازعات اور مقدمات کے فیصلوں کے لیے کام کرتی ہے۔ عدلیہ کے لیے کام کرنے والے بنیادی طور پر ۲/نمایاں لوگ ہیں: ایک وکیل اور دوسرا جج۔ ان دونوں کے لیے قانون، اصول قانون، آئین، اقوامِ عالم کے دساتیر، قانون شریعت، حقوق انسانی، اسلامی اور مغربی قوانین کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ وکیل کا کام عدالت یا کسی بھی دوسری انصاف کی جگہ پر مقدمے کو حالات و واقعات کی روشنی میں قانون کی مختلف تشریح و تعبیر اور دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہے تاکہ عام آدمی کو انصاف مل سکے۔ اس راستے میں بڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قدم پر صبر وضبط، تحمل، ذہانت، جرأت، خود اعتمادی اور حالات و واقعات کو باریک بینی سے سمجھنے کی بنیادی صلاحیت رکھتا ہو۔

سیاسیات/انتظامیہ اور عدلیہ سے متعلق پاکستان میں درج ذیل ڈسپلن پڑھائے جارہے ہیں:

۱۔ایڈمنسٹریٹو سائنسز
۲۔بین الاقوامی تجارتی قانون
۳۔بین الاقوامی تعلقات
۴۔بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیات
۵۔بین الاقوامی قانون
۶۔پبلک ایڈمنسٹریشن
۷۔ڈپلومیسی اینڈ سٹریٹیجک سٹڈیز
۸۔ڈیفنس اینڈ سٹریٹیجک سٹڈیز
۹۔سیاسیات
۱۰۔فیملی لاء
۱۱۔قانون
۱۲۔کارپوریٹ لاء

اقتصادیات/ مالیات/کاروباری انتظامیہ

اقتصادیات: اقتصادیات، حصولِ دولت وگردش اور عدل وانصاف کے ساتھ اس کے استعمال کو یقینی بناتی ہے تاکہ لامحدود انسانی خواہشات کو محدود وسائل سے پورا کیا جاسکے۔ اس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے والے درج ذیل حیثیتوں میں خدمات انجام دے سکتے ہیں:

۱۔معاشیات کے لیکچرار یا پروفیسر
۲۔ماہر معیشت
۳۔معاشی تحقیق کار
۴۔دیگر معاشی شعبہ جات میں نمایاں حیثیت میں کام۔

مالیات: کاروبار چھوٹا ہو یا بڑا، ایک دکان ہو یا بین الاقوامی کمپنی، شہری حکومت ہو یا مرکزی حکومت، اثاثے خواہ نقد ہوں یا کسی دوسری شکل میں ان سب کا انتظام و انصرام اور نگرانی مالیات کہلاتا ہے۔ یہ ایک سائنس ہے جس کے لیے تیز ذہانت درکار ہے جو پیچیدہ مسائل کو حل کر سکے۔ اور یہ ایک فن ہے جو آنے والے کل کے لیے ہمہ پہلو بجٹ تیار کرے اور آمد اور خرچ کو کنٹرول بھی کرے۔ اس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے والے درج ذیل حیثیتوں میں خدمات انجام دے سکتے ہیں:

۱۔اکاؤنٹنٹ
۲۔اکاؤنٹس مینیجر
۳۔چیف آف اکاؤنٹس/فنانس
۴۔دیگر مالیاتی شعبہ جات میں نمایاں حیثیت میں کام۔

کاروباری انتظامیہ: مالیاتی ادارے ہوں یا صنعتی، برآمد اور درآمد کی تجارت کرنے والے یا سروسز دینے والے یعنی ہوٹل، ٹرانسپورٹ وغیرہ، سماجی ادارے ہوں یا تعلیمی، آج ہر جگہ پر کام پیشہ وارانہ انداز میں ہو رہا ہے۔ معمولی حسابات ہوں یا بڑے تجارتی فیصلے ہر جگہ کاروباری انتظامیہ کے چھوٹے بڑے پروفیشنلز کی ضرورت اور اہمیت ہے۔ اس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے والے درج ذیل حیثیتوں میں خدمات انجام دے سکتے ہیں:

۱۔مختلف پیشہ وارانہ شعبہ جات کے منیجر جیسے منیجر پروکیورمنٹ، منیجر مارکیٹنگ وغیرہ۔
۲۔بینکار
۳۔چیف ایگزیکٹو آفیسر
۴۔چیف آف آپریشنز
۵۔دیگر کاروباری شعبہ جات میں نمایاں حیثیت میں کام۔

حالات حاضرہ سے واقفیت، قائدانہ خصوصیات، اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی بہترین استعداد، معاشیات اور اقتصادیات کے عملی پہلوؤں میں دلچسپی، آنے والے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ذہانت، حوصلہ اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ وسعت قلب ونظر، نظریاتی وسماجی کشادگی، تجارت اور انتظامی امور کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہی ملکی اور غیر ملکی، سرکاری اور غیر سرکاری اعلیٰ مناصب پر پہنچا جاسکتا ہے۔

اقتصادیات/مالیات اور کاروباری انتظامیہ کے حوالے سے پاکستان میں درج ذیل ڈسپلن پڑھائے جا رہے ہیں:

۱۔آرگنائزیشنل سائیکالوجی
۲۔بزنس ایڈمنسٹریشن
۳۔بینکنگ اینڈ فنانس
۴۔فنانس

۵۔ کامرس
۶۔ مارکیٹنگ
۷۔ معاشیات
۸۔ معاشیات اور فنانس
۹۔ معاشیات اور قانون
۱۰۔ معاشیات اور مینجمنٹ
۱۱۔ ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ
۱۲۔ ہیومن ریسورس مینجمنٹ

دینیات

دینیات کے علم کو محدود نہ سمجھیں۔ یہ ایک وسیع علم ہے اور صرف دین ہی نہیں دنیا کے معاملات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے ہر شعبے میں بہترین انداز میں کام کے لیے انسان کو اس کے خالق کی طرف سے دی گئی راہنمائی حاصل کرنے کے لیے قرآن اور علوم قرآن کا مطالعہ مفید ہے۔ قرآن ہی کی تشریح اور تفسیر اور مزید ذیلی تفصیلات کے لیے حدیث رسول ﷺ اور اس سے متعلق علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ فقہ ان قوانین کا نام ہے جو آئمہ کرام نے قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے اخذ کیے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا علم بھی ضروری ہے۔ انسانی رویوں، جذبات، نفسیات اور اخلاق کی بہترین صورت سے آگاہ ہونے کے لیے سیرت النبی ﷺ، سیرتِ صحابہؓ اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلامی علوم کا مطالعہ زندگی کے ہر گوشے کو سنوارنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

آج معاشرہ ایسے ماہرین کی تلاش میں ہے جو ایک جانب اسلام اور اس کی تعلیمات پر مکمل اور غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دوسری جانب مطالعہ کی وسعت، قلب ونظر کی کشادگی اور حالات کا گہرا فہم وشعور بھی ہو تاکہ حالات حاضرہ میں پیش آنے والے نت نئے مسائل پر نہ صرف رائے دے سکیں بلکہ عقل وخرد اور احساسات و جذبات کو متاثر کرنے والا حل بھی پیش کر سکیں۔

اس وقت ملک میں شرعی عدالتیں بھی قائم ہیں اور اسلامی بینکاری بھی ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے شعبے میں بھی اسلام پھیلانے کے لیے نصاب سازی سے لے کر تعلیمی اداروں کے قیام تک کام ہو رہا ہے۔ چنانچہ اسلامی علوم کا طالب علم اس وقت درج ذیل حیثیتوں میں معاشرے میں خدمات انجام دے سکتا ہے:

۱۔ اسلامی بینکار (یا اسلامی بنک میں دیگر نمایاں حیثیتوں میں کام)
۲۔ شرعی عدالت کا وکیل اور جج
۳۔ ماہر نصابیات (اسلامی تعلیم کا)
۴۔ کسی اسلامی تعلیمی ادارے میں استاد، لیکچرار یا پروفیسر وغیرہ۔
۵۔ اسلامی تعلیم کے مختلف شعبوں میں مصروف تحقیق کار۔
۶۔ دیگر اسلامی اداروں یا شعبہ جات میں نمایاں حیثیت میں کام۔

اس وقت دینیات کے حوالے سے ملک میں درج ذیل ڈسپلن پڑھائے جا رہے ہیں:

۱۔ اسلامک تھیولوجی
۲۔ اسلامی اور مذہبی تعلیم
۳۔ اسلامی بینکنگ اور فنانس
۴۔ اسلامی تعلیم
۵۔ اسلامی ثقافت
۶۔ اسلامک لرننگ
۷۔ اصول الدین
۸۔ تاریخِ اسلام
۹۔ تقابلِ ادیان
۱۰۔ شریعہ
۱۱۔ شریعہ اینڈ لاء
۱۲۔ قرآن وسنت
۱۳۔ مطالعۂ اسلامیات
۱۴۔ مطالعۂ سیرت
۱۵۔ مطالعۂ مذہب

تحقیقی رپورٹ

ایسے آم خریدنے سے گریز کریں جو وقت سے پہلے پکنے کے لیے آجائیں

کیلشیم کاربائیڈ سے نکلنے والی گیس سردرد، غنودگی، مرگی اور دماغی انتشار کا باعث بن سکتی ہے

۲۴ گھنٹے میں پکنے والا آم

مزے کے بجائے مہلک بیماریوں کا باعث ہوسکتا ہے

عبدالرشید
(ایم ایس سی فوڈ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی)

زیادہ منافع کے لیے مصنوعی طریقے سے آم پکانے کے نقصانات پر خصوصی رپورٹ

آم

ایک ایسا موسمی پھل ہے جسے پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ آم بچوں اور بڑوں کا شروع ہی سے پسندیدہ اور مرغوب پھل رہا ہے۔ آم کا جب موسم آتا ہے تو یہ مشہور ہے کہ حلوائیوں کا کام بھی مندا ہو جاتا ہے۔ یہ پھل اپنے بہترین ذائقے، خوشبو اور غذائیت کے حوالے سے ہر عام و خاص میں یکساں پسند کیا جاتا ہے۔ یہ پھل اپنے رنگ کی کشش اور ذائقے کی وجہ سے بہت زیادہ نہ صرف برصغیر بلکہ دُنیا کے دیگر ممالک میں بھی بڑی رغبت سے اور سوغات سمجھ کر کھایا جاتا ہے۔ بیرونِ ملک پاکستانی آم کی کچھ قسمیں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ پکے ہوئے آم کے ۱۰۰گرام میں عام طور پر تقریباً ۶۴-۸۶ کیلوریز پائی جاتی ہیں۔ پکے ہوئے آم کے ۱۰۰گرام کا کیمیائی تناسب درج ذیل ہے:

پانی: ۷۸٫۹ سے ۸۲٫۸ گرام، کاربوہائیڈریٹ ۱۶٫۲ سے ۱۷٫۱۸ گرام، فائبر ۰٫۸۵ سے ۰٫۹۶ گرام

منرل: کیلشیم: ۶٫۸ ملی گرام سے ۱۲٫۸ ملی گرام، فاسفورس: ۵٫۵ ملی گرام سے ۱۷٫۹ ملی گرام، آئرن: ۰٫۲۰ ملی گرام سے ۰٫۶۳ ملی گرام وٹامنز: وٹامن اے یا کیروٹین: ۰٫۱۳۵ ملی گرام سے ۰٫۸۷۲ ملی گرام، وٹامن بی ون: ۰٫۰۲۰ ملی گرام سے ۰٫۰۷۳ ملی گرام، وٹامن سی:

۸ء۷ملی گرام سے ۱۸۰ملی گرام، وٹامن نیاسین: ۳ء۰ملی گرام سے ۴ء۱ملی گرام۔

یہی صحت بخش اور خوش ذائقہ پھل حضرت انسان کی زیادہ دولت کمانے کے چکر میں صحت کے لیے خطرہ بن رہا ہے اور بجائے فائدہ دینے کے ممکنہ مہلک بیماریوں کے پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا۔

آئندہ جب آپ مارکیٹ میں آم خریدنے جائیں تو یہ اطمینان کرلیں کہ آپ صحت مند آم ہی خرید رہے ہیں یا یہ آم انتہائی خطرناک ممکنہ بیماریوں کا باعث بن سکتا ہے۔ کیونکہ جو آم آپ کو نہایت خوشنما اور دلکش معلوم ہو رہے ہیں ہوسکتا ہے وہ اپنے ساتھ انتہائی خطرناک بیماریاں لیے ہوں۔ اس کی وجہ اس پھل میں پائے جانے والی کوئی قدرتی بیماری یا نقص نہیں بلکہ حضرت انسان کے لالچ کی وجہ سے اس کے پکانے کے مصنوعی طریقے کی وجہ سے اس میں منتقل ہونے والے خطرناک کیمیائی اجزاء ہیں۔ جو لاعلمی یا دانستہ طور پر ایک صحت مند موسمی پھل میں منتقل ہو رہے ہیں۔ جب مارکیٹ میں آم لینے جائیں تو اطمینان کر لیں کہ یہ مہلک اور پابندی والے مصنوعی طریقے سے تو پکائے نہیں گئے۔ مارکیٹ میں بکنے والے اکثر آم بہت زیادہ دلکش رنگت لیے ہوئے ہوتے ہیں جو خریداروں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ بہت زیادہ چمک دمک اور یکساں رنگت رکھنے والے آم خریدنے سے گریز کریں کیونکہ ہوسکتا ہے یہ مصنوعی طریقے سے پکائے گئے ہوں۔

عام طور پھلوں کو پکانے کے ۲/بنیادی طریقے ہیں: قدرتی طریقہ جس میں پھل کو درخت کے ساتھ ہی رہنے دیا جاتا ہے جس میں وہ خود کار نظام سے پکتا ہے۔ دوسرا مصنوعی طریقہ، جس میں مختلف کیمیکل کے استعمال سے پھلوں کو پکایا جاتا ہے۔ قدرتی طریقے سے پکے ہوئے پھلوں کا ذائقہ مصنوعی طریقے سے پکے ہوئے پھلوں کی نسبتاً بہتر ہوتا ہے کیونکہ پھل پکنے تک درخت کی شاخ سے منسلک رہتا ہے اور اس میں اہم غذائی اجزاء کی مقدار بڑھتی رہتی ہے جبکہ مصنوعی طریقے سے پھلوں کو پکانے کے لیے درخت سے پکنے سے پہلے ہی توڑ لیا جاتا ہے، لہٰذا اس میں اہم غذائی اجزاء کی مقدار کم ہوتی ہے۔

مصنوعی طریقے سے پھلوں کو پکانے کے لیے پاکستان میں عام طور پر ایک کیمیکل استعمال کیا جاتا ہے جسے کیلشیم کاربائیڈ (CaC2) کہا جاتا ہے۔ کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے آموں کو پکانے کا طریقہ آج کل ٹریڈرز میں بہت زیادہ مقبول ہے کیونکہ آم کا قدرتی طریقہ سے پکنے کا عمل بہت زیادہ وقت لیتا ہے۔ جبکہ کیلشیم کاربائیڈ کے طریقے سے یہی عمل تقریباً 24 گھنٹوں میں مکمل ہوجاتا ہے۔ لیکن اس طریقہ سے پکنے والا آم صحت کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ عام طور پر آم مئی کے آخر میں مکمل میچور اور استعمال کے قابل ہوجاتا ہے۔ لیکن تاجر حضرات اور فروٹ مارکیٹ میں موجود کمیشن ایجنٹ زیادہ منافع کمانے کے چکر میں آم کی تڑوائی Harvesting اس کے مکمل طور پر میچور ہونے سے پہلے ہی کروا لیتے ہیں۔ پھر اس کچے Immature آم کو مصنوعی طریقے سے کیلشیم کاربائیڈ کو استعمال کرتے ہوئے پکایا جاتا ہے تاکہ مارکیٹ میں جلدی لایا جاسکے کیونکہ شروع سیزن میں آم کا مارکیٹ ریٹ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

CaC2 کیلشیم کاربائیڈ ایک ایسا کیمیکل ہے جو صنعتوں میں مختلف کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ CaC2 فضا میں موجود نمی سے مل کر حرارت پیدا کرتی ہے اور ساتھ ساتھ Acetylene اور کیلشیم ہائیڈرو آکسائیڈ گیس پیدا کرتی ہے، Acetylene gas بہت زیادہ خطرناک اور شعلے سے جلنے والی گیس ہے جو عام طور پر دھاتوں کو کاٹنے کے کام آتی ہے۔ صنعتی استعمال کے لیے بنائے جانے والے CaC2 کیلشیم کاربائیڈ میں آرسینک (arsenic) اور فاسفورس (phosphorous) کے ذرات بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کیمیکل صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔

اس طریقے سے آم پکانے کے لیے کیلشیم کاربائیڈ کی معمولی مقدار کاغذ کی تھیلی میں ڈال کر آموں کی پیٹیوں

میں رکھ دی جاتی ہے جو فضا میں موجود نمی سے عمل کر کے Acetalyne gas گیس خارج کرتی اور آم کو جلد پکنے میں مدد دیتی ہے۔ اس گیس کی فطرت Ethylene گیس ہی کی طرح ہوتی ہے جو سائنسی طریقے سے آم کو پکانے کے لیے استعمال کی جاتی اور غیر مضر ہوتی ہے۔ اس کی ایک مخصوص مقدار ہوتی ہے اور پھلوں کو مضر صحت بھی نہیں بناتی۔ اس گیس کو plant hormone بھی کہتے ہیں۔ بہت سارے پھل قدرتی طریقے سے پکنے کے عمل کے دوران Ethylene gas خارج بھی کرتے ہیں۔ کیلشیم کاربائیڈ کی مقدار چونکہ نامعلوم ہوتی ہے اور اس کو اندازے سے کاغذ میں لپیٹ کر آموں کے درمیان رکھ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے پیدا ہونے والی گیس کی مقدار بھی نامعلوم ہی ہوتی ہے اور یہ زیادہ خطرناک عمل ہے۔

CaC2 کے نتیجے میں پیدا ہونے والی Acetylene gas بھی Ethylene gas کی طرح کام کرتی ہے اور پھلوں کو پکنے میں مدد دیتی ہے لیکن اس میں موجود arsenic اور phosphorous کے ذرات صحت مند پھل کو زہریلا کردیتے ہیں۔ CaC2 کی مدد سے آم پکانے کے طریقے پر بہت سے ممالک میں پابندی ہے اور اس عمل کو غیر قانونی تصور کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی متعلقہ حکام اور صحت کے حوالے سے کام کرنے والے اداروں کو اس پر سخت ایکشن لینا چاہیے اور اس طریقے سے پھلوں کو پکانے کے عمل پر پابندی عائد کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے پاکستان کی تمام منڈیوں اور گوداموں میں جہاں اس طریقے سے پھلوں کو پکایا جاتا ہے، مانیٹرنگ کرنی چاہیے اور ساتھ ساتھ آگاہی کے پروگرام بھی ترتیب دینے چاہئیں اور اس کے فوڈ ایکسپرٹ کی مدد سے متبادل طریقوں کے بارے میں آگاہی دینی چاہیے تاکہ عوام الناس کی صحت کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔

کیلشیم کاربائیڈ سے نکلنے والی Acetalyne gas انسان کے nervous system, پر برے اثرات مرتب کرتی ہے جو سر درد، غنودگی اور موڈ ڈسٹربنس غفلت، یادداشت کا کھو جانا، ذہنی انتشار، دماغی جلندر اور مرگی کا باعث بن سکتی ہے۔

کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے آم پکانے کے غیر قانونی عمل پر کئی ملکوں میں پابندی ہے

مصنوعی طریقہ سے پھلوں کو پکانے کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے جس کا تذکرہ نہ کرنا آم کے کاروبار سے منسلک فارمز کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ قدرتی طریقے سے آم پکانے سے تاجروں اور فارمز کو نقصان ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ موسمی اثرات ہیں۔ کیونکہ اگر آم کو درختوں پر ہی پکنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو تیز ہوا اور آندھی کی وجہ سے آم درختوں سے گر کر ضائع ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے فارمز کو نقصان ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے عام طور پر کیلشیم کاربائیڈ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس نقصان سے بچنے کے لیے Ethylene گیس کی مدد سے پکانے والے چیمبر کا ہونا ضروری ہے تاکہ کنٹرولڈ ماحول اور محفوظ طریقے سے آموں کو پکایا جاسکے۔

کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے آم کے علاوہ دیگر پھل بھی پکائے جاتے ہیں۔ جن میں خوبانی، کیلا، جاپانی پھل، چیکو اور کچھ دیگر پھل بھی شامل ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح پاکستان میں بھی پھل پکانے والے چیمبر لگانے چاہئیں جن میں کنٹرولڈ ethylene گیس کی مدد سے پھلوں کو پکایا جاسکے۔

ایسے کیمیکل کے مسلسل استعمال سے انسانی نظام انہضام

digestive system کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس کے نتیجے میں پیچش، یرقان اور جگر سے متعلق بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ کاربائیڈ کے آزاد ریڈیکلز Free radicals انسانی عمر کو گھٹانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں کسی بھی شخص کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دل کی بیماریاں، فالج اور کینسر جیسی خطرناک بیماریاں ہونے کا خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

محفوظ طریقے سے پھل پکانے کے لیے چیمبر لگانے چاہئیں جن میں ایتھلین گیس سے آم، چیکو، خوبانی، کیلا اور جاپانی پھل پکائے جا سکتے ہیں

کچھ کیسوں میں کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے پکے ہوئے آم کی صرف اوپری جلد ہی اپنا رنگ تبدیل کرتی ہے لیکن اندرونی طور پر آم مکمل طور پر ہرے اور کچے ہی رہتے ہیں۔ ایسے پھلوں کو مزید پکانے کے لیے مزید کیلشیم کاربائیڈ استعمال کیا جاتا ہے جو پھل کو بے ذائقہ، غیر صحت مند اور ممکنہ طور پر زہریلا بنا دیتا ہے۔ بہت ساری گودا Pulp اور جوس بنانے والی کمپنیاں اسی طریقے سے پکے ہوئے پھلوں کو استعمال کر کے گودا Pulp بناتی ہیں اور اسی گودا Pulp سے جوس کے ڈبے تیار کر کے مارکیٹ میں فروخت کر دیتی ہیں۔ جن میں بھی آرسینک اور فاسفورس کے ذرات شامل ہوتے ہیں اور وہ بھی صحت کے لیے مضر ثابت ہوسکتے ہیں۔

قدرتی طریقہ سے پکے ہوئے آم میں غذایت مصنوعی طریقے سے پکے ہوئے آم کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کس طرح معلوم ہو کہ بازار میں فروخت ہونے والے آم (CaC2 کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے پکے ہوئے ہیں یا قدرتی طریقے سے؟ ہم یہاں اپنے قارئین کی خدمت میں نہایت آسان سا طریقہ بیان کر دیتے ہیں جس کی مدد سے کوئی بھی عام شخص بآسانی معلوم کرسکتا ہے کہ جو آم وہ خریدنے لگا ہے وہ کس طریقے سے پکے ہوئے ہیں۔

۱۔ اگر پکنے والا آم یکساں رنگت والا ہے یعنی وہ آم پورے طور پر یکساں رنگ لیے ہوئے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ آم کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے پکایا گیا ہے۔

۲۔ کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے پکے ہوئے آم پر ۲ر سے ۳ر دن کے بعد کالے دھبے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ کو کالے دھبے والے آم پکتے ہوئے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ کیلشیم کاربائیڈ کی مدد سے پکے ہوئے ہوسکتے ہیں۔

۳۔ قدرتی طریقے سے پکنے والے آم کا کچھ حصہ ہرا اور کچھ حصہ رنگ دار ہوتا ہے۔ یہ مکمل طور پر یکساں رنگت والے نہیں ہوتے۔

احتیاطی تدبیر

چونکہ قدرتی اور محفوظ طریقے سے پکے ہوئے آم تلاش کرنا ذرا مشکل کام ہے، لہٰذا آم کے شوقین اور دلدادہ افراد کو چاہیے کہ وہ خود ہی درج ذیل احتیاطی تدابیر اختیار کرلیں تاکہ صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ کم سے کم ہو۔

۱۔ تمام پھل خاص طور پر آم جو کیلشیم کاربائیڈ کے عمل سے پکائے جاتے ہیں استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھولیں اور چند منٹ تک ان کو نلکے یا ٹونٹی کے نیچے پڑا رہنے دیں تاکہ تمام خطرناک کیمیائی اجزاء سے کسی حد تک پاک ہوجائیں۔

۲۔ ایسے آم خریدنے سے گریز کریں جو اپنے وقت سے پہلے ہی مارکیٹ میں بکنے کے لیے موجود ہوں۔

۳۔ آم کھانے سے پہلے مندرجہ بالا طریقے سے دھو کر ٹکڑوں میں کاٹ کر کھائیں نہ کہ ثابت ہی۔

پھلوں کا بادشاہ

آم

خون صاف کرنے والا سب سے بہتر پھل

آم میں پایا جانے والا کیمیکل عنصر پولی فینول کئی قسم کے کینسر اور ٹیومرز میں فائدہ مند ہے

حکیم قاضی ایم اے خالد

آم گرمیوں کا سب سے مقبول پھل ہے اور دنیا بھر میں دوسرے پھلوں سے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ آم میں نشاستہ اور روغنی اجزا بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آم میں حیاتین (اے، بی)، فاسفورس، کیلشیم، فولاد اور پوٹاشیم کے علاوہ گلوکوز بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ آم غذائیت بخش پھل ہے۔ یہ جسمانی کمزوری کو ختم کرتا، خون پیدا کرتا اور جسم کو فربہ کرتا ہے۔ آم میں کیلشیم کی موجودگی ہڈیوں کیلئے مفید ہے۔ آم جگر، دل، دماغ، ہڈیوں اور پٹھوں کو سخت گرمی سے محفوظ رکھتا ہے۔ آم بچوں کو خصوصی طور پر کھلانا چاہیے۔ آم کھانسی اور دمے کے مریضوں کیلئے بھی بہترین ہے۔ یہ حافظے کو تقویت دیتا ہے اس لیے دماغی کمزوری والے لوگوں کو آم کا استعمال خاص طور پر کرنا چاہیے۔ آم کی مسواک دانتوں کی صفائی کے لیے مفید ہے۔ آم میں موجود قدرتی اجزا دل کے امراض، کینسر اور جلدی بیماریوں سے حفاظت کا نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ اس میں موجود فولاد جلد کی تروتازگی اور دلکشی میں اضافے کا باعث بنتا ہے جبکہ پوٹاشیم کی بڑی تعداد بلڈ پریشر کنٹرول کرتی ہے۔ گردے کی پتھری سے حفاظت کے لیے بھی آم کا استعمال نہایت مفید ہے۔

حالیہ جدید تحقیقات کے مطابق آم بریسٹ اور کولون کے سرطان سے محفوظ رکھنے کیلئے ایک اہم دوا ہے۔ آم کے شوقین لوگوں میں اس سرطان کی شرح نمایاں طور پر کم دیکھی گئی ہے۔ دنیائے طب میں آم اور صحت کے درمیان تعلق پر ہونے والی پہلی طبی تحقیق کرنے والی برلن کی معروف ڈاکٹر سواسانی ٹیل کوٹ اور ان کے شوہر ڈاکٹر سیٹوٹیل کوٹ نے آم کے گودے، جوس، چھلکے، گٹھلی کو کینسر کے خلاف قوتِ مدافعت فراہم کرتے ہوئے نوٹ کیا۔

انھوں نے اپنی تحقیقی رپورٹ میں لکھا ہے کہ آم کھانے والے افراد کے خون میں زہریلے مادوں کی شرح صرف ۱۰ فیصد تک تھی جبکہ آم نہ کھانے والے لوگوں کے جسموں میں شرح ۳۵ر سے ۴۰ر فیصد تک نوٹ کی گئی۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آم سپر فوڈ کہلا سکتا ہے۔ تحقیق کے دوران جسم سے زہریلے مادے اور کینسر کے سیل ختم کرنے کے لیے بلیوبیری، آم، پائن ایپل سمیت دیگر پھلوں پر تجربات کیے گئے جن میں آم سب سے زیادہ

سود مند ثابت ہوا۔ تحقیقی رپورٹ کے مطابق انگوروں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ سب سے بہتر خون صاف کرنے والا پھل ہے اور یہ ہے بھی درست مگر آم نے اس پر بھی سبقت حاصل کرلی ہے۔ ماہرینِ طب نے اس تحقیق سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ہے کہ آم کو روزمرہ خوراک بنانے کے لیے زرعی سطح پر نئے اقدامات اٹھانے چاہئیں۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ آم میں پائے جانے والے کیمیکل عنصر پولی فینول سے کولون، بریسٹ، پھیپھڑوں اور ہڈیوں کے گودے کے سرطان اور پروسٹیٹ کینسر کے ٹیومرز کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہ عنصر عام طور پر پودوں میں پایا جاتا ہے مگر سب سے بہتر اور اعلیٰ کوالٹی کا حامل یہ عنصر آم میں ہی ملتا ہے۔

کچے آم (کیری) بھی صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔ کچے آم میں وٹامن بی ون اور بی ٹو پکے ہوئے آم کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ نیاسین کی قابلِ ذکر مقدار بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ شدید گرمی اور لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے کچے آم کو آگ میں بھون کر اس کا نرم گودا شکر اور پانی میں ملا کر شربت کے طور پر استعمال کرنے سے گرمی کے اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ کیری پر نمک لگا کر کھانے سے پیاس کی شدت کم ہو جاتی جبکہ پسینے کی وجہ سے جسم میں ہونے والی نمک کی کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔ کیری میں موجود وٹامن سی خون کی نالیوں کو زیادہ لچکدار بناتا اور خون کے خلیات کی تشکیل میں بھی مددگار ہوتا ہے۔ غذا میں موجود آئرن کو جسم میں جذب کرنے میں بھی یہ وٹامن معاونت کرتا اور جریانِ خون روکتا ہے۔ کچے آم میں تپ دق، انیمیا اور پیچش سے بچاؤ کے لیے جسم کی مزاحمتی صلاحیت کو طاقتور بنانے کی قوت بھی پائی جاتی ہے۔ کیری میں جو تُرش تیزابی مادے ہوتے ہیں وہ صفرا کے اخراج کو بڑھا دیتے اور آنتوں کے زخموں کو مندمل کرنے میں اینٹی سپٹک کے طور پر کام کرتے ہیں۔ کھٹے کچے آم جگر کو صحت مند بناتے ہیں۔ طبیب حضرات صفرادی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے کیری کی قاشوں کو شہد اور کالی مرچ کے ساتھ کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کچے آموں کو آنکھوں کے مرض رتوندیا شب کوری (جس میں رات کے وقت دیکھنے میں دشواری ہوتی ہے) میں بھی مفید پایا گیا ہے۔

آم کے پتے، چھال، گوند، پھل اور تخم سب دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ آم کے پرانے اچار کا تیل گنج کے مقام پر لگانے سے بالچر کو فائدہ ہوگا۔ آم کے درخت کی پتلی ڈالی کی لکڑی سے روزانہ مسواک کرنے سے منہ کی بدبو جاتی رہے گی۔ خشک آم کے بور کا سفوف روزانہ نہار منہ چینی کے ساتھ استعمال کرنا مرضِ جریان میں مفید ہے۔ جن لوگوں کو پیشاب رکنے کی شکایت ہو، آم کی جڑ کا چھلکا برگ شیشم دس دس گرام ایک کلو پانی میں جوش دیں۔ جب پانی تیسرا حصہ رہ جائے تو ٹھنڈا کرکے چینی ملا کر پی لیں، پیشاب کھل کر آئے گا۔ ذیابیطس کے مرض میں آم کے پتے جو خود بخود جھڑ کر گر جائیں، سائے میں خشک کرکے سفوف بنا لیں۔ صبح و شام دو دو گرام پانی سے استعمال کرنے سے چند دنوں میں فائدہ ہوتا ہے۔ نکسیر کی صورت میں آم کے پھولوں کو سائے میں خشک کرکے سفوف بنالیں اور بطور نسوار ناک میں لینے سے خون بند ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے بال سفید ہوں وہ آم کے پتے اور شاخیں خشک کرکے سفوف بنا لیں۔ روزانہ ۳ گرام یہ سفوف استعمال کیا کریں۔ کھانسی، دمہ اور سینے کے امراض میں مبتلا لوگ آم کے نرم تازہ پتوں کا جوشاندہ، ارنڈ کے درخت کی چھال سیاہ زیرے کے سفوف کے ساتھ استعمال کریں۔ آم کی چھال قابض ہوتی اور اندرونی جھلیوں پر نمایاں اثر کرتی ہے، اس لیے سیلان الرحم (لیکوریا) آنتوں اور رحم کی تکالیف، پیچش و خونی بواسیر کے لیے بہترین دوا خیال کی جاتی ہے۔ ان امراض میں آم کے درخت کی چھال کا سفوف یا تازہ چھال کا رس نکال کر دیا جاتا ہے۔ آم کی گٹھلی کی گری قابض ہوتی ہے چونکہ اس میں بکثرت گیلک ایسڈ ہوتا ہے اس لیے کثرتِ حیض، پرانی پیچش، اسہال، بواسیر اور لیکوریا میں مفید ہے۔

آم کی مختلف اقسام

یوں تو آم کی بے شمار اقسام آچکی ہیں مگر پاکستان میں بکثرت پیدا ہونے والی اقسام درج ذیل ہیں:

دُسہری:

اس کی شکل لمبوتری، چھلکا خوبانی کی رنگت جیسا باریک اور گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گودا گہرا زرد، نرم، ذائقے دار اور شیریں ہوتا ہے۔

چونسا:

یہ آم قدرے لمبا، چھلکا درمیانی موٹائی والا ملائم اور رنگت پیلی ہوتی ہے۔ اس کا گودا گہرا زرد، نہایت خوشبودار اور شیریں ہوتا ہے۔

اس کی گٹھلی پتلی لمبوتری، سائز بڑا اور ریشہ کم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ملیح آباد (بھارت) کے قریبی قصبہ چونسا سے ہوئی۔

انور رٹول:

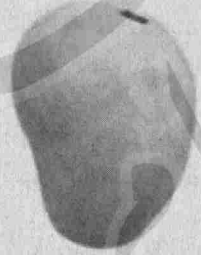

اس کی شکل بیضہ نما اور سائز درمیانہ ہوتا ہے۔ چھلکا درمیانہ، چکنا اور سبزی مائل زرد ہوتا ہے۔ گودا بے ریشہ، ٹھوس، سرخی مائل زرد، نہایت شیریں، خوشبودار اور رس درمیانہ ہوتا ہے۔

اس کی گٹھلی درمیانی، بیضوی اور نرم ریشے سے ڈھکی ہوتی ہے۔ اس قسم کی ابتدا میرٹھ (بھارت) کے قریب قصبہ رٹول سے ہوئی۔

لنگڑا:

یہ آم بیضوی لمبوترا ہوتا ہے۔ اس کا چھلکا چکنا بے حد پتلا اور نفیس گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گودا سرخی مائل زرد، ملائم، شیریں اور رس دار ہوتا ہے۔

فجری:

یہ آم بیضوی لمبوترا ہوتا ہے۔ فجری کا چھلکا زردی مائل سطح برائے نام کھردری، چھلکا موٹا اور نفیس، گودے کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ گودا زردی مائل سرخ، خوش ذائقہ، رس دار اور ریشہ برائے نام ہوتا ہے۔ اس کی گٹھلی لمبوتری موٹی اور ریشے دار ہوتی ہے۔

سندھڑی:

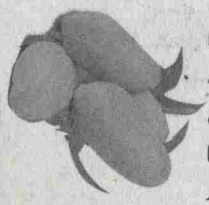

آم بیضوی اور لمبوترا ہوتا ہے۔ اس کا سائز بڑا، چھلکا زرد، چکنا باریک گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گودا شریں، رس دار اور گٹھلی لمبی اور موٹی ہوتی ہے۔ اصلاً مدراس کا آم ہے۔

گولا:

یہ شکل میں گول ہوتا ہے۔ سائز درمیانہ، چھلکا گہرا نارنجی اور پتلا ہوتا ہے۔ گودا پیلا ہلکا ریشے دار اور رسیلا ہوتا ہے۔ گٹھلی بڑی ہوتی ہے۔

مالدا:

یہ آم سائز میں بہت بڑا ہوتا مگر گٹھلی انتہائی چھوٹی ہوتی ہے۔ چھلکا پیلا اور پتلا ہوتا ہے۔

نیلم:

اس آم کا سائز درمیانہ اور چھلکا درمیانہ، موٹا اور پیلے رنگ کا چمکتا ہوا ہوتا ہے۔

فضلی:

یہ بہت بڑے سائز کا آم ہوتا ہے۔ ڈیڑھ سے دو کلو تک کے وزن کا بھی دیکھا گیا ہے۔ بیرونی چھلکا سبز رنگ کا اور اندرونی گودا پیلا، شیریں ہوتا ہے۔

نیا سلسلہ

زندگی کے دلچسپ اور یادگار واقعات سے انتخاب

ایک بار ایسا ہوا...

آپ بھی اپنی زندگی کا کوئی خوبصورت، متاثر کن، سبق آموز یا حیرت انگیز واقعہ لکھ کر بھیج سکتے ہیں

''ایک بار ایسا ہوا'' جی ہاں یہی نام ہے ایک نئے سلسلے کا جو اِس ماہ سے شروع کرنے کا حکم ملا ہے۔ مدیرِ محترم کا فون آیا کہ اس کالم میں جان لڑا دیں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ایسے واقعات حاصل کریں جنھیں پڑھ کر نہ صرف پڑھنے والوں کی دلچسپی میں اضافہ ہو، بلکہ کسی نہ کسی حوالے سے سیکھنے اور جاننے کا موقع بھی ملے۔ کہیں کسی مسئلے کا حل معلوم ہوگا اور کہیں دُھندلا راستہ واضح ہوگا

فریدہ خانم

علم سے ایک قطرہ

ڈاکٹر شگفتہ نقوی شاعرہ/ مصنفہ/ سفرنامہ نگار آسٹریلیا

مانگا ہے تُم نے کیا یہ مجھ کو خبر نہیں
میں نے تو اپنے رب کی ملاقات مانگ لی

میں آپ کو جو واقعہ سنانے لگی ہوں، یہ میری زندگی کا سب سے یادگار واقعہ ہے۔ جب میں عمرے پر جانے لگی، تو میرے سب جاننے والوں نے کہا کہ خانہ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو آپ جو بھی دعا مانگیں تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ جب ہم باب عبدالعزیز سے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے، تو میرے دل میں عجیب سا شوق، بے اختیاری اور اضطراب تھا، میں نے اُس وقت تک نظر نہ اُٹھائی، جب تک برآمدے سے گزر نہ گئے۔ ہم صحن میں داخل ہوگئے اور میں اپنے خیالات جمع کر رہی تھی کہ میں نے کیا مانگنا ہے۔ جب میری پلکیں اُوپر اٹھیں تو اچانک خانہ کعبہ سامنے تھا۔ مجھے بالکل ایسا لگا کہ میں منجمد ہوگئی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اچانک اُس وقت یہ خیال الفاظ بن کر میرے لبوں پر آگیا ''اے میرے رب! وہ جو بابِ علم ہیں، اُن کے علم میں سے مجھے ایک قطرہ عطا فرما'' یہ ۱۹۹۲ء کا واقعہ ہے۔ میں کالج کے زمانے میں لکھتی تھی اور میگزین ایڈیٹر تھی۔ پھر میڈیکل کی مصروفیات کی وجہ سے لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا۔ اِس دُعا کے بعد میں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا تو میری ۹۶ء میں پہلی کتاب شائع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا کو اس طرح قبول کیا کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے پھر کہیں دم نہ لیا اور ۵/ میگزینز میں باقاعدہ لکھنے کے ساتھ ساتھ میری اب تک الحمدللہ ۱۵/ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

زندگی کا پہلا انعام

میں اُردو ڈائجسٹ سے وابستہ ایک چھوٹا سا واقعہ مزید سنانا چاہوں گی۔ ۱۹۶۸ء میں اُردو ڈائجسٹ میں کسی نے ایک مضمون لکھا ''بیوی کا خانہ خراب کیجیے۔''

اِسے پڑھ کر میں نے ''شوہر کا خانہ خراب کیجیے'' مضمون لکھ کر بھیجا، جب وہ شائع ہوا تو ڈاکٹر اعجاز قریشی نے اتنا پسند کیا کہ مجھے اُس دور میں ۵۰/ روپے کا چیک بطور انعام بھیجا۔ یہ میری زندگی کا سب سے پہلا انعام تھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اتنی چھوٹی سی لڑکی نے لکھا۔ میرے بہن بھائیوں نے انعام کی خوشی کو باقاعدہ منایا۔ وہ خوشی آج تک میرے ساتھ ہے۔

ایک بچی جو مجھے آزمانے آئی

فرزانہ چیمہ، شاعرہ/ ادیبہ/ ڈپٹی چیف لائبریرین
سینئر آف ساؤتھ ایشین سٹڈیز پنجاب یونیورسٹی

دوسروں کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ اللہ نے ہمیشہ سے ہی دل میں ڈال رکھا ہے اور ''دوسروں کے لیے جیو'' ایک نصب العین سا بن گیا ہے۔ ایک اچھی سوچ کا دل میں آنا یا کسی ضرورت مند کی کوئی خواہش پوری کرنا یا اس سوچ یا کسی کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا، یہ سب کچھ کرنے کے بعد دل کو جو سکون ملتا ہے، اس کا کوئی مول نہیں اور آخرت میں ان شاء اللہ العزیز اجر کا ملنا ایک الگ فائدہ، گویا دوسروں کے

پہلے فیچر نے زندگی کا رُخ بدل دیا

انعام الحسن کاشمیری شاعر/ ادیب/ صحافی / ڈائریکٹر کشمیر سنٹر لاہور

میری زندگی کے یادگار واقعہ کا تعلق میری ''اردو ڈائجسٹ'' کی ملازمت سے ہی ہے۔ یہ فروری ۲۰۰۵ء کی بات ہے، میں نیا نیا اُردو ڈائجسٹ کے ادارتی عملے میں شامل ہوا تھا۔ میری ذمے داریوں میں مضامین کی ادارت، لائبریری کے لیے نئی کتب کی خریداری اور ہر ماہ ایک افسانہ تحریر کرنا تھا۔ اس دوران بسنت کی ڈور سے بھنڈارہ سنٹر، اچھرہ، لاہور کے باہر لگا ٹرانسفارمر پھٹنے سے سیکڑوں دکانیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ نیز ایک مقام پر ڈور پھرنے سے میری پیشانی بھی زخمی ہوگئی تھی۔ ہسپتال میں ڈاکٹر سے مرہم پٹی کراتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں اس خیال نے جنم لیا کہ بھنڈارہ سنٹر جلنے کی وجوہات کا کھوج لگایا جائے کہ محض ڈور سے اتنی بڑی تباہی کیسے ممکن ہو سکی اور پھر پتنگ بازی سے ہونے والے نقصانات منظرِ عام پر لائے جائیں۔ اگلے روز میں نے اس حوالے سے سید عاصم محمود سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ اس موضوع پر پہلے ہی بہت زیادہ لکھا جا چکا ہے، مزید لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن میرے ذہن میں جو کچھ تھا، اس کے تحت میں نے دفتری اوقاتِ کار کے بعد فیچر کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دنوں بعد میرے ساتھیوں نے صدرِ مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کو اس بارے میں بتایا تو انھوں نے میری کاوش کو سراہا اور ہدایت کی کہ دفتری اوقات کے دوران ہی یہ کام کرو۔ اس سال کی بسنت سے بھنڈارہ سنٹر جلنے اور میرے زخمی ہونے کے واقعات نے میری زندگی کا رخ بدل کر اصل سمت متعیّن کر دی۔ چند دنوں بعد میں نے ایک شاندار فیچر تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ یہ فیچر مئی ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد قارئین کی طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ اس نوعیت کے مزید فیچر تیار کرائے جائیں۔ اب ادارے کی طرف سے فیچر لکھنے کی ذمے داری بھی سونپ دی گئی اور پھر اڑھائی برسوں کے دوران متعدد تحقیقی نوعیت کے منفرد فیچر لکھے۔ ہسپتالوں اور میڈیکل کالجوں کے حوالے سے میرے ایک فیچر پر اُردو ڈائجسٹ کا صحت نمبر بھی شائع ہوا۔ آج میں اردو ڈائجسٹ میں تو نہیں ہوں، پر وہاں سے شروع ہونے والا کامیابیوں کا سفر اب بھی جاری ہے۔

کام آنا دونوں جہانوں میں نفع کا سودا ہے۔

یہ یادگار واقعہ ان دنوں کا ہے جب میرے بچے عمر کے ابتدائی سالوں میں تھے۔ مجھے گھر میں معاونت کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش تھی۔ کسی ذریعے سے ایک دور افتادہ گاؤں کی ایک غریب خاتون سے رابطہ ہوا۔ خاتون نے بتایا کہ ''میری ایک بیٹی ہے، چھٹی کلاس میں پڑھتی ہے۔ اسے پڑھنے کا جنون ہے مگر کنبہ بڑا ہونے کی وجہ سے سکول کی فیس اور دوسرے اخراجات بڑی مشکل سے پورے کرتی ہوں۔ اگر تو وہ باجی میری اس بیٹی کو دس جماعتیں کروا کر اُستانی لگوا دیں تو میں اسے آپ کے ساتھ بھیج دوں گی۔ گھر میں کام بھی کرے گی اور اپنا سبق بھی یاد کر لیا کرے گی، بس اسے پڑھا دیں۔'' مجھے تو ایسے لوگ اللہ دے۔ جو علم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ چنانچہ بات ہوگئی۔ وہ بچی میرے پاس آگئی، میں نے اسی دن شام کو اسے بستہ کھول کر کتابیں دکھانے کا کہا اور کچھ پڑھا بھی دیا۔ یوں ہمارے دوطرفہ معاہدے پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ یہ لڑکی جس کا نام پروین تھا اور تہذیب و اخلاق کے جوہر سے مالا مال تھی۔

ہمارے ہاں آنے کے ایک ہفتے بعد اس نے گھر جانے کی خواہش کی۔ میں حیران رہ گئی کہ اچھا بھلا اس کا دل لگ گیا تھا، اب کیا اُفتاد آن پڑی، جو گھر جانے کا کہہ رہی ہے۔ پوچھنے پر کہنے لگی ''باجی! میں گاؤں جا کر سکول سے پانچویں جماعت کا سرٹیفکیٹ لے آؤں اور اپنا نام خارج کروا آؤں۔''

''تو کیا پہلے یہ کام کر کے نہیں آئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں باجی! پہلے تو صرف آپ کو آزمانے کے لیے آئی تھی کہ بھلا آپ مجھے پڑھاتی بھی ہیں یا محض گھر کے کاموں میں ہی لگائے رکھیں گی۔ دراصل پہلے بھی ایک دو جگہ مجھے امی نے بھیجا تھا مگر اُن لوگوں نے مجھے کولہو کا بیل بنا لیا، کتاب قلم کی باری ہی نہیں آنے دی۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا، جس نے مجھے اس آزمائش میں کامیاب رکھا۔

خیر وہ گاؤں جا کر سرٹیفکیٹ لے آئی، یوں میرے پاس گھر میں رہ کر امتحان کی تیاری کرنے لگی، ساتھ ہی ساتھ میرے گھر کو یوں سنبھالا، میرے بچوں کے ساتھ اتنا پیار کیا کہ کوئی سگی بہن بھی کیا کرے گی۔ میٹرک تک اسے میں نے گھر میں پڑھایا۔ صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے اسے سبق دے جاتی۔ سہ پہر اور رات کو جب بھی وقت ملتا، اسے پڑھاتی۔ اس کا سالانہ امتحان قریبی ہائی سکول میں ہیڈ مسٹرس صاحبہ کی اجازت سے دلواتی رہی۔ میٹرک کا بورڈ کا امتحان دیا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی مرتبہ ہیڈ مسٹریس سخت حیران ہوئیں کہ ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باہر کی بچی ہمارے بچوں کے ساتھ امتحان دے اور سٹاف اس کے پرچے چیک کریں، آخر کیوں؟''

''میڈم! صرف اس لیے کہ اس کے والدین یہ نہ سمجھ لیں کہ باجی خود ہی پرچے لیتی ہے، خود ہی پاس کر دیتی ہے، کیا معلوم اس کا تعلیمی معیار کیا ہے؟ ہو سکتا ہے گھر داری میں کچھ بھی نہ پڑھا ہو مگر خود ہی پاس کر چھوڑتی ہو۔ میڈم! میں خود اچھے انداز میں امتحان لے سکتی ہوں کہ پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کر رہی ہوں۔ اگر میں اِسے پڑھا سکتی ہوں تو امتحان لینا کیا مشکل ہے؟''

''مگر مسز انور! ایسا آج تک میں نے کیا نہیں۔''

''آپ صحیح کہہ رہی ہیں میڈم! مگر یقین جانیے علم حاصل کرنے کی رسیا ایسی کوئی بچی ہوتی تو آپ کے پاس آتی نا۔ اب یہ کیس آ گیا ہے تو انکار نہ کریں۔''

یوں میڈم نے مسکراتے ہوئے اجازت دے دی۔

میٹرک پرائیویٹ کرنے کے بعد اسے میں نے ایک کالج میں داخلہ لے دیا، تاکہ میری ذمے داری بھی تھوڑی کم ہو اور اسے بھی لڑکیوں میں رہ کر لطف آئے۔ سب بچے بھی اب سکول جانے لگے تھے، یوں گھر کو تالا لگا کر ہم سب اپنے اپنے میدانِ کار میں نکل جاتے۔ پروین کے پاس بھی ایک چابی ہوتی، وہ بچوں سے پہلے گھر آ کر ان کے کھانے پینے کا بخوبی انتظام کر دیتی۔ یوں دن رات کی بے حد محنت کے بعد اس نے ایف اے کر ہی لیا۔ پی ٹی سی میں بھی داخلہ لیا۔ پورا سال کالج جاتی رہی مگر پرائیویٹ کالج ہونے کے سبب کوئی ایسی رکاوٹ پڑی کہ وہ امتحان نہ دے سکی۔ بہر حال تعطیلاتِ گرما میں اسے صنعت زار میں سلائی کا کورس کروا دیا۔ گھر میں قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی کرتی رہی۔ یوں اپنے گھرانے سے الگ تھلگ اپنی ۵/ بہنوں سے منفرد ایک مہذب مسلمان تعلیم یافتہ لڑکی کے روپ میں وہ ڈھل گئی۔

پھر میں نے اسے کچھ عرصے کے لیے ایک سکول میں استانی بھی لگوا دیا تھا، یوں اس کی والدہ سے کیا ہوا معاہدہ کہ میری بیٹی دس جماعتیں پاس کر کے استانی لگ جائے۔ آبرومندانہ انداز سے پورا ہو گیا کہ ۱۰/ کے بجائے ۱۲/ جماعتیں کروا دیں۔

اس کی شادی میں بچوں سمیت میں نے شرکت کی تھی۔ اب بھی وہ میرے ہاں آتی ہیں، تو میں ایک بیٹی کی طرح اسے رخصت کرتی ہوں۔ آج وہ تہذیب و شائستگی اور علم و فہم کے موتی اپنے دامن میں ڈالے زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہے تو اس کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

میری خبر ''ونی'' کے خاتمے کا باعث بنی

انوار حسین حقی، صحافی/کالم نگار/آج نیوز رپورٹر

میں آپ کو اپنی صحافتی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سُناتا ہوں۔ جس شہر میں، میں نے آنکھ کھولی، بچپن گزارا اور اب زندگی کے روز و شب بسر کر رہا ہوں، اس کا نام میانوالی ہے۔ میانوالی کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں سدا سہاگن کا تصور اُبھرتا ہے، لیکن اس علاقے کی تہذیب و تمدن، معاشرت اور سماج پر نظر دوڑائی جائے تو یہ ایک ایسا پسماندہ و درماندہ علاقہ ہے، جس کا نہ کوئی سائیں ہے اور نہ کوئی والی ہے۔ ہمارے علاقے میں بابلی تہذیب کی طرح مختلف تنازعات کا حل یہ ہے کہ صلح کے بدلے ملزم پارٹی اپنی بیٹیوں اور قریبی دوشیزاؤں کے رشتے دوسری پارٹی کو کئی صدیوں سے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں یہاں کے علاقے ''ابا خیل'' کے مشہور مقدمہ قتل کی صلح کے دوران ایک ۱۷/ سالہ لڑکی کو ۸۰/ سالہ بوڑھے کے ہاتھ ''ونی'' کر دیا گیا۔ صلح کی اس تقریب میں علاقہ کی ممتاز سیاسی شخصیات شامل ہوئی تھیں، اس تقریب کی خبر اخبار میں ہم نے شائع کی، جس پر اُس وقت کے چیف جسٹس جناب جسٹس ریاض احمد نے از خود نوٹس لیتے ہوئے فوری طور پر ۱۷/ سالہ لڑکی کی رخصتی رکوائی اور اسی شام پولیس نے عدالتی احکامات کی روشنی میں ۸۰/ سالہ بوڑھے کو ۱۷/ سالہ لڑکی کو طلاق دینے پر مجبور کیا۔ اس طرح ایک ۱۷/ سالہ دوشیزہ ''ونی'' کی رسم سے محفوظ رہی، بلکہ چیف جسٹس نے صدیوں سے رائج اس غیر اخلاقی رسم کو غیر قانونی قرار دیا، جس پر پاکستان پینل کورٹ کی دفعات میں 310-A کا اضافہ کیا گیا، نتیجتاً ضلع میانوالی میں ۳۰/ سے زائد دوشیزائیں جن میں ۳/ سے ۱۰/ سال تک کی ۱۷/ معصوم اور کمسن بچیاں بھی شامل تھیں، ''ونی'' کی مکروہ رسم کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔ ان میں سلطان والی شرقی کی ۵/ چچازاد بہنیں بھی شامل تھیں۔ جنھیں ان کے والد اور چچا کے جرم کے بدلے ''ونی'' کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ ۲۴/ اگست ۲۰۰۱ء کی ''ونی'' سے متعلق میری خبر ۴۰۰/ سالہ غیر انسانی رسم کے خاتمے کا باعث بنی۔ یہ میری اور میرے ساتھیوں کی زندگی خصوصاً صحافتی زندگی کا یادگار واقعہ ہے۔

ناقابلِ یقین مہمان داری

فرح زیبا، سماجی کارکن/
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، رائے ونڈ

۳۰/ جولائی ۲۰۰۸ء کا دن میری زندگی کا یادگار ترین دن ہے۔ اس دن ہم ۴/ ٹرکوں پر امدادی سامان لے کر اپنی ڈائریکٹر مسز ممتاز امانت اور دیگر اساتذات کرام کے ہمراہ سوات کے IDP's (آئی ڈی پیز) کی بحالی کے لیے پشاور کے علاقہ صوابی کی طرف روانہ ہوئیں۔

اپنے سوات کے بے گھر لُٹے پٹے بھائیوں اور بہنوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے ہم نے ۱۵/ دن میں اپنے ادارہ تعلیم و تحقیق کے طلبہ اور طالبات کے ساتھ مل

۲۴۷

کر تقریباً ۱۰/ لاکھ روپے اکٹھے کیے تھے۔ پھر ہم سب نے ان پیسوں سے سامان خریدا اور ہمارا قافلہ اُن بہن بھائیوں کے لیے کھانے پینے کی اشیا اور تحائف لے کر چلا۔ ہمیں لوگوں نے خبردار کیا کہ راستے میں کچھ کھانا پینا مت، کیونکہ ٹوائلٹ کی سہولت میسر نہیں، نیز روزہ رکھنے کی عادت ڈالو کیونکہ اس علاقے میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا۔ سو ہم ذہنی طور پر تیار تھے کہ ہم نے ایک دن اور ایک رات بھوک پیاس برداشت کرنی ہے اور اپنے اُجڑے، لُٹے پٹے بھائی بہنوں میں محبت اور خلوص کی دولت دینی ہے۔

سوات کا سفر شروع کیا۔ سخت گرمی کے دن، اللہ اللہ، علی الصبح فجر کی نماز کے لیے رُکے تو ہماری ایک ساتھی نے ہماری نماز ختم ہونے سے پہلے پہلے انڈے اور پراٹھے مع چائے ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ہم نے آج کھانے کا ناغہ کرنا تھا۔ یااللہ! یہ کیا! صبح صبح اتنا پُرتکلف ناشتا!

وہ یہ اہتمام ہم سب کی خاطر اپنے گھر سے کر کے چلی تھی تاکہ ہمیں راستے میں دِقت نہ ہو، خیر ہم نے انعامِ غیبی سمجھتے ہوئے ناشتا تناول کیا اور صوابی کیمپ پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے ٹرکوں سے سامان اُتروا کر لدوانا شروع کیا تو وہاں ہمارے بیس کیمپ کے انچارج ڈاکٹر حارث رشید نے اپنے ملازم کو بھیجا کہ یونیورسٹی کی ٹیم کو فلاں خیمے میں لے آئیں۔ وہاں گئے تو ایک دفعہ پھر ناشتا ہمارا منتظر تھا۔ خیر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر کے ہم نے حسبِ ضرورت چائے پی اور اپنے کام میں جُت گئے۔ ہم نے چار اطراف آپس میں تقسیم کر کے کام شروع کیا۔ ایک ایک خیمے میں جا کر متعلقہ خاندان سے اظہارِ ہمدردی کر کے سامان دیتے رہے۔ نہ ہمیں تپتے سورج کی پروا تھی اور نہ اپنے پاؤں کے نیچے آگ اُگلتی زمین کی گرمی کا احساس تھا۔ اس عالمِ مدہوشی میں جذبۂ خدمت سے سرشار انسانیت کی خدمت کر رہے تھے اور ہمارے طلبہ و طالبات اور ملازمین بھی ساتھ تھے کہ اچانک ہمارے ایک ساتھی نے ہمیں بس میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہمیں نہیں پتا تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں بس میں جا بیٹھے اور سوچنے لگے کہ شاید کسی اور کیمپ میں جا کر خدمت کرنی ہے۔ بس رواں دواں تھی اور اچانک ایک بہت بڑے محل کے سامنے جا کر رُکی، دیکھا تو صوابی کے نواب جہانگیر ترکئی کا محل تھا اور نواب صاحب دروازے پر ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ خواتین زنانے حصے میں چلی گئیں اور مرد حضرات کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھوں کھانا پیش کیا۔ گھر کی خواتین نے ہماری بڑی عزت افزائی کی اور ہم ششدر کہ یااللہ! تیری قدرت۔

کہاں ہم بھوک اور پیاس کو برداشت کرتے ہوئے کام کرنے کا جذبہ لے کر آئے تھے اور کہاں تیری مہمان نوازی کہ ہمیں عام دنوں سے زیادہ عزت، محبت اور رزق عطا ہوا اور ہم اللہ کی اس مہمان داری پر اس کے حضور سجدہ ریز ہوگئے کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہماری عاجزانہ کوشش کو قبول کیا اور ہماری تھوڑی سی کوشش اور محنت جو ہم نے تیرے بندوں کی تکلیف دور کرنے کے لیے کی اس کی پذیرائی میں تو نے ہماری کس قدر مہمان نوازی کی۔

عبداللہ عزام کی بیگم سے ملاقات

نجمہ پروین نجمی، شاعرہ/افسانہ نگار/کالم نگار

ایک مرتبہ میں ذاتی کام کے لیے محترم قاضی حسین احمد کے گھر واقع پشاور گئی۔ اس شام وہاں شیخ عبداللہ عزام کی بیگم تشریف لائیں۔ ان سے ملنا اور انھیں روبرو دیکھنا میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا اور میں اس ملاقات کو ہی اپنی زندگی کا یادگار واقعہ قرار دیتی ہوں۔ اس عظیم خاتون کے میاں اور ان کے بیٹے جہادِ افغانستان میں شہید ہوئے۔ ایک ایسی خاتون جو مجاہد کی بیوی اور مجاہدوں کی ماں ہو، اس کے مقام و مرتبے کا اندازہ کسی بھی مسلمان کو ہو سکتا ہے۔

دو رنگ

۲/ شہر
۲/ تحریریں
۲/ زاویے

اجمیر سے قرطبہ تک

نوید اسلام صدیقی

پہلا رنگ

قرطبہ کا محل "مدینۃ الزہرہ"

بادشاہ

اپنی شاہی چمک سے دنیا کو خیرہ کرنا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا دنیا جب تک سلامت رہے اس کی بادشاہت ، دولت، ہنراور طاقت کی چمک بھی قائم رہے۔ اس کے بزرگ وادی الکبیر کے کناروں پر دمشق کی مسجد اُمیہ جیسی مسجد بنا چکے تھے اور اس مسجد میں اذان اور نماز بھی ہوتی تھی، قرطبہ کی گلیاں بھی پکی ہوچکی تھیں اور ان گلیوں میں ''لیمپ پوسٹ'' بھی لگ چکے تھے، شہر کا عملہ شام ہوتے ہی لیمپ جلا دیتا اور یوں پورا شہر بقعہ نور بن جاتا تھا۔ شہر کے کتب خانے بھی آباد تھے، مرکزی کتب خانے میں ڈیڑھ لاکھ کتابیں تھیں اور علم کے پیاسے ان کتابوں سے دن بھر سیراب ہوتے رہتے تھے اور قرطبہ کی انگور کی بیلیں اور زیتون کے درخت بھی سال میں کئی کئی بار پھل دیتے تھے لہٰذا بادشاہ کے پاس دنیا کو اپنی چمک سے متاثر کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ لیکن بادشاہ کی زندگی میں زہرہ آ گئی۔ زہرہ عیسائی تھی اور اس کا نام شاید کیتھرائن، ماریہ یا میڈیا تھا مگر بادشاہ کے عقد میں آئی تو بادشاہ نے زہرہ نام رکھ دیا۔ بادشاہ کو زہرہ نے اپنے حسن سے مسخر کر لیا تھا، بادشاہ اپنی ملکہ کے پلّو سے بندھ گیا اور ہمہ وقت اس کے پہلو میں بیٹھنے لگا۔ ملکہ مسجد کے سائے میں رہتی تھی، مسجد کا موذن منار پر چڑھ کر اذان دیتا تھا۔ مسجد کے معماروں نے اذان کا منار محل کے پہلو میں بنایا تھا تاکہ اذان بادشاہ کے کانوں تک پہنچ سکے۔ لیکن ملکہ کو یہ آواز پسند نہیں تھی وہ اس آواز سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ملکہ نے ایک دن بادشاہ سے لاڈ میں کہہ دیا ''کیا آپ میرے لیے ایک محل نہیں بنا سکتے ؟'' بادشاہ نے ملکہ کے سرخ ہونٹوں پر انگور کا دانہ رکھا، اسے دیر تک دیکھتا رہا اور پھر بولا ''جانِ سلطان..... میں تمھارے لیے ایسا محل بناؤں گا جس کے سامنے سارا قرطبہ بے جان، بے رنگ ہو جائے گا۔'' شاہ اٹھا، ملکہ کے ہونٹوں پر انگور کا دانہ اسی طرح پڑا رہا۔ وہ دربار میں آیا، وزراء کو طلب کیا اور قرطبہ شہر سے باہر دنیا کا سب سے بڑا محل بنانے کا حکم دے دیا۔ بادشاہ کا حکم تھا، چنانچہ قرطبہ سے ۵/کلومیٹر کے فاصلے پر محل بننا شروع ہوگیا۔

یہ اندلس کا مشہور بادشاہ سلطان عبدالرحمان ثالث تھا اور اس محل کا نام ''مدینۃ الزہرا'' تھا۔ بادشاہ نے ۹۱۲ء میں تخت سنبھالا اور ۹۶۱ء تک زندہ رہا۔ اس نے ۷۲/سال عمر پائی اور قریباً ۴۹/سال تک بادشاہ رہا۔ ان ۴۹/برسوں میں اس نے ۲۵/سال محل بنانے میں صرف کر دیے۔

محل ۴/میل لمبا اور ۳/میل چوڑا تھا۔ یہ عمارت ۱۰/ہزار معماروں نے بنائی تھی۔ ۵/ہزار اونٹ، گھوڑے، گدھے اور خچر روزانہ کام کرتے رہے۔ محل کے لیے سنگ مرمر، گرینائٹ اور اینٹیں فرانس، یونان، شام، ترکی اور مراکش سے منگوائی گئیں۔ محل کی چھتوں پر سونے اور چاندی کا کام ہوا۔ محل میں ۴/ہزار ۳۱۶/ستون اور برج تھے۔ محل پر ۲/کھرب روپے کے برابر رقم خرچ ہوئی۔ محل مکمل ہوا تو محل کی صفائی، نگہداشت اور حفاظت کے لیے ۱۳/ہزار ۷۵۰/ملازم رکھے گئے۔ محل کی بیرونی دیواروں کی حفاظت کے لیے ۱۳/ہزار ۳۸۲/غلام بھی تھے۔ ملکہ کی خدمت کے لیے ۶/ہزار انتہائی خوبصورت عورتیں رکھی گئیں۔ پورا محل باغوں اور فواروں میں گھرا ہوا تھا۔ فواروں کے لیے پانی دریا سے کھینچا جاتا تھا۔ سیکڑوں اونٹ دریا کا پانی کھینچتے تھے۔ یہ پانی پائپوں کے ذریعے محل تک آتا تھا، محل سے ۲/کلومیٹر بلندی پر پانی کے ٹینک بنائے گئے تھے، ان ٹینکوں میں پانی سٹور بھی ہوتا اور فلٹر بھی اور یہ صاف پانی بعدازاں خاص پریشر کے ذریعے چھوڑا جاتا تھا اور یہ محل میں پہنچ کر جلترنگ پیدا کر دیتا تھا۔ پورے محل کو سردیوں میں گرم پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ پانی گرم کرنے کے لیے خصوصی حمام بنائے گئے اور ہزاروں غلام ان حماموں کو گرم رکھتے تھے۔

شہر سے محل تک خصوصی سڑک بھی بنائی گئی تھی، اس سڑک پر شاہی گھوڑے چلتے تھے۔ یہ گھوڑے بادشاہ کے مہمانوں کی خدمت کے لیے دن رات تیار رہتی تھیں۔

بادشاہ کا خیال تھا اس نے اپنی چمک سے ایک ایسی عمارت تعمیر کرادی ہے جسے دنیا میں کبھی زوال نہیں آئے گا اور یہ محل اور اس کی ملکہ تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن صرف ۵۰/سال بعد، جی ہاں صرف ۵۰/سال بعد یہ محل دنیا کی نظروں سے غائب ہوگیا۔ قرطبہ پر حملہ آور نصرانیوں نے مدینۃ الزہرا پر حملہ کیا۔ غلام اور کنیزیں بھاگ گئیں، محافظ مارے گئے، محل پر قبضہ ہوگیا اور قابضین نے جی بھر کر محل لوٹا۔ چھتوں سے سونا اور چاندی اتار لی گئی۔ فرانس اور ترکی کا ماربل توڑ دیا گیا، دیواروں میں جڑے موتی نکال لیے گئے، مخملی خواب گاہوں کی مخمل پھاڑ دی گئی، فواروں کے دہانے توڑ دیے گئے۔ باغ اور لان اجاڑ دیے گئے اور فرنیچر کو آگ لگا دی گئی۔ بادشاہ کی چمک پہلے آگ بنی، پھر راکھ ہوئی، راکھ پر زمانوں کی گرد پڑی اور گرد نے بادشاہ کی چمک کو عبرت بنا دیا، یہ نادر الوقت محل مٹی کے اندر دفن ہوگیا۔

میں ۲۰۰۳ء میں پہلی بار مدینۃ الزہرا گیا۔ میں قرطبہ میں ۲/راتوں کے لیے ٹھہرا تھا۔ یہ مسجد قرطبہ کے سائے میں ہزار سال پرانا مکان تھا۔ مکان ہوٹل میں تبدیل ہوچکا تھا۔ کمروں میں اے سی اور روم سروس بھی تھی لیکن اس کی دیواروں، اس کی چھتوں، اس کی کھڑکیوں اور اس کے جھروکوں پر عہد رفتہ کی تمام تصویریں، تمام یادیں محفوظ تھیں۔ مکان مراکشی اسٹائل میں بنا ہوا تھا، دروازے کے اندر صحن تھا، صحن میں نیلے رنگ کی چھوٹی ٹائلیں لگی تھیں، ٹائیلوں کے درمیان اونچے درخت اور درختوں کے درمیان فوارے تھے، فواروں کے پاس بیٹھنے کے لیے بینچ پڑے تھے اور صحن کے چاروں اطراف تھے، یہ عمارتوں کا مراکشی اسٹائل ہے، مسلمان یہ اسٹائل طارق بن زیاد کے

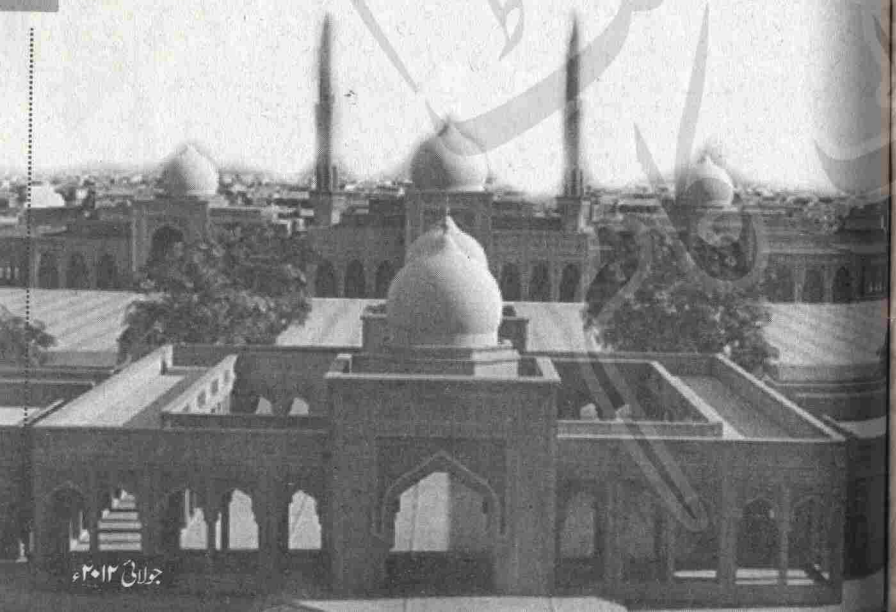

ساتھ مراکش سے لائے تھے۔ قرطبہ کے ہر گھر کا دروازہ لوہے کی گرل سے بنا ہے، آپ اس گرل سے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ دروازے کے بعد گھر کا صحن آتا ہے۔ صحن میں اونچے درخت، بیلیں اور پھولوں کے پودے دکھائی دیتے ہیں، ان پودوں کے درمیان فوارے ہوتے ہیں اور گھر کے تمام کمرے ان فواروں اور صحن کے اطراف میں اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ آپ کمرے کی کھڑکی کھولیں اور صحن اپنی خوشبو کے ساتھ کمرے میں آجاتا ہے۔

قرطبہ کے یہ قدیم گھر اب ہوٹل بن چکے ہیں۔ سیاح ہوٹل کے ہزار سال پرانے کمروں میں وقت کو لکڑی کی چھت پر دبے پاؤں چلتے محسوس کرتے ہیں۔ قرطبہ حقیقتاً ایک ''فین ٹسی'' ہے، آپ جب تک یہ فینٹسی دیکھ نہیں لیتے، آپ اس وقت تک اسے جان نہیں سکتے۔ میں دوسرے دن مدینۃ الزہرا چلا گیا، یہ کھنڈروں کی شطرنج تھی جس پر عبرت کے مہرے دائیں بائیں بکھرے پڑے تھے۔ میں مدینۃ الزہرا کے ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے گہرائی میں قرطبہ شہر تھا، شہر کے بیچ میں مسجد قرطبہ کے منار سر اٹھا کر کھڑے تھے، میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے مجھے بادشاہ کی اندھی چمک پر بیٹھ کر قرطبہ کی مسجد کے منار دیکھنے کی توفیق دی اور میں اس کے بعد ان تمام بادشاہوں کی عقل پر افسوس کرتا رہا جو دنیا کو اپنی وقتی چمک سے خیرہ کرنا چاہتے ہیں، جو خدا کی دی ہوئی خدائی کو فرعونیت بنا لیتے ہیں، جو لکڑی کی بے بس کرسی کو مضبوط سمجھ بیٹھتے ہیں، جو خود کو ایسی اینٹ سمجھ لیتے ہیں جس کے نکلنے سے عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے اور جو دوسرے انسانوں کو چمک دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم سب انسان ہیں اور اس بے بس دنیا میں ہم انسانوں سے بڑی بے بس مخلوق کوئی نہیں۔ یہ اللہ کا کرم، اللہ کی مہربانی ہے کہ ہم اس کی بنائی دنیا میں چند سال سستا لیتے ہیں ورنہ اللہ کے سامنے شاہ اور گدا دونوں بے چمک، بے بس ہوتے ہیں۔

(جاوید چودھری)

دوسرا رنگ

انڈیا: خواجہ معین الدینؒ کی درگاہ حضرت

خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ کو بھارت میں موجود تمام اولیاء کرام اور بزرگان دین کے مزارات میں سب سے زیادہ مقدم تصور کیا جاتا ہے۔ آپؒ کو سلطان الہند کا لقب بھی حاصل ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا تعلق آل نبی ﷺ سے ہے۔ آپ حضرت زین العابدینؒ کی اولاد سے ہیں۔ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زین العابدین کی اولاد ہجرت کر کے ایران آگئی۔ خواجہ صاحب کی پیدائش ایران میں ہوئی۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے تبلیغ اسلام کے لیے ایران سے ہندوستان کا سفر کیا۔ آپ نے کچھ عرصہ ملتان میں بھی قیام کیا پھر آپ لاہور آگئے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر آپ نے چلہ کشی کی۔ (حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے چلہ کی جگہ اب بھی داتا صاحبؒ کے مزار کے ساتھ موجود ہے) اس موقع پر آپ نے داتا صاحبؒ کے بارے میں تاریخی شعر کہا، جو زبان زد عام ہے ؎

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل ، کاملاں را رہنما

چند سال قبل مجھے بھی حضرت غریب نوازؒ کی درگاہ پر حاضری کا موقع ملا۔ آپؒ کی درگاہ روحانی اعتبار سے فیوض و انوار کا مرقع ہے لیکن اس کے گرد و نواح کا ماحول پراگندہ ہو چکا ہے۔ زائرین کے لیے سہولتوں کی خاصی کمی ہے۔ حکومت ہند یہاں کے انتظام و انصرام کی طرف اتنی توجہ نہیں دے رہی جتنی کہ ضرورت ہے۔ صفائی کا معیار اور زائرین کے لیے صاف ستھری رہائش کا انتظام اطمینان بخش نہیں ہے۔ درگاہ کے قرب و جوار میں سبھی عمارتیں اور دوکانیں مسلمانوں کی ہیں۔ صرف اجمیر شریف میں ساڑھے چار سو مسجدیں ہیں۔ آہستہ آہستہ بھارت کے ہندو مسلمانوں کی املاک خرید رہے اور اجمیر شریف میں ہندو مسلمانوں پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اس شہر کے کلچر پر بھی ہندو مت کو برتری حاصل ہو گئی ہے۔ درگاہ سے چند گز کے

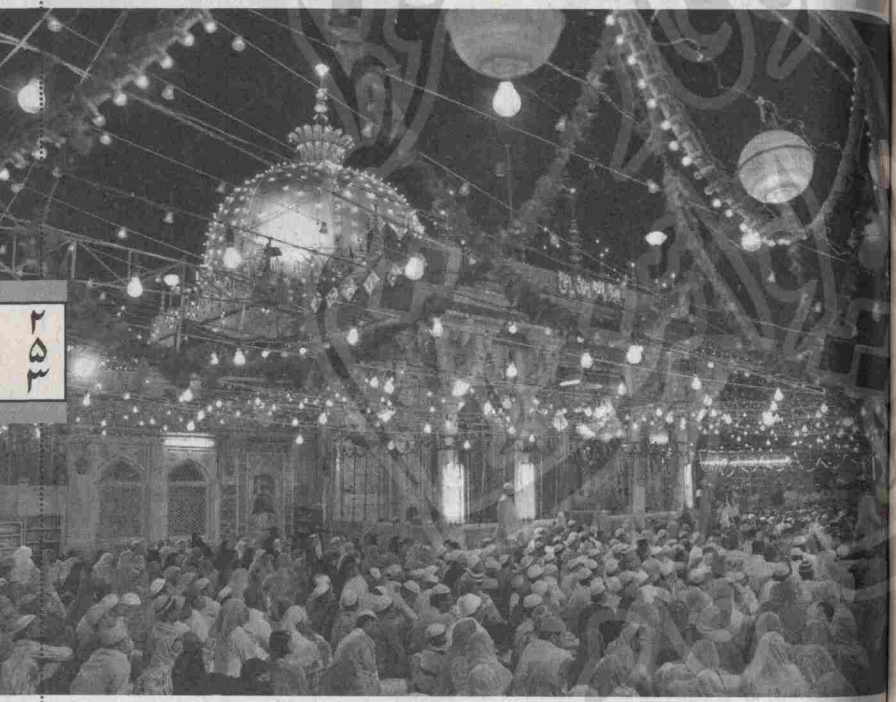

فاصلے پر ہندو مصلّی اور چماروں کے گھر ہیں۔ گھروں کے باہر ''پالتو سوروں'' کی ڈار نظر آتی ہے اور جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر ہیں۔

اجمیر شریف کی بنیاد راجہ جے پال چوہان نے گیارہویں صدی میں رکھی۔ پرتھوی راج چوہان بھی اسی شہر میں پیدا ہوا۔ پرتھوی راج کی موت بھی سلطان محمد غوری کی فوج سے لڑتے ہوئے اسی شہر میں ہوئی۔ گیارہویں صدی میں یہ شہر سلطان محمد غوری اور تیرہویں صدی میں تیمور کے قبضے میں رہا۔ اجمیر کا نام ملحقہ پہاڑی اجے میرو (AJAIMERO) کے نام سے موسوم ہے۔ اجے میرو کا مطلب ''ناقابل تسخیر'' ہے۔

اجمیر شریف ہندو اور مسلم، دونوں تہذیبوں کا نمائندہ ہے۔ شہر میں گھومتے ہوئے دونوں تہذیبوں کی تفریق اور امتزاج بیک وقت نظر آتا ہے۔ مسلمان چوڑی دار پاجامے اور کرتے میں ہیں تو ہندو مرد لنگی پہنے اور عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس ہیں تو مسلمان عورتیں شلوار قمیص اور چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ اجمیر کا شہر بیک وقت منفرد صحرائی، پہاڑی اور میدانی خصوصیت لیے ہوئے ہے۔

بھارت کی قدیم کتابوں رامائن، مہا بھارت اور پرناس میں بھی اجمیر شریف کا ذکر ہے۔ ان کتابوں میں اس شہر کو ''پشکر'' کے نام سے پکارا گیا ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ شہر حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیریؒ کی درگاہ کی وجہ سے محترم ہے تو ہندوؤں کے لیے یہ شہر پشکر جھیل کے ساتھ تعمیر کیے جانے والے منفرد ''برھامندر'' کی وجہ سے پوجا کا مرکز ہے۔ اجمیر شہر کے وسط میں ایک پر ہجوم گلی سے گزر کر درگاہ کا صدر دروازہ آتا ہے۔ یہ صدر دروازہ ریاست حیدر آباد کے نظام نے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر بنایا۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو اندرونی دروازہ آتا ہے۔ یہ دروازہ اکبر بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اس دروازے کے اوپر بالکونی میں دو بڑے ڈھول رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ڈھول اکبر بادشاہ نے قلعہ چتوڑ کی فتح کے وقت حاصل کیے تھے۔ ان ڈھولوں کو فتح کے نشان کے طور پر یہاں نصب کرایا۔ (اکبر نے چتوڑ کی فتح کے لیے یہاں منت مانی تھی) اسی دروازے کے اوپر فارسی میں چند شعر تحریر ہیں جن کا مطلب کچھ اس طرح ہے ''دل کی دنیا کی پہلی اینٹ یہاں رکھی جاتی ہے، لوح محفوظ پر جو نام لکھے ہیں، ان کی تصدیق یہاں ہوتی ہے، یہ خواجہؒ کا دربار ہے یہاں ادب اور احترام سے چلو، خواجہ صاحبؒ اولیاء اللہ کے درمیان ایسے ہیں جس طرح حضرت محمد ﷺ انبیائے کرامؑ کے درمیان ہیں۔''

اس دروازے سے اندر داخل ہوں تو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا مزار ہے۔ مزار کے اوپر سوا من سونے کا ایک تاج لگا ہوا ہے، متولی نے ہمیں بتایا کہ یہ تاج نواب رام پور نے عقیدت کے طور پر چڑھایا تھا۔ درگاہ میں داخل ہوں تو ۳ر مسجدیں نظر آتی ہیں۔ ایک مسجد اکبر بادشاہ نے دوسری شاہ جہاں نے بنوائی۔ اکبر بادشاہ کی مسجد سفید سنگ مرمر کی ہے۔ تیسری مسجد اورنگزیب نے تعمیر کروائی۔ ان مساجد میں زائرین کی سہولت کے لیے یکے بعد دیگرے باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

خواجہ غریب نوازؒ کا مزار زیارت کے لیے صبح نمازِ فجر کے بعد سے نمازِ عشا تک کھلا رہتا ہے۔ رات کو مزار کا اندرونی حصہ بند کر دیا جاتا ہے، تاہم بیرونی احاطے میں عبادات، نوافل اور قرأت قرآن پاک کا عمل جاری رہتا ہے۔ درگاہ کے احاطے میں مورسلی کے قدیم درخت لگے ہیں۔ مورسلی کا درخت بیر اور نمبولی (نیم کا پھل) کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس درخت پر خوشبودار پھول آتے ہیں جس سے ماحول مہک اٹھتا ہے۔ مزار کے احاطے میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ کا لگایا ہوا درخت بھی موجود ہے۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ایامِ عرس کے دوران اجمیر شریف کا شہر ایک مہمان خانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق عرس کے دنوں میں ۱۰ر لاکھ سے زائد افراد حاضری کے لیے یہاں آتے ہیں۔ بھارت کے مختلف حصوں سے اظہارِ عقیدت کے لیے لوگ پیدل آتے اور منتیں مرادیں مانگتے ہیں۔

(سرور منیر راؤ)

لمبے سفر کے بعد مسافر ہوائی اڈے میں داخل ہوتے ہوئے گر کر بے ہوش کیوں ہو جاتے ہیں؟

احتیاطی تدابیر

لمبا ہوائی سفر

اور وریدوں میں خون جمنے کا خوفناک خطرہ

جمے خون کے یہ ٹکڑے دل تک پہنچ گئے تو جان بھی لے سکتے ہیں

سلطان مسعود احمد

برطانیہ

میں جب آپ لمبے ہوائی سفر Long Haul Flight کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں، تو بعض ہوائی کمپنیاں ٹکٹ کے ساتھ ایک پرچہ Leaflet بھی دیتی ہیں، جس میں دورانِ سفر جسم کے اندر عموماً ٹانگوں کی گہرائی میں واقع وریدوں میں خون جمنے کے ممکنہ خطرات سے بچنے کے لیے ہدایات درج ہوتی ہیں۔ اسے غور سے پڑھ لیں یہ بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ ایسے ہی پرچے یا پمفلٹ آپ کو وہاں اپنے ڈاکٹر کی سرجری میں بھی اکثر نظر آتے ہیں۔ انگریزی میں اس شکایت کو Deep Vein Thrombosis کہتے ہیں۔ پوری دنیا میں اس تکلیف سے ہر سال ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ صرف امریکا میں سالانہ ساڑھے ۳ر سے ۶ر لاکھ لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ شکایت کسی بھی عمر کے فرد کو ہو سکتی ہے، مگر ۶۰ر سال سے زائد عمر کے لوگ عموماً اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ اکثر لمبے ہوائی سفر میں رہتے ہیں یا سفر کا سوچ رہے ہیں، تو ذیل میں درج ہدایات پر عمل کرتے ہوئے آپ اس خطرے کو بڑی حد تک ختم یا کم کر سکتے ہیں۔

آج کے جدید ہوائی جہاز بغیر رُکے پندرہ سولہ گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ دیر تک مسلسل پرواز کر سکتے ہیں۔ کراچی سے پی آئی اے کی ٹورانٹو، (کینیڈا) کی پرواز ۱۶ر گھنٹے کی ہے۔ اسی طرح کراچی، لاہور سے نیویارک کے لیے ۱۵ر گھنٹے کی پرواز ہے، گو کہ یہ راستے میں مانچسٹر میں رکتی ہے۔ جبکہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے برطانیہ کے ۴ر شہروں کے لیے پی آئی اے کی پروازیں ۷ر سے ۸ر گھنٹے کا وقت لیتی ہیں۔ اب اتنی دیر تک سیٹ پر بیٹھے رہنے سے ٹانگوں اور خاص طور پر پنڈلیوں کی گہری وریدوں میں خون کے جمنے Blood Clot کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ جمے ہوئے خون کا یہ ٹکڑا آہستہ آہستہ خون کی نالیوں میں سفر کرتے ہوئے جب دل میں پہنچتا ہے تو جان لیوا ہو سکتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی مسافر جب اپنی منزل پر پہنچ کر ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوتے ہیں، تو اچانک گر کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور اگر بروقت طبی امداد نہ ملے، تو موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ٹانگ کی وریدوں میں یہی خون کا جماؤ ہے۔ ایسا خطرہ سفر ختم ہونے کے دو، تین دن بعد تک بھی موجود رہتا ہے۔ اگر سفر کے اختتام کے دوسرے، تیسرے دن آپ کی ٹانگ خاص طور پر پنڈلی میں سوجن، درد ہو یا

ٹانگ سرخ اور ہاتھ لگانے سے گرم محسوس ہو رہی ہو تو فوراً اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ یہ تکلیف صرف ہوائی سفر تک ہی محدود نہیں، بلکہ کار کے لمبے سفر، آپریشن کے بعد بہت عرصے تک ایک ہی رخ لیٹے رہنے سے، زیادہ سگریٹ نوشی اور مٹاپے کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔

اب آیئے اُن احتیاطی تدابیر کی طرف جنھیں آپ ہوائی جہاز میں اختیار کرسکتے ہیں۔ دورانِ پرواز ہر ڈیڑھ گھنٹے بعد اپنی سیٹ سے اُٹھ کر چند منٹ کے لیے راہ داری AISLE میں چہل قدمی کریں۔ کچن میں جا کر چائے پانی کی فرمائش بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ بے حد مفید ثابت ہوتی ہے۔ مقصد ٹانگوں کو حرکت دینا ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنی سیٹ سے نہیں اٹھ سکتے، جیسے کہ مٹاپے یا کسی معذوری کی وجہ سے، یا ساتھ کا مسافر سو رہا ہو اور آپ اُسے جگانا نہیں چاہتے، تو ایسے میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگوں کو آگے پیچھے حرکت دیں اور پنڈلیوں کی مالش کریں۔ دورانِ پرواز وقفے وقفے سے پانی پیتے رہیں، کافی کم پییں اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ ویسے بھی آج کل اکثر جہازوں میں تمباکو نوشی ممنوع ہوتی ہے۔

ہوسکے تو سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ایک عدد پانی میں حل ہونے والی اسپرین لے لیں مگر ایسا اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے بعد کریں۔ کپڑے ڈھیلے پہنیں، پتلون کا بیلٹ اور بوٹوں کے تسمے ڈھیلے کردیں مگر بوٹ اُتاریں نہیں کیونکہ بعض خواتین اور حضرات کے پاؤں سفر کے دوران سُوج جاتے ہیں۔ ایسے میں اُتارے گئے جوتے آپ دوبارہ نہیں پہن سکیں گے۔ دیر تک ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر نہ بیٹھیں۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے پیروں کی انگلیوں کو اوپر نیچے حرکت دیں۔ ایسا کرتے ہوئے ایڑی فرش سے نہ اٹھنے پائے۔ اب پاؤں کی اُنگلیاں فرش سے نہ اُٹھنے پائیں اور ایڑی کو اوپر نیچے کریں۔

یہ چند بنیادی اور آسان احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے آپ خیریت سے منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔

تعلیم القرآن
عبدالرحمٰن صابر قرنی
ترجمہ قرآن سیکھنے کیلئے بہترین رہنما
رمضان المبارک کا خصوصی تحفہ، خود بھی استفادہ کیجئے دوسروں کو بھی دعوت دیجئے
⇦ لفظی وبامحاورہ ترجمہ مع گرامر ⇦ جامع تشریح (حواشی میں اور آخر میں رکوع وار)
⇦ فہرست مضامین ⇦ مکمل لغات القرآن (تعلیم القرآن لغت جلد چہارم)
تعلیم القرآن لغت ایک مکمل لغات القرآن، قرآن اور قرآنی عربی سیکھنے والوں کیلئے نادر و نایاب تحفہ!
اس لغت میں قرآن کے تمام الفاظ کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے بمع حوالۂ قرآن جمع کیا گیا ہے اور ہر لفظ کا مکمل ترجمہ مفہوم مادہ ومصدر اور صرفی تشریح (گرامر کے قواعد) کے ساتھ دیا گیا ہے، نیز بلحاظ مادہ ومصدر بھی تمام الفاظ قرآنی کو جمع کیا گیا ہے۔ ہدیہ 425 روپے
تعلیم القرآن مکمل سیٹ چار جلدوں میں قریباً ۳۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں لغت بھی شامل ہے (جبکہ لغت کی جلد الگ سے بھی لی جاسکتی ہے) ہدیہ مکمل سیٹ = 1750 روپے (بارعایت طلب فرمائیں) کثیر تعداد میں ہدیہ کرنے والوں کیلئے خصوصی رعایت
سائز 20x30/8 کتابت: کمپیوٹرائزڈ طباعت: آفسٹ/سفید کاغذ خوبصورت دو رنگی جلد
ادارہ تعلیم القرآن 19/C منصورہ ملتان روڈ لاہور 54570 پاکستان
Phone:042-35412949, 04235025227
Email: italeemulquran@yahoo.com, web: www.italeemulquran.net

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

مستقل سلسلہ

مشورہ حاضر ہے

صغیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کردیتے ہیں

انناس

ظہور حسین، چوبرجی، لاہور سے لکھتے ہیں: انناس کے بارے میں بتایئے۔ میں ایک انناس خرید کر لایا تو وہ کھٹا تھا۔ میٹھے انناس کہاں سے ملتے ہیں؟ اس کے بارے میں لکھیں۔ دوسرے یہ کہ میرے کانوں میں کھجلی رہتی ہے۔ چابی گھمانے سے سکون ملتا ہے۔ کانوں کے بارے میں بھی مشورہ دیجیے۔

انناس صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ دل، جگر، معدے، دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ اس کے کھاتے ہی پورے جسم میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ مکہ مکرمہ میں فجر کی نماز کے بعد لوگ بسوں میں سوار ہوکر مسجد عائشہ تک جاتے ہیں تاکہ وہاں جا کر احرام باندھ کر آئیں اور عمرے کی سعادت حاصل کریں۔ ملائیشیا، ترکی اور دوسرے ممالک سے آئی ہوئی خواتین بس میں چڑھتیں تو ان کے ہاتھ میں انناس کا ڈبا اور چمچ ہوتا۔ بڑے مزے سے انناس کھاتی جاتیں۔ یہی ان کا ناشتا ہوتا تھا۔ ڈبے میں بند انناس میٹھا ہوتا اور اس کا شیرہ بھی مزیدار لگتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ انناس کھانے سے وہ بڑے آرام سے عمرہ کرلیتی تھیں اور تھکن بھی نہیں ہوتی۔ انناس کا پھل بڑے سٹورز پر مل جاتا ہے۔ آپ انناس خرید کر اسے مشین سے کٹوا سکتے اور اس کا تازہ جوس پی سکتے ہیں۔ اس میں ہلکی سی ترشی ہوتی ہے جو اسے اور بھی ذائقے دار بناتی ہے۔ انناس چھیلنا اور کاٹنا بھی ایک فن ہے۔ اس کو آپ ضرور کھائیں۔ قدرت نے تمام پھلوں میں غذائیت رکھی ہے۔ آپ ڈبے میں بند انناس خرید سکتے ہیں۔ یہ گول گول قتلوں میں اور چھوٹے چوکور ٹکڑوں میں عام مل جاتے ہیں۔

رہی کان کی بات، آپ کان کا میل صاف کرانے کے لیے کسی اچھے کانوں کے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ کان میں پن، چابی، دیا سلائی وغیرہ نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس سے کان میں انفیکشن کا خطرہ ہوتا ہے۔ آپ احتیاط کریں ورنہ کان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کان میں چابی کی وجہ سے زخم بھی بن سکتا ہے۔ آپ ایک بار ضرور کان کا معاینہ کرائیں۔

الرجی

کینیڈا سے نازیہ پوچھتی ہیں، میرے ۲/سال کے بیٹے محمد حسن کو الرجی ہے۔ یہاں ہمدرد مطب کی دوا مل جاتی ہے۔ معدے کی مضبوطی اور بار بار حاجت ہونے کے لیے بتائیے۔ چھینکیں بہت آتی ہیں۔ بعض مرتبہ موشن میں خون بھی آجاتا ہے۔ اس کی چھاتی بھری رہتی ہے۔ اس بارے میں ضرور بتائیے۔

نازیہ بہن! اب مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے حکیم صاحبان تو اپنی دوا کے لیے بتاتے ہیں۔ ہمارے محترم بھائی ظہور حسین گوہر گولڈ میڈلسٹ حکیم اور ہمدرد مطب میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں آپ وہاں ہمدرد مطب سے معلوم کریں۔ ''بچہ'' گولیاں ہیں۔ ایک گولی کے ۲/حصے کرلیں۔ آدھی صبح، آدھی شام کو دیجیے۔ چھوٹی الائچی سونف پودینے کا پانی اُبال کر رکھ لیجیے۔ جوارش مصطگی ۲/۱ چھوٹا چمچ کھانے کے بعد دیں۔ لعوق سپستان صدوری الفیوزا شربت میں ملا کر تھوڑے سے نیم گرم پانی میں ملا کر دن میں ۳/بار ہلا کر پلائیں۔ عناب مل جائے تو

صرف ۳/دانے دھو کر آپ رات کو بھگو دیں۔ آدھی پیالی پانی میں اور دن میں اسے چھان کر پلا دیں۔ عناب الرجی میں بے حد مفید ہے۔ آپ عناب کا شربت پلا سکتی ہیں۔

نظر کی کمزوری

عامر شہزاد عمر ۱۶/سال، عینک لگنے کے باوجود نظر کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے لیے مشورہ مانگتے ہیں۔ جھنگ میں رہتے ہیں۔

بیٹا! آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے آنکھ کا معاینہ کرا کے نئی عینک بنوائیں۔ سونف بادام ہم وزن لے کر پیس لیں۔ اس میں چینی یا مصری ملا دیں۔ آپ تینوں چیزیں بھی ہم وزن لے سکتے ہیں۔ صبح شام ایک چمچ سفوف دودھ کے ساتھ کھائیں۔ جب بھی گاجر کا موسم ہو، روزانہ گاجر کا جوس لیں۔ اس سے بہت فرق پڑے گا۔ عینک کا نمبر صحیح ہونا چاہیے۔ ٹیلی ویژن قریب سے نہ دیکھیں، آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح ہماری قاریہ بہن شکیلہ حبیب شیر پور سیالکوٹ سے آنکھوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں لیزر سے آنکھیں صحیح ہو جائیں۔ اس کے لیے اُنھیں کسی اچھے آنکھوں کے ڈاکٹر سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ وہی معاینے کے بعد اُنھیں صحیح علاج بتائے گا۔ لاہور میں بہت اچھے آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں جو لیزر سے علاج کرتے ہیں۔ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ کو ایک بار ڈاکٹر سے ملنا پڑے گا۔

بالوں اور چہرے کا مسئلہ

تحصیل کلر کہار ضلع چکوال سے ماہ جبیں بہت ساری باتیں پوچھ رہی ہیں۔ بالوں کے لیے بہت پریشان ہیں۔ آپ جو تیل لگا رہی اور جو غذا استعمال کر رہی ہیں وہ سب بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے خود پر بہت پریشانی مسلّط کر لی ہے۔ بال ایک دم نہیں بڑھتے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کبھی موقع ملا تو مفصل لکھوں گی۔ کالم پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ رسالہ پڑھتی رہتی ہیں، اس میں بھی بہت سارے نسخے ہوتے ہیں۔ چہرے پر آپ صرف گھیکوار کا گودا لگائیں اور دن میں تھوڑی دیر کے لیے دہی لگائیں۔ چہرے پر طرح طرح کی کریمیں لگانے سے مسئلہ ہو جاتا ہے۔ آپ کوئی کریم نہ لگائیں ورنہ دانوں اور بالوں کی بڑھوتری اور زیادہ ہو جائے گی۔

آپ نے خط کے آخر میں چند احادیث لکھی ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی لکھنا یا بھیجنا ہو تو آپ جوہر ٹاؤن اردو ڈائجسٹ کے پتے پر مدیر صاحب کو براہِ راست بھیجیں۔ اب یہ اُن کی صوابدید ہے کہ وہ شائع کرتے ہیں یا نہیں۔ مجھے بھیجے کا کوئی فائدہ نہیں۔

کانوں کا مسئلہ

شاہد شریف امریکا میں ہمارے قاری ہیں۔ Syea More USA سے لکھتے ہیں مجھے آپ کا نمبر چاہیے۔ میری بیوی بات کرنا چاہتی ہے۔ ان کے کانوں میں سیٹی کی آواز آتی اور بھولنے کا مرض بھی ہے۔

محترم بھائی! آپ اردو ڈائجسٹ کے دفتر سے میرا نمبر لے کر بات کر سکتے ہیں۔ امریکا میں کوئی بھی دوا آپ ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر نہیں لے سکتے۔ یہ بڑا مسئلہ ہے۔ وہاں پر ہومیو پیتھک دوا بھی بغیر ڈاکٹر کے نسخے کے نہیں مل سکتی۔ آپ اپنے کان کا معاینہ کرائیں پھر مجھے بتائیں۔ جو بھی ممکن ہوا میں ضرور بتاؤں گی۔

پھسڈی بچے

میرے ۴/بچے ہیں اور سب کے سب پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ بڑی مشکل سے پاس ہوتے ہیں۔ ویسے ذہین اور کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میں سکول جاتا تھا میری والدہ پراٹھا یا گھی سے چپڑی روٹی بناتی تھیں۔ رات کے سالن اور آملیٹ کے ساتھ ناشتا ہوتا تھا۔ دودھ یا لسی کا ایک گلاس ضرور ملتا تھا۔ میں اپنی بیگم سے کہتا ہوں کہ وہ صبح ناشتا بنائیں مگر وہ ڈبل روٹی اور مکھن چائے کے ساتھ دیتی ہے۔ لنچ میں لے جانے کے لیے وہ دو تین چکن کے نگیٹس تل دیتی ہے اور بس۔ بچے توس بھی نہیں کھاتے، بھوکے سکول جاتے ہیں۔ آپ اس بارے میں ضرور بتائیں۔ اچھا ناشتا بچوں کے لیے ضروری ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں گھروں کا یہی مسئلہ ہے۔ (شکیل الرحمٰن)

آپ کی بات سے میں متفق ہوں۔ بچوں کو ناشتا کر کے ضرور جانا چاہیے۔ پہلے مائیں صبح اذان کے وقت اٹھ جاتی تھیں۔ کام کاج کے ساتھ وہ ناشتا بھی بناتیں۔ کبھی دلیہ بنتا، کبھی کچوریاں تلی جاتیں۔ چھٹی کے روز گھر میں حلوہ پوری بنتی۔

بچوں کو بازار کی چیزیں بالکل نہیں کھلائی جاتی تھیں۔ اب تو فری ہوم ڈلیوری ہے۔ آرڈر کریں تو گھر دے جاتے ہیں۔ دفتر جانے والوں کو خاص طور پر دیسی گھی کا پراٹھا انڈا ناشتے میں دیا جاتا تھا تاکہ وہ تمام دن کام اور تھکاوٹ محسوس نہ کریں۔ اب تو ۹۸ رفیصد بچے ناشتے کے بغیر سکول جاتے اور چھٹی کے وقت کینٹین سے چیزیں خرید کر کھاتے ہیں۔

پہلے خواتین کہتی تھیں روٹی میں بہت غذائیت اور طاقت ہے۔ سوکھی روٹی پیاز کے ساتھ بھی کھالی جائے تو مزدور چلچلاتی دھوپ میں کام کر سکتا ہے۔ ڈبا بند جوس اور بیکری کی اشیا بچوں کے لیے مفید نہیں۔ آپ روٹی پر مکھن یا گھی لگا کر کھا سکتے ہیں۔ دہی کی لسی کے ساتھ پراٹھا کھا سکتے ہیں۔ جو بچے پیٹ بھر کر ناشتا کرتے ہیں وہ پڑھائی میں بھی تیز ہوتے ہیں۔ بچوں کے کھانے پینے کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی عمر بڑھوتری کی ہوتی ہے۔ انھیں غذائیت ملے تو وہ چاق و چوبند رہتے ہیں۔ ماؤں کو چاہیے وہ بچوں کی صحت کا خیال رکھیں۔ انھیں اچھا ناشتا اور کھانا بنا کر دیں۔ سلاد اور پھل غذا میں شامل کریں۔ بچوں کی صحت اچھی رہے گی۔

آملہ کا تیل

بازار میں آملہ کا تیل ملتا ہے مگر وہ خالص نہیں ہوتا۔ گھر میں کس طرح آملہ کا تیل بنتا ہے؟ اس کے فوائد بتائیں؟

(مبشرہ)

آج بھی اچھے دواخانے آملہ کا خالص تیل بناتے ہیں۔ آملہ کا تیل سر میں ٹھنڈک ڈالتا، بالوں کی خشکی دور کرتا، بالوں کو نرم ملائم رکھتا اور گرنے سے روکتا ہے۔ جو لوگ یہ تیل باقاعدگی سے استعمال کرتے ہیں ان کے بال اچھے رہتے ہیں بلکہ سیاہی بھی قائم رہتی ہے۔ گھر میں تیل بنانے کے لیے سرسوں یا ناریل کے تیل میں آملہ کے ٹکڑے ڈالے جاتے ہیں۔ آدھا کلو تیل بوتل میں ڈالیں۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ چھٹانک آملہ موٹا موٹا کوٹ کر ڈالیں۔ گٹھلیاں نکال دیں۔ اس تیل کو دھوپ میں رکھیں۔ دن میں ایک دو بار ہلا دیا کریں۔ ۱۵ر دن کے بعد آملے نکال دیں۔ چھان کر تیل استعمال کریں۔ اکثر لوگ آملے نہیں نکالتے بلکہ اسے تیل میں رہنے دیتے ہیں۔ ۱۵ر دن بعد دھوپ میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔

سبز آملے اچھی طرح کچل لیں۔ گٹھلیاں نکال دیں۔ تقریباً ایک پاؤ آملے لے کر ایک کلو تیل میں ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب آملے جل جائیں صرف تیل رہ جائے تو اُتار کر چھان کر رکھ لیں۔ آملے کا تیل تیار ہے۔ آپ اس میں رنگ، خوشبو بھی ملا سکتے ہیں۔ ورنہ اسی طرح استعمال کرنے سے بال مضبوط اور سیاہ ہو جائیں گے۔ گرمی سے ہونے والا سر درد بھی ختم ہو جائے گا۔

پیٹ کا مسئلہ

میری بہن کوئی بھی مرچوں والا سالن کھالے تو اسے پیچش ہو جاتی ہے۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ ڈاکٹر کے ہاں جانا پڑتا ہے۔ کوئی گھریلو ٹوٹکا بتائیں تاکہ اسے آرام آجائے۔

(ارم شاہ)

اپنی بہن سے کہیے زیادہ مرچوں والا سالن نہ کھائے۔ کھانے کے بعد آدھا کپ دہی ضرور لیں، اس سے مرچوں کا اثر کم ہو جائے گا۔ اسپغول کی بھوسی ہر جگہ مل جاتی ہے۔ ایک پیکٹ لا کر رکھ لیں۔ جب بھی پیچش ہو، تو ایک بڑا چمچ اسپغول کی بھوسی آدھ پاؤ دہی میں اچھی طرح ملا کر رکھ دیں۔ اسے فریج میں نہ رکھیے گا۔ گھنٹہ بھر بعد اسے کھا لیجیے۔ اس میں آپ تھوڑی سی چینی بھی ملا سکتے ہیں۔ دو مرتبہ روز کھائیں۔ پیچش کا مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ لوگ اچھا پکا ہوا کیلا چھیل کر اس پر اسپغول کا چھلکا اچھی طرح لگا کر کھاتے ہیں۔ اس سے بھی پیٹ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اسپغول معدے کے لیے بہت اچھی دوا ہے۔ آپ اسے کھا کر دیکھیں۔

شادی

شدہ افراد کی اکثریت مٹاپے کا شکار ہونے لگی ہے۔ انتہائی خوشی یا محبت میں کامیابی کا نتیجہ بھی لوگ خوشی کے اظہار، یہاں تک کہ محبت کے اظہار کا مطلب بھی کچھ یوں لینے لگے ہیں کہ اس کا فوری اثر مٹاپے کی صورت نکلتا ہے۔ مثلاً جی بھر کے کھانا، طرح طرح کے مرغن کھانے، ہر وقت تواضع کی فکر میں رہنا، بیٹھے لیٹے ٹی وی دیکھنا اور کھاتے رہنا۔ اس طرح ان کے پیٹ کے حجم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی دوست، عزیز نے اظہارِ محبت کرنا ہے تو بھی کھانا کھلا کر، کسی نے مبارک دینی ہے تو ہوٹل پہ بلا کر، رات گئے مرغن اور بھرپور کھانوں کے بعد شادی شدہ جوڑے بیچارے واک کے قابل رہ ہی کب جاتے ہیں کہ کیلوریز جلائیں اور مٹاپے سے حفاظت پائیں۔ غیر شادی شدہ افراد خود کو فٹ رکھنے کی قدرے سنجیدگی سے کوشش کرتے ہیں۔ کیا محض زندگی کے ساتھی کی تلاش کے بعد صحت مند لائف اسٹائل چھوڑ دینا چاہیے اور کسی کاہل اور سست الوجود کی طرح اپنے آپ کو ڈی شیپ ہونے دیا جائے۔ مٹاپا جتنی جلدی آتا ہے اتنی ہی دیر سے جاتا ہے۔

صحت اور طویل العمری کا راز

اچھی صحت اور طویل العمری کا راز جاننا ہو تو سادہ طرزِ زندگی اختیار کر لیجیے۔ جدید طرزِ زندگی نے تو ویسے بھی مسائل میں اضافہ کر دیا ہے۔ مناسب مقدار میں غذائیت سے بھرپور ناشتہ جسم کی لازمی ضرورت ہے۔ اگر آپ رات کا کھانا رات نو بجے سے ساڑھے دس بجے کے درمیان کھا لیتے ہیں اور پھر سوتے وقت اسنیکس نہیں لیتے تو پھر صبح بیدار ہونے پر سات، ساڑھے سات بجے سے ہلکی ہلکی بھوک کا احساس ہونا چاہیے۔ وقت پر ناشتہ کرنے سے جسم میں انسولین لیول ٹھیک رہتا ہے۔ میٹابولزم سُست نہیں ہوتا۔ نارمل انداز میں کام کرتا رہتا ہے۔

وقت پر ناشتا ہر مسئلے کا حل ہے

وقت پر ناشتا کرنا بہت اہم ہے۔ وقت پر کھانا اور پانی کا استعمال صحت مند زندگی کی طرف ایک مزید قدم ہے۔ رات دیر گئے تک جاگنا اور صبح حوائج ضروری سے پوری طرح فارغ ہوئے بغیر میدے سے بنی اشیا پیٹ میں پہنچا کر دکان یا دفتر کا رخ کرنے سے معدے اور جگر کی صحت کے ساتھ ساتھ آنتوں کا فعل بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔

نیند پوری لیں

صحت کی بحالی کے لیے سب سے پہلے نیند پوری لینے کی کوشش کیجیے۔ شروع میں آپ بستر میں جلد لیٹنے کے باوجود سو نہیں سکیں گے لیکن اس پر عمل کرتے رہیں۔ بستر پر لیٹ کر گہرے سانس لیں۔ ذہن کو خالی رکھنے کی کوشش کریں، روٹھی ہوئی نیند آپ سے آپ مان جائے گی۔ بہت ساری خواتین میرے پاس آتی اور رات رات بھر جاگتی ہیں۔ نیند نہیں آتی تو دوائیاں کھاتی ہیں۔ دوائیاں کھا کھا کر اور مصنوعی نیند لے لے کر وہ اپنی زندگی کا سارا رس کھو بیٹھتی ہیں۔ چلنے پھرنے میں سستی ہی نہیں نقاہت محسوس کرتی ہیں۔ جسم بڑھ چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں گھر، بچے اور شوہر ہر چیز بُری لگتی ہے۔

۱۔ آپ اپنے کھانے پینے کی روٹین بنا لیں۔ سونے سے پہلے چاول اور مرغن غذا کا استعمال کرنے کے بجائے ہلکی پھلکی غذا کھائیں۔ سونے سے ڈیڑھ دو گھنٹے قبل نیم گرم دودھ کا استعمال کریں۔

۲۔ سونے سے پہلے چہل قدمی کریں۔ جسم تھکا ہو تو نیند آجاتی ہے۔ بہترین چیز عشاء کی نماز اچھے طریقے سے ادا کرنا ہے۔

۳۔ ایسے مریض جنھیں نیند کا مسئلہ درپیش تھا صرف یہی ۳ر چیزیں اُن کی روٹین میں شامل ہونے سے وہ ماشاء اللہ

بہت سکون میں ہیں اور جلد سونے لگے ہیں۔ آپ بھی نوٹ فرما لیں:۔

ا۔ نمازِ عشاء کی ادائی پورے رکوع و سجود کے ساتھ

ب۔ سونے سے قبل غسل کرنا

ج۔ نیم گرم دودھ پینا

د۔ سورہ رحمٰن کی تلاوت سنتے ہوئے سونا

ر۔ درود پاک پڑھتے ہوئے لیٹنا

یہ سارے کام بے حد پاکیزہ ہیں۔ خیالات کی آلودگی صحت اور نیند کی دشمن ہے۔ ہر رات ۶ر سے ۸ر گھنٹے کی نیند سے آپ کے جسم کے تمام نظام بحال ہونے لگیں گے۔ بھرپور نیند لینے کے بعد صبح کے وقت آدھے گھنٹے کی ورزش کو اپنا معمول بنا لیجیے۔ اس سے آپ ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر آسودہ رہنے لگیں گے۔ جسم کی سستی دور اور دماغ تر و تازہ ہو جائے گا۔ نیز جسم میں فاضل چربی کے کم ہونے سے پھیپھڑوں کے علاوہ قلب پر رہنے والا دباؤ بھی بتدریج ہٹتا چلا جائے گا۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے سوالات اور مسائل کی طرف اللہ ربّ العزت سے دعا کے ساتھ آغاز کرتے ہیں کہ مولا میرے یہ جوابات خیر اور سلامتی کا باعث بنیں اور پوچھنے والوں کی زندگی آسان اور آسودہ ہو۔

وزن ۶۰ر کلو قبض بھی اور بلڈ پریشر کا مسئلہ بھی

مجھے مہربانی فرما کر ڈائیٹ پلان بنا دیں۔ میری عمر ۳۶ر سال، قد ۵ر فٹ ۲ر انچ اور وزن ۶۰ر کلو ہے۔ میرا بلڈ پریشر لو رہتا اور قبض کی بھی شکایت ہے۔ ناشتے میں انڈہ بریڈ یا پراٹھا لیتی ہوں۔ دوپہر کے کھانے میں سلاد روٹی یا چاول سالن لیتی ہوں۔ رات کے کھانے میں دودھ لیتی اور ۳۰ر منٹ تک روزانہ واک کرتی ہوں۔ (شکیلہ، اسلام آباد)

جواب: شکیلہ آپ رات کو تقریباً فاقہ کر رہی ہیں جو قبض اور لو بلڈ پریشر کا باعث ہے۔ آپ کی غذا میں فائبر کا استعمال جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر آپ کو قبض اور مٹاپے دونوں سے نجات ملے گی۔ صبح ناشتے میں فروٹ اور دودھ کا استعمال کریں۔ دن ۱۱ر بجے کے قریب چائے کے ساتھ انڈہ یا ایک براؤن رس لے لیں۔ دوپہر کھانے میں سلاد کا استعمال کریں۔ ساتھ میں گرین ٹی لیں۔ شام میں ایک دہی کی پیالی اور فروٹ کی پیالی لیں۔ رات کے کھانے میں ایک چھوٹی چپاتی، سلاد اور چند چمچ سالن۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا استعمال کریں۔ عشا کی نماز طویل سجدے سے ادا کریں اس سے قبض کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ اپنی ہلکی واک کو بھی تیز واک میں یعنی برسک واک میں بدلنے کی کوشش کریں۔

چہرہ کمزور جسم بھاری

باجی میں آپ کو ۳۰ر میسج کر چکی ہوں۔ پلیز میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے گائیڈ کریں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری عمر ۱۶ر سال، وزن ۵۰ر کلو کے قریب اور قد ۵ر فٹ ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چہرہ دیکھنے میں بہت کمزور لگتا ہے لیکن میرا جسم خاص طور پر پیٹ باہر آرہا ہے جو بہت عجیب لگتا ہے پلیز بتائیں کہ میں کیا کروں؟ ماریہ، کراچی

جواب: اچھی ماریہ آپ کا شکریہ کہ ۳ر ماہ میں ۳۰ر میسج، تو چندا میں کسی کا میسج ضائع نہیں کرتی۔ جواب ضرور دیتی ہوں لیکن باری آنے پر۔ لیجیے آپ کی باری آگئی۔

آپ کا وزن بہت زیادہ نہیں ہے ایک صحت مند وزن کے اندر ہے لیکن آپ کا قد کم ہے۔ اسی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔ آپ فوری طور پر Fizzy ڈرنکس سے دوری اختیار کریں۔ صبح آدھا گھنٹہ واک کریں۔ اس کے بعد پیٹ کی ورزش

کریں۔ اس سلسلے میں Foot worship سب سے محفوظ ورزش ہے۔ ۵۰ر کی گنتی پوری کریں۔ پیٹ کو ہولڈ کر کے چھوڑیں۔ ایسا ۵۰ بار کریں۔ Breathing کی ورزش پیٹ کو ہولڈ کر کے چھوڑنے والی بہترین مشق ہے۔ ناشتے میں دودھ کا استعمال ضرور کریں ہاں رات کے کھانے میں چاول ہرصورت بند کردیں۔ خوش رہیں نماز ٹھیک سے ادا کریں۔ رکوع جتنا اچھا ہوگا آپ کا پیٹ اتنی ہی جلدی اندر چلا جائے گا۔ گھر کے کاموں میں والدہ کی مدد کیا کریں۔ گھر کا کوئی ایک کام جیسے فرش پر گیلا پوچا لگانا اپنے ذمے لے لیں۔ یہ بہت عمدہ ورزش ہے۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

۱۷ر سال عمر اور ۶۷ر کلو وزن.....علاج سستا بتائیے

میں ایف ایس سی کا طالب علم ہوں۔ کالج کا وقت ۸ر سے ۱ر بجے تک ہے۔ میری عمر ۱۷ر سال اور وزن ۶۷ر کلوگرام ہے۔ میں اپنا وزن کم کرنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر پیٹ، سینہ اور کمر سے۔ پلیز مجھے کوئی فوڈ پلان دیں اور چیزیں وہ بتائیں جو سستی ہوں اور آسانی سے ملیں۔ میں آپ کا بہت مشکور رہوں گا۔ (محمد اویس علوی، لیہ)

جواب: اویس بھائی آپ کی عمر بہت کم ہے۔ کم عمری کا ایک فائدہ ہے کہ تھوڑی سی محنت سے بھی مطلوبہ نتائج مل جاتے ہیں۔ آپ نے بھی اپنا سوال بجھواتے وقت مجھے اپنی فوڈ روٹین نہیں بتائی۔ چھوٹے بھائی میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ آپ کیا چیز ایسی کھا رہے ہو جو آپ کے لیے مسئلے کا باعث بن رہی ہے۔ بہرحال آپ صبح وشام جاگنگ شروع کریں۔ شروع میں تیز واک کریں پھر ۳ر منٹ جاگنگ۔ آدھے گھنٹے کی ایسی روٹین صبح شام بنائیں۔ ان شاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔ اچھے جوگرز استعمال کریں۔ ہر کھانے سے پہلے ایک گلاس پانی پئیں۔ صبح ناشتے سے پہلے ایک کپ جوا دیسی لہسن لیموں پانی کے ساتھ لیں۔ ناشتے میں دودھ جو کا دلیہ لے لیں۔ دوپہر کے کھانے میں سالن کم اور سلاد بڑھا دیں۔ ساتھ ایک کپ گرین ٹی لیں۔ رات کے کھانے میں ۳ر پھلوں کی چاٹ بنالیں، چینی نہیں ڈالنی۔ کچھ دیر بعد دودھ کا گلاس لے لیں۔ نمازِ عشا بہت توجہ سے ادا کریں۔ ان شاء اللہ پیٹ والی چربی ختم ہوجائے گی۔

نامکمل معلومات.....وزن بڑھانے کے لیے کیا کروں

عمر ۲۵ر سال، قد ۵ر فٹ ۱۱ر انچ اور وزن ۶۲ کلوگرام ہے۔ کیا میرا وزن ٹھیک ہے اور اگر بڑھانا چاہوں تو کیا کروں؟ (شہزاد، نامعلوم جگہ)

جواب: بھائی شہزاد! آپ نے بہت نامکمل معلومات دی ہیں۔ آپ نے اپنے کھانے پینے کی روٹین نہیں بتائی۔ ایسے میں کیسے لکھوں کہ آپ کو کس غذا کی زیادہ ضرورت ہے۔ نہ ہی آپ نے بتایا کہ آپ کی جسمانی عادات کیا ہیں۔ ایسے میں ڈائیٹ پلان کرنا بے حد دشوار ہے۔ بظاہر عمر اور قد کے اعتبار سے آپ کے وزن میں آٹھ، نو کلو کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

بہرحال آپ کا قد مناسب ہے۔ ہاں اپنی غذا میں ایک انڈا اور سبزیوں کا استعمال شروع کردیں۔ دن میں دودھ، دہی اور پھل کا استعمال الگ الگ کریں۔ جوگنگ کریں بہتر ہوگا کہ کسی ایک گیم کو روز کا معمول بنالیں۔ دودھ کا ایک گلاس ضرور لیں۔ نماز باقاعدگی اور اچھے سے ادا کریں۔ خوش رہیں اور دوسروں کے لیے خوشی کی وجہ بنیں۔ پھر دیکھیں آپ کی کیا ہیرولک (Heroic Look) پرسنیلٹی سامنے آئے گی۔ صحت مند زندگی گزارنے کے لیے مثبت اور اچھی سوچ پہلا قدم ہے۔

۲۷ر سال میں ۷۰ر کلو وزن

السلام علیکم! اُردو ڈائجسٹ اور آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ یہ بے حد مفید اور معلوماتی ہے۔ کافی خوشی محسوس

کرتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں بھی اچھے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کا بھلا کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کی مدد لینا چاہتا ہوں۔ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ میرا قد ۵ر فٹ ۴ر انچ، وزن ۷۰ر کلوگرام ہے عمر ۲۷ر سال اور کمر ۴۰ر انچ ہے۔ لائبریرین ہوں۔ میرے پیٹ پر چربی آگئی ہے مہربانی کر کے ایسا ڈائیٹ پلان دیں کہ میرے پیٹ کی چربی کم ہوجائے۔ میں بے حد مشکور رہوں گا۔ (احمد خلیل، پشاور)

جواب: احمد بھائی! آپ نے بھی وہی غلطی کی ہے جو بہت سے قارئین کرتے ہیں۔ مجھے کھانے کی عادات نہیں بتائیں۔

نئی خوشیاں مبارک ہوں

آپ نے ۱۴۰ سے ۱۳۰ دو ماہ میں ۱۰ر کلو وزن کم کیا پھر تیسرے ماہ ۱۲۸ کلو تک کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت بھری زندگی عطا کریں اور آپ کا سفر مزید آسان ہو۔ میاں جی کی منظورِ نظر دوبارہ بننا مبارک ہو۔ (رابعہ اشفاق۔ لاہور)

اُمید ہمیشہ باقی رہتی ہے

آپ نے پہلے ماہ ۱۲۹ کلو سے ۱۲۷ کلو یعنی دو کلو وزن کم کیا۔ دوسرے ماہ ۱۲۷ کلو سے ۱۲۰ کلو پر آئیں۔ اللہ جی آپ کا سفر مزید آسان کریں۔ اپنا غذائی پلان تبدیل کرا لیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کی پریشانی کم ہو رہی اور آپ پُرامید رہنے لگی ہیں۔ (سمیرا۔ گوجرہ)

میانہ روی اختیار کریں

مبارک ہو ۸۰ر سے ۷۰ر کلو ۲ر ماہ میں اچھا فرق ہے لیکن اتنی جلدی وزن نہ گرائیں۔ اس طرح کمزوری محسوس کریں گے۔ آپ بھی اپنا فوڈ پلان تبدیل کروالیں اور پلیز ۴، ۴ گھنٹے کی ورزش بند کریں، ایک گھنٹہ کافی ہے۔ جسم سے واٹر لاس شارٹ ہوسکتا ہے۔ (فراز عمر۔ سیالکوٹ)

۲۵ر سال میں پہلی بار مبارک ہو

۱۶۰ر سے ۱۵۰ کلو پر آئی ہیں۔ اپنا فوڈ پلان فوراً تبدیل کروالیں۔ جب تک نئے پلان پر نہیں آتیں دودھ کا ایک گلاس اور ایک پھل بڑھالیں۔ ایک ملٹی وٹامن ضرور لیں۔ آپ کو مبارک ہو آپ کو ۲۵ر سال کی عمر میں پہلی بار پیریڈز ہوئے ہیں۔ آپ خوش ہیں کہ میری وجہ سے آپ کو اللہ جی نے یہ آسانی دی ہے تو میرے لیے دعا کریں کہ اللہ جی مجھے اور میرے اہلِ خانہ کو اپنے پسندیدہ بندوں میں ہمیشہ شامل رکھیں اور بغیر حساب کتاب ہی ہمیں بخش دیں۔ آمین (سدرہ ظفر۔ کشمیر)

سمیرا کراچی، ذیشان مدثر بہاولنگر، خورشید سرفراز بھکر، رابعہ شاہ کوئٹہ، ارم ظفر لاہور اور بھی بہت سارے قارئین ہیں جن کے مسائل باری کے انتظار (Pipe line) میں ہیں۔ کسی کا سوال ضائع نہیں جاتا۔ بے فکر رہیں لیکن بس اپنی باری کا انتظار کرنا ہوگا۔ نئے لکھنے والے اپنی عمر، قد، وزن، کھانے کی عادات پوری تفصیل کے ساتھ لکھیں تو ہی بہتر مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ بہت ساری اچھی دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ اس امید کے ساتھ کہ میں اور میرے اہلِ خانہ آپ کی اچھی دعاؤں میں شامل رہیں گے۔

انعامی مقابلہ

دلچسپی، معلومات
اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اِس
کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

انچارج کوئز:
حافظ فراز محمود

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳/ بنیادی خوبیاں ہیں۔ اِن قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲/ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اُردو ڈائجسٹ" کے ۶/ شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ وصی شاہ کی شاعری کی ۲/ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہِ جون میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) روس (ب) میخائل گورباچوف
قصہ کوئز ۲۔ (الف) انگلستان (ب) ایسٹ انڈیا
قصہ کوئز ۳۔ (الف) کنفیوشس (ب) ڈائلیکٹ

درست جوابات دینے والوں کے نام

شمعون جمشید (کراچی)، شعیب شاہد (لاہور)، محمد افضل کاسی (کوئٹہ)، ڈاکٹر سید علی سلمان (کراچی)
فرہاد علی (ڈیروی)، برھان علی اعوان (گوجرانوالہ)، افضل داد (جہلم)، اظہر احمد صدیقی (راولپنڈی)
اقبال بانو (ڈیرہ اسمٰعیل خان)، عدیل عباس، ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل، حمنہ شکیل مرشد قادری،
صاحبزادہ حافظ عبدالغنی شکیل، حمینہ شکیل مرشد قادری، منور سعید (بے نظیر آباد)، منظور احمد بگھیو (نواب شاہ)
محمد زمان خٹک (ضلع ہنگو)، مسز حرا ہارون (گوجرانوالہ)، اویس علی (فیصل آباد)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (پنجاب)
طٰہٰ یٰسین (حیدر آباد)، مرزا فرحال بیگ (حیدر آباد)، شیخ محمد طارق (لاہور)، الطاف حسین کلو (ماڑی انڈس)
محمد سیف اللہ بھابڑوی (سرگودھا)، حاکم علی (راولپنڈی)، عمران سلیمان (شیخوپورہ)، ریحانہ ظریف (کراچی)
محمد خلیل چودھری (وینہ)، عقیل احمد خان (کراچی)، ضیاء اللہ (سوات)، محمد ظریف (کراچی)
محمود منور خان (سرگودھا)، ڈاکٹر محمد حنیف (ڈیرہ غازی خان)، نسرین اختر (کراچی)، ماہ نور عرفان (کراچی)
احسان الٰہی مغل (میر پور خاص)، محمد یونس جاوید، عمارہ حمید (چکوال)، زرنگار (فاروق آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ محمد افضل کاسی، مکان نمبر 810/49 B، اللہ ڈنہ روڈ، شالدرہ، کوئٹہ ۲۔ محمد زمان خٹک، محلّہ شریف تحصیل ٹل، ضلع ہنگو (خیبر پختونخواہ)

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/۱

ثمرقند کا ایک بادشاہ شہریار اپنی بیوی کے رویے سے ایسا نالاں ہوا کہ اس نے عورت ذات سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جس عورت سے بھی شادی کرتا، اگلے روز ہی قتل کردیتا۔ بے گناہ عورتوں کے قتل کا سلسلہ طول پکڑ گیا تو اس کے ایک دانا وزیر کی بیٹی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی طرح کی لڑکیوں کو اس عذاب سے نجات دلائے۔ اس نے بمشکل اپنے باپ کو راضی کیا اور خود بادشاہ سے شادی کرلی۔ شادی کی رات اس نے بادشاہ کو ایک کہانی سنانا شروع کی۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ رات ختم ہوگئی مگر نہ تو کہانی ختم ہوئی اور نہ کہانی کی دلچسپی۔

بادشاہ نے کہانی کا اگلا حصہ سننے کے لیے اس کے قتل کا ارادہ ملتوی کردیا مگر کہانی تو اگلی رات بھی ختم نہ ہوئی بلکہ اس میں پہلے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پھر اس نے ہر رات ایک کہانی سنا کر اس طرح ختم کی کہ اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور کہانی کا آغاز اسی رات کردیا اور اسے پھر ادھورا چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک ہزار راتوں تک وہ کہانی سناتی رہی۔ اس عرصے میں وہ خود ۲/ بچوں کی ماں بن گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی بدظنی بھی جاتی رہی اور اس کا رویہ بھی درست ہوگیا۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم اور آپ ان کہانیوں کو کس نام سے جانتے ہیں؟

(ب) یہ کہانیاں کس خطے میں تخلیق ہوئیں؟

قصہ کوئز/۲

۱۷ برس کی عمر میں وہ مصر کی ملکہ بنی اور اس کا بھائی مصر کا بادشاہ، مگر دونوں کی حکومت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اُنھی دِنوں روم کا ایک جنرل اپنی فوجوں کے ساتھ مصر کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس جنرل کو جب یہ خبر ہوئی کہ ملکہ اور بادشاہ کے باہمی تعلقات اچھے نہیں تو اس نے ملکہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے ایک خفیہ پیغام بھجوایا۔ ملکہ خود بھی رومی جنرل سے ملنا چاہتی تھی مگر اس ملاقات کا راز میں رہنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے بااعتماد غلام اپولوڈورس کے ساتھ ایک پروگرام بنایا۔ وہ خود ایک قالین پر لیٹ گئی اور غلام نے اس کے گرد قالین لپیٹ کر اسے اس طرح اٹھا لیا کہ کسی کو گمان تک نہ ہوا۔ غلام قالین میں لپٹی ہوئی ملکہ کو ایک کشتی کے ذریعے لے کر سکندریہ پہنچ گیا۔ رومی جنرل کے محافظوں کو یہی بتایا گیا کہ وہ پڑوس کی سلطنت کے بادشاہ کا تحفہ لے کر آیا ہے۔ رومی جنرل کے سامنے قالین کھولا گیا تو ملکہ ظاہر ہوئی۔ رومی جنرل اس ملکہ کا محافظِ اعلیٰ بن گیا اور اس نے مصر کا تاج و تخت واپس ملکہ کو دلوایا۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مصر کی اس مشہور ملکہ اور اس کا محافظ قرار پانے والے کا نام کیا تھا؟
(دونوں نام بتائیے)

(ب) خود اس ملکہ کی موت کیسے واقع ہوئی؟

قصہ کوئز/۳

۱۶/ جولائی ۱۹۶۹ء کو کیپ کینیڈی (امریکا) سے ایک خلائی جہاز آسمانوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس میں ۳/ افراد سوار تھے۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار انسان کو یہ اعزاز حاصل ہونے والا تھا کہ چاند اس کے قدموں تلے آجائے گا۔ زمین کے مدار سے نکل کر راکٹ نے جہاز کو علیحدہ کردیا۔ اب جہاز ۴/ ہزار ۲۰۰/ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چاند کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ حیرت انگیز منظر دنیا کے لاکھوں لوگ اپنے ٹیلی ویژن پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پوری دنیا کے لوگ اس ایک واقعے کو بیک وقت دیکھ رہے تھے۔ اس موقع پر دنیا پہلی مرتبہ "گلوبل ولیج" کہلائی۔ ۱۹/ جولائی کو یہ خلائی جہاز چاند کے مدار میں داخل ہوا تو ایک قمری گاڑی کے ذریعے خلاباز چاند پر اُتر گئے۔ نیل آرم سٹرانگ کا قدم چاند پر لگتے ہی انسان نے کامیابی کا ایک غیر معمولی سفر طے کرلیا۔ نیل آرم سٹرانگ نے چاند پر ایک آواز سنی۔ جسے اُس نے بعد میں مصر کے دورے کے دوران پہچان لیا۔

(الف) یہ بتائیے کہ نیل آرم سٹرانگ نے کیا آواز سنی؟

(ب) خلائی جہاز کی رفتار کیا تھی؟

موضوع سخن

تین کردار
ولی...چور...مکار

ملک ریاض کی اہلیہ نے
سہیل وڑائچ سے کہا

”یہ جھوٹ بہت بولتے ہیں“

اتنے قریب سے جاننے کا دعویٰ اس کا رائٹ ہینڈ ”بشیرا“ بھی نہیں کرسکتا، جس کی خوشنودی حاصل کرنے بڑے بڑے سرکاری افسر اور سیاست داں لگے رہتے ہیں

سید وصی شاہ

قرآن

میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ** یعنی ”میاں اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔“

کسی بھی مرد یا عورت کے وجود یا اس کی شخصیت کو اس کی بیوی یا شوہر سے بہتر کوئی نہیں جانتا اس لیے کہ انسان جو کچھ سارے زمانے ساری دنیا سارے جہان سے بھی پوشیدہ رکھتا ہو، جسم کے وہ عیوب وہ داغ بھی لباس سے چھپا نہیں سکتا۔

اسی لیے قرآن اس رشتے کو لباس سے تشبیہ دیتا ہے گویا شوہر کی عادتوں کو اس کی بیوی اور بیوی کی عادات کو شوہر سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا..... دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوا کرتے ہیں انسان دنیا جہان کے سامنے لاکھ چہرے بدل بدل کر جو مرضی تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر بیوی کی اصلیت شوہر اور شوہر کی اصلیت بیوی سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا، کوئی نہیں بیان کرسکتا کہ زمانے بھر میں ”کیسا“ نظر آنے والا یا نظر آنے والی درحقیقت ”کیسی“ ہے یا ”کیسا“ ہے۔

کسی بھی شخص کی شخصیت کے بارے میں سب سے معتبر ترین گواہی یقیناً اس کی شریک حیات کی ہی ہوسکتی ہے۔ قرآنِ مجید اوپر درج کی ہوئی لازوال آیت مجھے ملک ریاض کی پریس کانفرنس کے بعد سے رہ رہ کر یاد آ رہی ہے اور معروف صحافی سینئر تجزیہ نگار اور بڑے بھائیوں جیسے دوست محترم سہیل وڑائچ کا ایک پروگرام میں ملک ریاض کی بیوی سے پوچھا گیا سوال اور اس کا جواب بھی، پروگرام میں سہیل بھائی سے گفتگو کے دوران سیدھی سادی مگر سچی دنیاوی آلائشوں سے ناآشنا مگر ملک ریاض کو دنیا کے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ قریب سے جاننے والی اور سمجھنے والی خاتون یعنی ملک ریاض کی اہلیہ نے ملک ریاض کے بارے میں جو کہا تھا وہ عوام کی عدالت سے لے کر ہر عدالت میں ضرور زیر بحث لانا چاہیے۔

محترمہ نے گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ ”یہ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔“

ذرا تصور کریں کہ کوئی شخص عام زندگی میں اپنے گھر والوں کے سامنے کس پائے کا اور کس مقدار میں جھوٹ بولتا ہوگا، کہ یہاں تک ہو کہ اس کی اہلیہ پر یہ تصور راسخ ہو جائے کہ اس کا شوہر بہت جھوٹ بولتا اور وہ ایک جھوٹا انسان ہے..... اور لازمی بات ہے کہ ”موصوف“ کا گھر والوں یا اہلیہ کے سامنے جھوٹ کا یہ سفر کوئی ایک آدھ دن پر مشتمل نہیں ہوگا اپنی اہلیہ کے ساتھ کم ازکم ۳۰ سال سے زیادہ کی رفاقت ہوگی مزید یہ کہ اس دنیا میں کون ایسا شخص ہوگا جو ۳۰ سال سے زیادہ عرصے کیلئے ملک ریاض سے قربت کا دعویٰ کرسکتا ہو اور وہ بھی دن رات سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے پل پل، ہر پل ہر لمحہ کی قربت۔ اتنی رفاقت اتنی قربت اور ملک ریاض کو اتنا نزدیک سے جاننے کا دعویٰ تو ملک ریاض کا رائٹ ہینڈ ”بشیرا“ بھی نہیں کرسکتا جس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے سرکاری افسر اور سیاستدان کوشش میں لگے رہتے تھے۔ قوم ہو یا میڈیا، یا عدالت کسی بھی بات پر یقین کرنے سے پہلے نہ صرف ملک ریاض کی ہر بات بلکہ شخصیت کو بھی بہت باریک بینی سے تولنا ہوگا اور الزام لگانے والے کا کردار اور اس کے بارے میں زبان خلق اور قوم کی رائے پر نظر رکھنا ہوگی اور جس پر الزام لگایا جا رہا ہے اس کے ماضی اور جدوجہد کو بھی سامنے رکھ کر اس پر لگے الزامات کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی ہوگی۔

یوں بھی ملک ریاض کے اٹھائے گئے سوالوں میں سے کچھ کے جوابات تو آگئے اور کچھ کے آجائیں گے مگر یہ طے ہے کہ عوام جب تک غیر ذمے دار، منفی اور پست ذہنیت کے لوگوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھنے کیلئے سیڑھیاں فراہم کرتے رہیں گے چاہے وہ شعبہ سیاست، معیشت، کھیل، انتظامیہ، عدل وانصاف یا میڈیا کا ہو تو آخر میں وہی لوگ عوام پر مسلّط ہو جایا کرتے اور پورے معاشرے میں اپنی پیپ زدہ سوچ کی پذیرائی کے لیے کام کرنا شروع کردیتے ہیں۔

ملک ریاض کا عدلیہ کے خلاف ہو جانا اور ارسلان افتخار کے ذریعے عدلیہ کو خریدنے کی کوشش کرنا میرے لیے کوئی خبر یا کم ازکم ایسی کوئی انوکھی اور بڑی خبر نہیں کہ سرمایہ اور سرمایہ دار اور پست سطح کے ٹھیکیدار کسی بھی منصب پر فائز ہو جائیں، دُنیاوی لحاظ سے کتنے ہی مضبوط یا طاقتور ہو جائیں کہیں بھی پہنچ جائیں یہی کیا کرتے ہیں۔ ان کا اصل ٹیلنٹ اور جوہر ہی اپنی صلاحیتوں کے ذریعے نہیں بلکہ لوگوں کو کہنیاں مار کر آگے بڑھنے کا ہوا کرتا ہے۔ جو شخص سرِعام یہ دعویٰ کرتا ہو کہ ”جہاں اس کا کام رکتا ہے جس مقام پر اس کی فائل رکتی ہے وہ اس فائل کے نیچے ”پہیے“ لگا دیا کرتا ہے“ اس سے بھلا کیسے اس بات کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی میں کبھی بھی انصاف کا طلب گار ہوگا، انصاف کو خریدنے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ اس کا تو گمان اور فخر ہی یہی ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے ہر انسان ہر ”ذی روح“ کو ”خرید“ سکتا ہے۔

دُکھ اس بات کا ہے کہ اس کے اس گمان کو یقین میں بدلا پورے معاشرے نے اور اس یقین کو پختہ کیا صحافیوں، سیاستدانوں، حاضر و ریٹائرڈ جرنیلوں اور بیوروکریٹس نے۔ ہر شعبے کے تقریباً ہر شخص نے اپنے حلقۂ اثر اپنی حیثیت اور

طاقت کے مطابق اپنی قیمت لگوائی، وصول کی، عیاشی کی اور مزے اُڑائے۔

ملک ریاض کی دولت کے ''گٹر'' میں ''اشنان'' کرنے والوں میں سیاستدان، صحافی، حاضر و ریٹائر جرنیل، بیوروکریٹ بھی شامل ہیں۔ یوں تو ہر شعبے میں بہت سے لوگ یہی کر رہے ہیں اور ہم سب اس سے آگاہ تھے اور ہیں مگر یہ جان کر تکلیف اور اذیت ہوئی کہ سرمائے کی غلاظت میں غوطہ لگانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صبح و شام حق یا حق تعالیٰ کا ذکر کرتے نہیں تھکتے تھے۔ جو عدلیہ بحالی کی تحریک میں سیاسی طور پر حق سچ کے علمبردار تھے یا قلم کے ذریعے جہاد کرنے میں مصروف تھے جو آمر کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے وہ بھی سرمائے اور دولت کے آگے ۲ر منٹ اور ۲ر قدم نہیں ٹھہر سکے گویا سرمایے یا دولت کی چکا چوند کسی بھی ممکنہ اذیت یا تکلیف سے زیادہ طاقتور اور لبھانے والے ہوتی ہے جیسے پروانہ، دیوانہ وار شمع کی روشنی اور شعلے کی چاہ میں اس کی طرف لپکتا ہے شعلے کی چمک دمک کے آگے موت کی اذیت بھی اس کے لیے ہیچ ہوا کرتی ہے۔

یا الٰہی..... یا میرے پروردگار کسی قوم کے اہم اور موثر لوگ اتنی بڑی تعداد میں پروانوں کی طرح دولت اور ثروت پر نثار ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ نہ تھا، اخبار نئی بات کی ایک رپورٹ میں جو نام بتائے گئے ہیں ذرا وہ نام سنتے اور سر پیٹتے جائیے اور اگر شرم آئے تو شرماتے بھی جائیے۔

درویش منش سیاستدان ملک معراج خالد کے صاحبزادے زبیر خالد ایڈووکیٹ سے لے کر جنرل مشرف کے فرزند، بلال مشرف سابق بیوروکریٹ انور زاہد، اے زیڈ کے شیر دل، اکرم ذکی، تسنیم نورانی، شیخ رشید، جاوید ہاشمی، عمران خان، میاں نواز و شہباز شریف، حمزہ شہباز، سلمان شہباز، حنیف عباسی، کون نہیں ہے جس نے دولت کے گٹر میں اشنان نہ کیا ہو، اسی طرح مختلف صحافیوں کے بھی نام آتے ہیں جو آج کل چیف جسٹس کو قصور وار اور ملک ریاض کو مخیّر ''حاتم طائی'' اور سارے شرعی عیوب سے پاک ''حاجی'' ثابت کرنے کی کوشش میں میڈیا پر میک اپ کر کے ۷ر سے ۱۱ر بجے تک سرمائے کی ''دھن'' پر ناچتے نظر آتے ہیں۔ اور ان سب میں سے اگر کوئی یہ دلیل دیتا ہے کہ ملک ریاض نے انھیں جو کچھ دیا وہ ''تحفتاً'' دیا تو کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ ان سے اس تحفے کی قیمت بھی وصول کرے گا اور آج وہ یہی کر رہا ہے اور وہ اس کے دیے ہوئے تحفوں کا تاوان ادا کر رہے ہیں..... کچھ بول کر کچھ خاموش رہ کر.....

دکھ اسی بات کا ہے کہ ملک ریاض نے کسی کو پلاٹ، کسی کو دکان، کسی کو بلٹ پروف گاڑیاں کسی کو دبئی یا بیرونِ ملک ولاز کسی کو اشتہاروں میں رعایت، کسی کو جلسے میں مالی معاونت اور کسی کو کوئی اور سہولت دے کر کہیں اپنی مرضی کا بیان دلوایا اور کہیں جہاں بولنے، بیان دینے کی ضرورت تھی وہاں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا وہ لوگ جو چیف جسٹس کو ''ولیوں'' سے نیچے درجہ نہ دیتے تھے، ملک ریاض نے ان کی زبانیں اور قلم ایسے ''خریدے'' کہ جون ایلیاء کا شعر چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہا.....

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان پہ کیا؟

افسوس اس بات کا ہے کہ ملک ریاض نے ہمارے معاشرے کی نفسیات اور اخلاقیات کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا ہے کوئی اس سے سوال کرنے والا نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ جو عدلیہ کے ساتھ کھڑے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، ملک ریاض کے خلاف ایک لفظ بولنے کو تیار نہیں، ن لیگ جو ہر معاملے میں فریق بن جاتی تھی NRO سے لے کر میموگیٹ سکینڈل تک عدالت میں جانا فرض سمجھتی تھی اس نے ایک لفظ چیف جسٹس کے حق میں اور ملک ریاض کے خلاف نہیں بولا کیسے بولے.....؟؟؟ سب کو کچھ نہ کچھ دے کر ریس کے گھوڑوں کی طرح ان کے وجود، دل اور ذہنوں پر ملک ریاض نے اپنے نام کی ''مہر'' لگائی ہوئی ہے۔

ایسا لگتا ہے پورا معاشرہ اور معاشرے کا ہر شعبہ اور ہر شعبے کا تقریباً ہر اہم فرد بکاؤ ہے اور سرمایے اور دولت کے آگے ناچنے کے لیے رقص کرنے کیلئے تیار اور بے چین ہے جیسے طوائفوں کی محفل میں طوائف لپک کر اس تماش بین کی طرف بڑھتی ہے جس کے ہاتھ میں

ڈیفنس ولاز پنڈی میں عریاں بُت

ہم

نصب کر رہا ہے۔ ہماری انتظامیہ سے گزارش تھی کہ اس کی جگہ پر کوئی خوبصورت سی کیلی گرافی میں اللہ کا نام نصب کر دیں۔ ادائی ہم سب خواتین مل کر کر دیں گی مگر شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار میرے خیال میں ملک ریاض تک خواتین کی درخواست کو نہیں پہنچنے دیتے۔ یہاں بہت خوبصورت مساجد ہیں جہاں خواتین کی بھی نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اتنی اچھی مساجد کے نزدیک بتوں کی تنصیب چہ معنی دارد! مجھے لکھنا نہیں آتا اور شاید میں اپنا مافی الضمیر بھی ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکی۔ لیکن آپ کے اٹھائے ہوئے موضوعات میں یہ موضوع شاید آپ کے دست قلم کے نیچے آ کر ہماری بات کئی لوگوں تک پہنچا سکے کہ بت شکن بنیں بت ساز مت بنیں۔

مسز فاروق
سیکٹر F ڈیفنس ولاز
DHA اسلام آباد

یہاں ڈیفنس ولاز پنڈی میں رہتے ہیں۔ یہاں انتظامیہ نے کسی نہ کسی چوک میں عریاں زنانہ بُت لگائے ہیں جو دیکھنے میں نہایت ناگوار محسوس ہوتے ہیں۔ ہمارے چوک میں جو بُت لگے ہیں وہ کپڑے پہنے ہوئے بھی عریاں ہیں۔ خواتین وفد بنا کر انتظامیہ کے پاس گئیں۔ درخواستیں لکھیں کہ برائے مہربانی انھیں ہٹا دیں یا کپڑے پہنا دیں۔ مگر ڈھاک کے تین پات۔ یہ Defence Villas بحریہ کے ساتھ DHA کا Joint Venture ہے۔ مجھے یہاں آئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ میرے بچے جب کہیں سے گزریں تو اُن کے منہ سے نکلتا ہے یہ کیوں French four seasons کے Statues لگائے ہیں۔ یہ کیوں Egyptian water Gods کے Statues لگے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مطلب ہے لگانے والے کو بھی نہیں پتا کہ وہ کیا اور کیوں یہ

ملک ریاض کی دولت کے گٹر سے اشنان کرنے والوں میں سیاستدان، صحافی، جرنیل اور بیوروکریٹ سبھی شامل ہیں

۲/۲

نوٹوں کی گڈی نظر آئے، یہی لگتا ہے کہ جیسے ہر اہم شخص ملک ریاض سے کہہ رہا ہو کہ ''میں جو کچھ کرنے کیلئے ، ہر قسم کا ناچ دکھانے کو تیار ہوں۔''

شرم اور گھن آتی ہے کہ ہم ایسے معاشرے میں سانس لے رہے ہیں اور زندہ ہیں جہاں ملک ریاض جیسا شخص تقریباً پورے معاشرے کو نوٹوں کی طاقت کے بل پر انگلیوں پر نچا رہا ہے اور معاشرے کے ہر اہم شعبے کے تقریباً تمام اہم لوگ کورس میں مل کر گا رہے ہیں......

مینوں نوٹ وکھا میرا موڈ بنے

اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ ایک گانے کے بول تھے، شاید جسے ایک زمانے میں ''بین'' کر دیا گیا تھا۔ معاشرے کی تنزلی کا اندازہ کیجیے کہ جو بول کبھی معاشرہ سننے کے لیے تیار نہیں تھا آج معاشرے کے بے شمار اہم افراد اس بول کی مجسّم تصویر نظر آتے ہیں۔

رہ گئی بات چیف جسٹس کے بیٹے کی تو قرآن، اسلام، اور دنیا کا کوئی بھی قانون بالکل واضح ہے کہ باپ بیٹے کی قبر میں نہیں جائے گا اور بیٹا باپ کی قبر میں جا کر اس کے کیے کا حساب نہیں دے گا۔ ولیوں کے گھر چور اور چوروں کے گھر ولی پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ولی کی ایک کیا دس اولادیں بھی چور نکل آئیں تو ولی، ولی ہی رہے گا۔ چور کو چور ضرور کہیں ولی کو نظروں اور دل سے گرانے کی غلطی نہ کریں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ چیف جسٹس بھی ایک عام انسان ہیں کوئی ولی نہیں ہیں لیکن ان پر تنقید کرنے والے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ وہ جیسے بھی ہیں کیا ان جیسا بھی معاشرے میں کوئی دوسرا نظر آتا ہے بقول فیض......

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

اس کہانی کے ۳؍مختلف کردار ہیں اور ان تینوں کرداروں کا اصل ''کردار'' قوم کو پہچاننا ہوگا...... مکار، جھوٹے، فریبی، کرپٹ، دغاباز، ، سازشی...... دیانت دار، ایماندار، درمند، ہمدرد، صابر، پرعظم......اور چور، عیاش، ہوس زر میں مبتلا بھٹکے ہوئے، اسلاف کی برسوں کی کمائی ہوئی عزت کو بٹہ لگانے والے کرداروں میں قوم کو فرق کرنا پڑے گا ورنہ قوم کے اداروں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اثاثے بھی تباہ ہو جائیں گے۔ ادارے تو شاید دوبارہ بن بھی جایا کرتے ہیں لیکن کوئی قوم اخلاقی طور پر مفلس اور خالی ہاتھ ہو جائے تو دامن بھرنے اور اعتماد بحال ہونے کیلئے برسوں نہیں شاید صدیاں چاہیے ہوتی ہیں۔

جب سے چیف جسٹس کے بیٹے کے بارے میں ثبوت اور حقائق سامنے آنا شروع ہوئے ہیں منیر نیازی کا شعر رہ رہ کر یاد آرہا اور دل کو تڑپا رہا ہے......

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

میرے آقا ﷺ نے صدیوں پہلے فرمایا تھا ''میری اُمت کے لیے ۲؍چیزیں فتنہ ہیں، مال اور اولاد'' آج قوم دونوں فتنوں کا سامنا کر رہی ہے ایک فتنہ مال کی علامت ہے تو دوسرا بگڑی ہوئی اولاد کا......

(بشکریہ نئی بات)

اچھی

مائیں اور اچھے استاد معاشرے کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، جبکہ ہمارے ہاں اُن سے عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ آج کل عزت اُن کو دی جارہی ہے اور وہی اقتدار کے مالک ہیں جنھیں گھناؤنے جرائم کی سزا میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے یا اُن کی گردنوں میں پھانسی کا پھندا ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو پاکستان داخلی طور پر اس قدر توانا اور خاندان کے ایک مضبوط نظام کے تحت اتنا مستحکم ہے کہ اس پر غارت گری کے بار بار حملوں کے باوجود وہ عالمی برادری میں اپنی جداگانہ حیثیت کے ساتھ قائم ہے۔ دراصل ہماری سوسائٹی میں لاکھوں کی تعداد میں گم نام ہیروز جن کا تعلق متوسط گھرانوں سے ہے، اپنی دیانت داری، فرض شناسی اور اعلیٰ درجے کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ریاست کا بار اُٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ وہ جاں نثار سپاہی اور بہادر افسر ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر امریکی دہشت گردی کے سامنے سینہ تانے کھڑے ہیں اور ملکی سلامتی اور خودمختاری کا علم بلند رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہیروز وہ اساتذہ ہیں جو بڑی لگن اور پوری ذمے داری سے ہماری نئی نسل کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کررہے ہیں۔ اسی طرح وہ محنتی، زیرک اور ہر طرح کے لالچ سے بے نیاز ڈاکٹر، انجینئر اور سرکاری عمال ہیں جو بہتی گنگا میں اشنان کرنے کے بجائے عوام کی خدمت پر مامور اور اُن کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے میں نہایت مؤثر اور خاموش کردار ادا کررہے ہیں۔ ان بے نفس اور نیک سیرت انسانوں کی معاشرے میں آج بھی بڑی قدرومنزلت پائی جاتی ہے اور اسی رسمِ وفا سے ہماری اُمیدوں کے چشمے پھوٹتے رہتے ہیں جن میں ربِ کریم کی رحمتوں کا فیضان سب پر حاوی ہے۔

۵ر جون کی شام ہماری آنکھوں نے اللہ کی طرف سے نزولِ رحمت کا ایک روح پرور منظر دیکھا اور ذہن پر ایک بڑا نقش ثبت ہوگیا کہ وہی لوگ دلوں میں آباد رہتے ہیں جو اصولوں پر چلتے اور انسانوں کے کام آتے ہیں۔ اس روز ایک شفیق استاد اور ایک عمدہ انسان جناب عبدالکریم اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے اور اس وقت آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ اُنھیں غسل دیا تو موسم یک لخت خوشگوار ہوگیا اور جب اُن کا جنازہ اُٹھایا گیا تو ہلکی ہلکی پھوار کا سماں پیدا ہوگیا۔ ہر شخص کہہ رہا تھا اس نیک بندے پر خاص رحمت کا نزول ہے۔ کلفٹن کالونی لاہور کی گھاٹی میں دور دور تک صفیں بنتی جارہی تھیں اور لوگ کشاں کشاں ایک ایسے شخص کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے آرہے تھے جس کے پاس کوئی منصب تھا نہ دولت کے انبار۔ اُس کا تمام تر سرمایہ اُس کی سادگی، قناعت پسندی، دیانت داری، لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور کردار سازی کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ وہ اپنی نوجوانی ہی سے پاکستان کی عظمت اور قدرواہمیت کا گہرا ادراک رکھتے تھے کہ وہ بھارت کے صوبے مدھیا پردیش سے تن تنہا اس ملک میں ہجرت کر کے آئے تھے جو لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں میں دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اُن کے باطنی وجدان نے اُنھیں اپنے خاندان کو چھوڑ کر زندگی کے ایک نئے اور کٹھن سفر کو اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی غلامی سے نکل کر ایک آزاد فضا میں اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے آرزومند تھے، اُن کی آنکھوں میں خوبصورت خواب سجے ہوئے تھے۔ پاکستان میں آئے تو وہ ایف اے پاس تھے، لیکن اُنھوں نے محنت مزدوری کر کے اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ کیا اور این ڈی ہائی اسکول اچھرہ سے وابستہ ہوگئے۔ اپنی اچھی عادات اور غیر معمولی پیشہ ورانہ مہارت، ایک بڑے قرینے اور وقار کے ذریعے اُنھوں نے اساتذہ اور طلبہ میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ اُن کی صاف گوئی، اُن کی فرض شناسی اور اُن کی خیرخواہی ضرب المثل بن گئی تھی۔ وہ غریب طلبہ کو اسکول کے بعد بلامعاوضہ اضافی وقت دیتے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل کرتے رہتے۔

اُن کی زندگی میں ایک عظیم تبدیلی اس وقت آئی جب اُن کی شادی ایک عظیم شخصیت غازی خدابخش کی صاحبزادی عابدہ بیگم سے ہوئی۔ جناب خدابخش کو ڈوگرا فوجوں کو شکست دینے کے اعزاز میں ''غازی'' کا خطاب ملا تھا اور وہ اپنے علم و تقویٰ کی بنیاد پر مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نائبین میں شامل کر لیے گئے تھے، جبکہ اُردو ادب کے عظیم نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ انھیں اپنے ذاتی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ غازی صاحب کی صحبت کے عبدالکریم صاحب کی شخصیت پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور اُن کے اندر آگے بڑھنے کا داعیہ تیزتر ہوتا گیا۔ انھوں نے ملازمت کے دوران انگلش میں ایم اے کیا اور پوری توجہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کردی۔ وہ خاندان کے متعدد نوجوانوں کو تعلیم دلانے کی خاطر کئی کئی ماہ اور کئی کئی سال اپنے گھر پر رہنے کی سہولتیں فراہم کرتے رہے اور اُن کے دامنِ تربیت سے ہزاروں طلبہ کی کردار سازی ہوئی جو ملک میں اور ملک سے باہر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ وہ ۴۰ر برس سے زائد عرصہ کلفٹن کالونی میں مقیم رہے اور اہلِ محلّہ کی بھلائی اور بہبود میں ہر آن سرگرم دکھائی دیے۔ وہ جس طرح عبادات کی ادائی کا بڑا خیال رکھتے، اسی طرح انسانی معاملات کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتے۔ اُن کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد قرآنِ حکیم کی تلاوت کرنے اور اشراق کے نوافل پڑھنے کے بعد ناشتا کرتے اور تمام نمازیں باجماعت ادا کرتے تھے۔ اسی انہماک سے وہ بندوں کے حقوق پر خصوصی توجہ دیتے۔ اُن کی باتوں میں کمال درجے کی سادگی، خوش خلقی اور صداقت پائی جاتی تھی۔

میرا اس خاندان سے قریبی تعلق اس وقت قائم ہوا جب میری شادی اُن کی بیگم کی چھوٹی بہن شاہدہ سے ہوئی۔ اُن کے اخلاق اور حُسنِ معاشرت سے متاثر ہوکر میں نے اپنے بیٹے کامران کی شادی بھی عبدالکریم کی بڑی صاحبزادی نبیلہ سے کی جو ہمارے لیے بڑی طمانیت کا باعث بنی ہے۔ دراصل متوسط اور درمیانے طبقے ہی سے گوہرِ نایاب دستیاب ہیں۔ اُن کے ۲ برادرِ نسبتی عبدالمالک اور عبدالقیوم لاہور میں بچیوں کا ایک مدرسہ چلا رہے ہیں جس میں غریب لڑکیوں کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ٹریننگ اور سلائی کڑھائی کی تعلیم دی جاتی ہے اور کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ فلاحی سرگرمیوں کا ایک سلسلہ جاری ہے جو ایک خوبصورت کہکشاں کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ عبدالکریم صاحب کے تینوں بیٹے عبدالمتین، عبدالمبین اور ارسلان قیصر بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم رکھتے ہیں۔ عبدالمتین پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور اُن کے اندر تعلیمی استعداد میں اضافے کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی کے مراحل تقریباً طے کر چکے ہیں جو اُن کے خاندان اور پورے پاکستان کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اُن کو یہ صلہ اپنے والدین کی خدمت اور اطاعت کی بدولت حاصل ہوا ہے۔

شفیق استاد کی بیٹیاں نبیلہ، انیلہ، عدیلہ، سعدیہ اور طیبہ بھی اپنے والد اور والدہ سے عمدہ تربیت پانے کے سبب اپنے اپنے دائروں میں اصلاحی اور فلاحی کاموں اور مشاغل میں پیش پیش ہیں۔ خوش قسمتی سے کریم صاحب کے داماد اُن کے قدردان اور خدمت گزار ثابت ہوئے ہیں۔ انتہائی بالغ نظر اور اطاعت شعار جناب افتخار احمد، امجد اسحاق، عبدالحی اور کامران ان کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ ارسلان جو انگلستان میں ہیں وہ بھی اسلامی تعلیمات کا مکمّل جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ کریم صاحب کی اہلیہ عابدہ بیگم نے اپنے شوہر کی شخصیت نکھارنے اور ان کی خدمت بجالانے کی ایک عظیم روایت قائم کی ہے۔

جنازہ اُٹھانے سے پہلے میں نے عبدالکریم صاحب کا چہرہ دیکھا، وہ پُرنور تھا اور اُن کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ رقص کناں تھی جو اس اَمر کی شہادت دے رہی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں گمنام ہیرو ہیں جو آسودہ زندگی پر شاداں ہیں۔ قوی اُمید ہے کہ قیامت کے روز اُن کا اعمال نامہ اُن کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور یہی مومن کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہماری اشرافیہ کی ستم گری سے ایسے عظیم لوگوں کا قحط پڑنے لگا ہے اور اب اُنھیں چراغِ رُخِ زیبا لے کر ڈھونڈنا اور اُن کی صحیح معنوں میں حوصلہ افزائی کرنا ہوگی۔

جولائی ۲۰۱۲ء

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

اسلامک کوئز

۲۰۰۰ روپے کی کتب کے انعامات

مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) مبشر احمد (دوالمیال، چکوال)

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہِ جون میں چھپنے والے اسلامی کوئز کے درست جوابات

کوئز نمبر۱ (الف) غزوہ مریسیع، (ب) شعبان ۵ ہجری کوئز نمبر۲ (الف) غزوہ موتہ، (ب) جمادی الاول ۸ ہجری

درست جوابات دینے والوں کے نام

سید مخدوم نقوی (لاہور)، فرہاد علی (دلیروی)، فرقان احمد اعوان (گوجرانوالہ)
فضل داد (جہلم)، آصفہ زاہد (شیخوپورہ)، خرم شہزاد بھٹی (ڈونگہ بونگہ)، محمد اسمٰعیل (ڈونگہ بونگہ)
اقراء شہزادی (قبولہ شریف)، عدیل عباس، محمد اویس دانش (نواب شاہ)، محمد دوریز (اسلام آباد)
مسز حرا ہارون (گوجرانوالہ)، اویس علی (فیصل آباد)، ام محمد بلال (بہاولنگر)، مرزا استعفار بیگ (حیدرآباد)
مرزا فرحال بیگ (حیدرآباد)، طٰہٰ یٰسین (حیدرآباد)، معراج محمد (گاؤں خوشی آباد) عمران سلمان (شیخوپورہ)
ورتہ خلیل (دینہ)، سعید الرحمٰن (کراچی)، سیف الاسلام (لاہور)، معاذ امین (راولپنڈی)
صبا شاداب (بینظیر آباد)، ضیاء اللہ (سوات)، جنید احمد (راولپنڈی)، زرنگار (فاروق آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ زینت ممتاز (قبولہ شریف)، ۲۔ محمد افضل کاسی (کوئٹہ)، ۳۔ نصرت منیر (نواب شاہ)، ۴۔ عنایت اللہ (بنوں)

اسلامی کوئز ۱

روم کے بادشاہ ہرقل نے حضور ﷺ اور مسلمانوں سے جنگ کے لیے اپنی فوج جمع کرلی۔ جب یہ اطلاع حضور ﷺ کو ملی تو آپ نے ''اسلامی جہاد'' کا عام اعلان فرمایا۔ ایسے اہم اعلان کے وقت معذوروں کو چھوڑ کر ہر مسلمان کا جہاد میں نکلنا فرض ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ سخت گرمی کا تھا۔ ملک میں خشک سالی اور قحط پڑا ہوا تھا۔ لوگ فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ صورتِ حال کے پیشِ نظر اس غزوہ کو ایک مخصوص نام دیا گیا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو جہاد کے لیے تیاری کا حکم وحی کے ذریعے دیا۔

(الف) اس غزوہ کا کیا نام ہے اور یہ کب ہوا؟ (ب) قرآن حکیم کی کس سورۃ میں اس جہاد کا حکم ملا؟

اسلامی کوئز ۲

اہلِ اسلام کا اہلِ کفر سے یہ مقابلہ بہت سخت تھا۔ کفار اپنی تعداد اور ساز و سامان کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی اور سامان جنگ بھی پوری طرح مہیا نہ تھا۔ موسم شدید سردی کا تھا۔ کچھ کمزور ایمان، بوڑھے اور ضعیف لوگ ایسے تھے جو اللہ تعالیٰ کے بارے خیال کرنے لگے کہ دیکھیں اللہ تعالیٰ اب کیا کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام کی نصرت و مدد فرماتے یا انھیں شکست و ہزیمت سے دوچار کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام صحیح و سالم بچتے یا ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اس وقت اہلِ اسلام میں کچھ لوگ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے۔ چنانچہ اس جنگ کی پوری تصویر کشی ایک سورہ میں بیان کی گئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے امتحان اور انعامات کا ذکر کیا۔ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک لشکر بھیج دیا جنھیں دیکھ کر کفار ڈر اور گھبرا گئے۔

(الف) اس غزوہ کے کون سے ۲ نام ہیں؟ (ب) قرآن کریم کی کون سی سورہ میں اس غزوہ کا ذکر ہے؟

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

ہیڈ آفس: بیرون منصورہ، ملتان روڈ لاہور

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اُردو ڈائجسٹ

325-جی III، جوہر ٹاؤن لاہور

گوشہ قارئین

چمنِ خیال

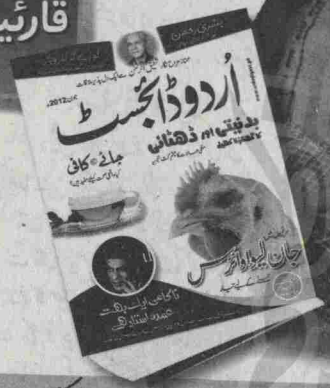

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

انٹرویو تعلیم کے شعبے کی اہمیت کا غماز

آپ نے جون ۲۰۱۴ء کے شمارے میں پریذیڈنٹ سٹی یونیورسٹی کے انٹرویو کی اشاعت کے ذریعے ہماری جو حوصلہ افزائی فرمائی، اس پر سٹی یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور کی انتظامیہ آپ کی تہ دل سے مشکور و ممنون ہے۔ آپ کی طرف سے کی جانے والی یہ عزت افزائی درحقیقت تعلیم کے شعبہ کو ملنے والی اہمیت کی غماز ہے۔ اس شکریہ کو قبول فرمائیں۔

ایک چھوٹی سی استدعا یہ ہے کہ آپ نے پریذیڈنٹ صاحب کا نام ''محمد صبور سیٹھی'' کے بجائے عبدالصبور سیٹھی لکھا ہے۔ اگر اگلے شمارے میں اس کی تصحیح کردی جائے تو یقیناً بہتر رہے گا۔ ایک مرتبہ پھر شکریہ قبول فرمائیں۔

(ظفر احمد، رجسٹرار، سٹی یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی پشاور)

کارواں کے دل سے

''آزادیٔ مقبوضۂ کشمیر کی خاطر بھارت سے اٹھتی آوازیں'' بیگم تنویر لطیف کا مضمون بہت خوب ہے۔ خصوصاً ایک کشمیری نوجوان کا یہ الوداعی فقرہ کہ ''دیدی! پاکستان کو سنبھال کر رکھنا ہماری خاطر'' لیکن جن لوگوں کے ذمے پاکستان کو سنبھال کر رکھنے کی ذمے داری ہے انھوں نے پاکستان کا جو حشر کردیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے لیکن اپنے آپ کو قائداعظم کا جانشین کہنے والے آج کشمیر کا نام تک لینے سے کترانے لگے ہیں۔ ''کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا'' ہمارے تمام دریا کشمیر سے گزر کر آتے ہیں۔ بھارت پاکستان کو مختص کیے گئے مغربی دریاؤں پر ۵۰ سے زائد ہائیڈرو پاور پراجیکٹس تعمیر کر رہا ہے، اس کا کہیں تذکرہ تک نہیں ہوتا۔ آپ ملک و قوم کے مفاد میں ان مسائل پر توجہ دلاتے رہیں اور کشمیر پر مضامین شامل اشاعت کرتے رہیں۔

(انجینئر انور حسین مجاہد۔ لاہور)

جہلم کا ڈپٹی کمشنر

جون کے شمارے میں سات رنگ، حضرت عبدالرحمٰنؓ

بن عوف کے متعلق مضمون، انسانی ذہانت، کوئی موازنہ سا موازنہ، نخلستان، جناب الطاف حسن قریشی کا تجزیہ پسند آئے۔ ''مشورہ حاضر ہے'' کا سلسلہ اچھا ہے۔ پاکستان کی سیاحت کے حوالے سے ضرور کچھ ہو جیسا کہ اس شمارے میں جہلم کا ڈپٹی کمشنر تھا جو بہت پسند آیا۔

(محمود منور خان۔ بمقام کوٹ سنبلا والہ میانی)

رسالے کا حلیہ سنوار دیا

محمد رفیق ملک نے رسالے کی نئی ہیئت کے بارے میں لکھا ہے: ''آپ نے تو رسالے کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔''

میں آپ کے توسط سے (یا وساطت سے) اُن کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے رسالے کا حلیہ بگڑا نہیں بلکہ پرچے کا حلیہ سنوار دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پرچہ نکھار دیا گیا ہے۔ آپ نے ملک صاحب کی بزرگی کا خیال رکھتے ہوئے مؤدبانہ پیرایہ اظہار اختیار کیا۔ یہی آپ کو زیب دیتا ہے۔ ملک صاحب ماشاء اللہ سمجھ دار اور کہن سال شخص ہیں۔ میں حضرت اقبالؔ کا ایک شعر اُن کی نذر کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کے ذریعے ملک صاحب کے دل میں میری بات اتر جائے گی۔ تو جناب شعر ہے ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

مشینی دور میں وقت کی کمی

مجھے اُردو ڈائجسٹ کا یہ انداز بے حد پسند ہے کہ اس میں طویل مضامین یا کہانیاں نہیں ہوتیں۔ چار پانچ صفحات کی تحریریں بندہ ایک نشست میں بہ آسانی پڑھ لیتا ہے۔ آج کل کے مشینی دور میں پیسے کی نہیں وقت کی کمی ہے۔ رسالہ کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے آپ کے لیے اور تمام ادارے کے لیے کامیابی اور صحت کی دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابیاں و کامرانیاں عطا فرمائے۔

(محمد خلیل چودھری۔ دینہ)

اسلامی کوئز

میری عمر چاہے ۱۷ سے ۲۸ سال کے درمیان نہیں بلکہ دونوں کے مجموعے سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے اس کے باوجود میں نے سوچا کہ اپنا شوق پور کروں۔ سچی بات ہے اسلامی تاریخ سے مجھے بہت دلچسپی ہے حالانکہ ساری عمر سائنس پڑھی پڑھائی ہے۔

(آپ کی کوشش کا بے حد شکریہ۔ آپ کے لیے ہمارا دوسرا کوئز موجود ہے ناں!)

(اُمِ ہلال۔ مدنی کالونی بہاولنگر)

دائمی خوشی کا محور

ماہ جون کے رسالے کا تذکرہ بے حد ضروری ہے معلومات اور خوبصورتی کا شاہکار تھا۔ خاص کر دردِ دل پہ دستک خوب تھا۔ میں اس وجہ سے بعد نمازِ فجر اپنے والدین کے لیے ایک بار سورہ فاتحہ پڑھتا ہوں۔ اس طرح ہر روز اپنے والدین سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ شاہ رخ خان کی منفرد قابلیت نے ان کا یہ رخ بھی دکھا دیا کہ دائمی مسرت کا محور بچے ہی ہوتے ہیں۔ بچے جو من کے سچے ہوتے ہیں۔

(نفی حسین نقوی امروہوی۔ کراچی)

جنریشن گیپ۔ شاہ رخ کا خطاب

اردو ڈائجسٹ تو نسلوں کا ساتھی ہے۔ ہمارے والد صاحب مرحوم نے ۱۹۶۲ء سے گھر لانا شروع کیا اور پھر اب میرے بیٹے بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ بلکہ پچھلے دنوں بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا (عمر ۷ سال) بھی اس کی ورق گردانی کرتا پایا گیا اور اب جو گیٹ اپ ہے وہ تو عالمی سطح پر مانا جائے گا۔ اور اس میگزین میں کیا نہیں ہے۔ رول ماڈل، اپنی زبان میں، افسانے، افسانچے، جدید معلومات، ہونہار پاکستانی طالب علم کی کہانی، حج کی بات، سائنسی افق، نئی ایجادات، کوئز اور قارئین کے خطوط۔ سبحان اللہ! کسی کو اور کیا چاہیے؟ اب بھی ہمارے ایک محترم قاری اعتراض کریں تو میں تو یہی کہوں گا کہ ان جیسے لوگ ہی جنریشن گیپ کے مرتکب رہتے ہیں۔ شاہ رخ کا خطاب

پڑھنے کے لائق تھا۔

بشریٰ رحمٰن پھر نمبر لے گئیں، کیا بات ہے۔ سلمیٰ اعوان نے بھی دھوم مچا دی پھر تاریخ کا سفر اور..... اور سب لکھا تو تمام خطوط اگلے ماہ کے لیے رکھ دیے جائیں گے۔ ایک عرض ہے کہ مطالعے کی میز پر جو کتب تبصرہ کے لیے لی جاتی ہیں ان کی قیمت بھی کم ہونی چاہیے مثلاً عام قاری کے فقیر اور فقیر رنگ جیسی اچھی کتب سے محض چھے چھے سو قیمت کی وجہ سے محروم رہتا ہے اور جب لکھنے والے اتنے دین دار اور شاہ صاحب کو کمی کس چیز کی ہے وہ تو ایسی کتب کی قیمت ۲۰۰ روپے تک رکھ سکتے ہیں۔ کیا میری بات کی گونج ان تک جائے گی!!!

میں ممنون و مشکور ہوں کہ مجھے باقاعدگی سے ہر ماہ میرا پیارا ساتھی مل رہا ہے۔ آپ کے ساتھ انتظامیہ اور قریشی برادران کے لیے دل سے دعائیں۔

(جاوید احمد صدیقی۔ راولپنڈی)

ٹائٹل اچھا نہیں لگا

میری کہانی چھپی۔ اچھا لگا مگر ٹائٹل بالکل اچھا نہیں لگا۔ ذرا غور کیجیے سٹیو جابز، بل گیٹس نے تو انسانیت کے لیے کچھ نہ کچھ کیا لیکن ہیری پوٹر اور شاہ رخ خاں جیسے اداکاروں نے کیا کیا؟ ٹائٹل کو پاکستانی رکھا کریں۔

(زاہدہ! آپ کی سوچ کے اعتبار سے تو ان سب نے کچھ نہیں کیا۔ پاکستانی جو نہیں تھے۔ انفارمیشن کی دنیا ہے۔ ہر چیز کے کئی پہلو ہیں جو ہم اپنے قارئین کے لیے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ ذرا اسے بھی دیکھ لیا کریں۔ ہم نے کون سا اس کے فلمی کارنامے بیان کیے ہیں۔ ویسے بھی ہیرو کو زیرو اور زیرو کو ہیرو بنتے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ ایک انٹرویو، ایک تحریر اور بس)

(ڈاکٹر زاہدہ ثقلین۔ بہاولپور)

بزنس رول ماڈلز۔ تازہ ہوا کا جھونکا

بزنس رول ماڈل کا سلسلہ نہایت عمدہ اور اپنی مثال آپ ہے۔ اسے جاری رکھیے گا۔ واقعی ایسے لوگ جن کے انٹرویوز آپ نے شائع کیے ہیں رول ماڈل ہیں۔ پاکستان میں ایسے لوگوں کی موجودگی تازہ ہوا کا جھونکا ہی تو ہے جو گلے شکوے کرنے کے بجائے اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔

(بے شک آپ کی بات درست ہے۔ بہت سے لوگ ترقی بھی کر رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ خدا کی ناشکری بھی کہ کچھ نہیں ہو رہا۔ کام نہیں ہے۔ منافع نہیں ہے۔ پھر شاید ان کے ساتھ ایسا ہو بھی جاتا ہوگا۔ بندہ جیسا سوچتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔)

(زرنگار۔ شیخوپورہ)

تندور میں کچی روٹیاں

میں نے ہمیشہ سے ایک خیال اپنے پلّے سے باندھ رکھا ہے کہ کچی روٹیاں دوبارہ تندور میں لگاؤں تاکہ وہ پک کر سرخ ہو جائیں۔ میرے لیے دُعا کریں کہ میں نانبائی بن جاؤں، آپ تو بن ہی گئے ہیں۔ زندگی میں بغیر لائن کے چلنا اور بغیر لائن کے صفحے پر لکھنا میرے لیے محال ہے۔ راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اولڈ مین کے قلمی نام سے لکھنا چاہتا ہوں کیا کروں؟

(قبلہ! آپ تو خود راہنما یعنی نانبائی ہونے والے ہیں۔ بس اللہ کا نام لیں اور سوچ سمجھ کر تندور میں تحریری روٹیاں لگانا شروع کریں۔ ہاں یہ اولڈ مین والا آئیڈیا پسند نہیں آیا۔ اچھا خاصا معقول نام ہے آپ کا اپنا۔ اللہ معاف کرے ہم تو سمجھے تھے کہ ایڈیٹر ہو گئے ہیں، آپ نے نانبائی بنا دیا۔ مرضی ہے آپ کی۔)

(علی بہادر۔ وزیر آباد)

مہم جوئی پر مضامین کیوں نہیں؟

بے شک رسالہ رنگین اور خوبصورت بنا دیا ہے مگر مضامین کے لحاظ سے ایک دم بے رنگ ہے۔ مہم جوئی، غیر ملکی ادب، پُراسرار کہانیاں، سائنسی کہانیاں، وغیرہ عنوانات پر مضامین اب دوربین میں بھی نظر نہیں آتے۔ ایک بات کے لیے آپ کی ہمت کو داد دینی پڑے گی کہ ''رسالہ کا حلیہ بگاڑ دیا'' کا عنوان گزشتہ شمارے میں شامل کیا شاید اسی نے میری ہمت بندھائی اور یہ سطور لکھیں۔ آپ کا یہ کہنا درست ہے ''اتنے لمبے ساتھ میں تبدیلیاں بعض اوقات واقعی پسند نہیں آتیں۔''

(آپ دوربین سے کہاں دیکھتے رہتے ہیں۔ فہرست میں تو یہ سارے موضوعات موجود ہوتے ہیں، مہم جوئی بھی اور کہانیاں بھی)

(محمد رحیم خان۔ ماڈل کالونی، کراچی)

شاعری بھجوانے کی دھمکی

اُردو ڈائجسٹ کی دل موہ لینے والی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ٹائٹل ہی اردو کا ہے۔ اب بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اردو کو پسند کرتے اور دل کی گہرائی سے سمجھتے ہوں گے ورنہ انگریزی کا جادو تو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہ ڈائجسٹ معاشرے کی اصلاح کا بہترین نمونہ اور انمول معلومات کا خزانہ ہے۔ اردو ادب سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے؟ مزید یہ کہنا چاہوں گی کہ میں نے دو بار پی ٹی وی میں اور ایک بار لاہور کے ماہنامہ ''پکار'' میں خطوط لکھے، لیکن کوئی ردِعمل نہیں ملا۔ پی ٹی وی میں ''اے نگارِ وطن'' کے نام سے شعروشاعری اور نغموں کا مقابلہ کرایا گیا۔ میں نے بھی ایک خستہ سی کوشش کی اور ملی نغمہ لکھ بھیجا۔ آج تک کسی قسم کا کوئی جواب نامہ موصول نہیں ہوا مجھے شعروشاعری سے بہت لگاؤ ہے۔ اب تک ''۱۴۷'' اشعار ''۵۰''، نظمیں، غزلیں لکھ ڈالی ہیں۔ اگر بھجوادوں تو میری شاعری کی اصلاح کردیں گے۔

(٭گزارشات ہیں ایک تو انعامی مقابلوں میں حصہ لے کر بھول جایا کریں۔ تحریر معیار پر ہوگی تو بلاوا آجائے گا یا منی آرڈر۔ معذرت نہیں آتی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہوتی۔ اس پر غصہ نہ کیا کریں۔ دوسری آپ نے شاعری بھجوانے کی دھمکی دی ہے۔ شاعری میں ہمارا اپنا ذاتی ہاتھ کافی تنگ ہے۔ اس لیے اصلاح تو دور رہی۔ پڑھنے کے لیے بھی وقت اور آمادگی دونوں کا مسئلہ ہے۔ مقامی طور پر ہی کسی شاعر استاد کو ڈھونڈیں جو یہ مشکل پتھر اٹھا سکے۔)

(رافعہ علیزئی۔ ڈلے والا، تحصیل دریا خان)

وہ تحریریں جو توجہ سے محروم رہتی ہیں

تمام نئے اور پرانے لکھنے والوں سے درخواست ہے کہ اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ کا کم سے کم استعمال کریں۔ جہاں بہت ضروری ہوگا وہ ہم خود کرلیں گے۔ سائنسی، طبی، تحقیقی مضامین میں جہاں انگریزی الفاظ کا استعمال ناگزیر ہو، وہاں ان الفاظ کا مناسب اردو ترجمہ ضرور لکھیں تاکہ ہمارے وہ معزز قارئین جو انگریزی زبان پر عبور نہیں رکھتے وہ آپ کے مضامین کو پوری طرح سمجھ کر ان سے کماحقہٗ استفادہ کرسکیں۔ جہاں سے مضمون، تحقیق یا نتائج لیے ہیں اس کا حوالہ اور ثبوت ضرور دیں۔ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ بھی ضرور لکھا کریں تاکہ انھیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح فارسی اشعار کا ترجمہ بھی ضرور لکھا کریں۔ بدقسمتی سے فارسی سمجھنے والے اب خال خال ہی ملتے ہیں۔ اپنی تحریر بھجواتے ہوئے چند اہم پہلو ضرور پیشِ نظر رکھیں۔ مضمون صفحے کے ایک طرف لکھیں۔ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ اور بائیں جانب ایک انچ کا حاشیہ ضرور چھوڑیں تاکہ ایڈیٹنگ کرتے ہوئے پریشانی نہ ہو۔ مضمون کے شروع میں عنوان کے بعد اپنا مکمل نام، پتا اور فون نمبر بھی صاف اور واضح لکھیں۔ ہر صفحے پر صفحہ نمبر بھی لکھیں۔ مکمل پتے اور فون کے بغیر موصولہ مضامین یا خطوط توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔

(مدیر اردو ڈائجسٹ)

۱۲/مسالے

والد صاحب کی یاد میں درِ دل پر دستک میں اولاد کی خاطر والدین کی جدوجہد، ایثار اور تڑپ نمایاں ہے اور اپنے لیے محبت اور دعا کی آرزو اور تمنا بھی۔ سیٹھی صاحب کے انٹرویو میں تو ایسا محسوس ہوا کہ سوالات، جوابات سے ذرا آگے ہیں۔ ایسی شخصیات کے انتخاب اور انٹرویو میں اگر کسی طور پر بھی معلوم ہوسکے کہ معاشرے کی فلاح کے لیے رضاکارانہ طور پر وہ کیا کررہے ہیں تو کچھ نامناسب نہیں ہوگا۔ اس سے ترغیب ہوگی۔ ڈائجسٹ میں تازگی اور عمدگی بارہ کے بارہ مسالے پورے کرنا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہیں۔ الحمدللہ مسالے پورے ہیں۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھ آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو

(ڈاکٹر ندیم اکرام۔ راولپنڈی)

مستقل کالم

خالی آرزو سے کب آبرو بڑھتی ہے!

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

میں لیپ ٹاپ پر سر جھکائے کافی دیر سے گم سم بیٹھا ہوں۔ میرے دونوں بچے کب کے سوچکے ہیں۔

اہلیہ نے بڑے ڈلار سے پوچھا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ سارے دن کے تھکے آئے تھے اب یقیناً ٹی وی نے سردرد کردیا ہوگا......!

میں نے دھیرے سے کہا، ٹی وی نے تو نہیں ۸/ماہ کے لیے نئے وزیراعظم کے انتخاب نے جہاں سردردی عطا کی تھی وہاں ایک اشتہار نے مسرور کردیا ہے اس پر سوچ جارہا ہوں۔ وہ اپنے رائٹنگ ٹیبل سے افسانہ لکھتے لکھتے اسے ادھورا چھوڑ کر میرے پاس آگئی ہے۔

مجھے اپنے لائف پارٹنر کی مزاج شناسی کی یہ خوبی بے حد عزیز ہے کہ وہ بن کہے جان لیتی ہے کہ کب مجھے کھانے پینے کو کچھ چاہیے اور کب کہنے سننے کو اس کا ساتھ چاہیے۔

اس کے آتے ہی میں نے کہنا شروع کیا ''میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرا بچہ جو بھی بنے پہلے ایک سچا انسان بنے۔''

میرا یہ جملہ سن کر وہ بے اختیار ہنس دی۔

''طبیعت واقعی خراب لگتی ہے آپ کی۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتی اور کہتی میں نے اسے بتانا شروع کیا یہ ایک انڈین کمرشل کے الفاظ ہیں۔ جسے ٹاٹا سالٹ بنانے والوں نے جاری کیا ہے۔ اللہ جانے کب بنایا۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے اور سرشاری کی کیفیت میں بیٹھا ہوں۔ میں نے کاغذ اٹھا کر اس پر جلدی سے لکھے آدھے پورے وہ لفظ پڑھنے شروع کیے جو اشتہار کے پس منظر میں بولے گئے تھے۔ اشتہار شروع ہوا تو ایک ماں گلاس میں تھوڑا سا نمک ڈالتی ہے۔

''میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرا بچہ جو بھی بنے پہلے ایک سچا انسان بنے۔'' ۸-۱۰/سال کا ایک خوبصورت بچہ باپ کے ساتھ میز پر شطرنج کھیل رہا ہے۔ باپ نمکین لیموں پانی پینے لگتا ہے تو وہ چپکے سے مہرے ہلا کر اپنا مہرا آگے کر دیتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے، ''شیطانی کرے، بے ایمانی نہیں۔'' (والد دیکھ کر مسکراتا اور بیٹا مہرہ واپس رکھ دیتا ہے۔) میوزیکل چیئر کا کھیل جاری ہے اور ہمارا ہیرو بچہ ایک چھوٹی لڑکی کو دھکا دے کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے ''بدمعاشی کرے لیکن بدمعاش کبھی نہ بنے'' اور وہ بچہ اٹھ کر اسی بچی کو کرسی پر بٹھا دیتا ہے۔ اگلا منظر اور بھی خوبصورت اور دل موہ لینے والا تھا۔ بچہ ایک دکاندار کے پاس کھڑا اور

اپنے گلک سے نکال کر اسے پیسے دیتا ہے۔ دکاندار پیسے واپس کرتا ہے وہ زیادہ ہوتے ہیں۔ آواز آتی ہے، ''اس کی گلک ہمیشہ بھری رہے مگر ایمانداری کے پیسوں سے۔'' بچہ زیادہ ملا ہوا نوٹ واپس کرتا ہے۔ دکاندار خوش ہو کر مسکراتا ہے۔ اب کمپنی کی طرف سے پیغام شروع ہوتا ہے اور کیا لاجواب الفاظ (کاپی رائٹنگ) ہیں۔

''اگر ہر ماں بچے کو چٹکی بھر ایمانداری روز دے تو دیش تو ایماندار بنے گا ہی۔'' ماں کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوتا ہے اور وہ کہتی ہے، ''آخر ہم نے بھی دیش کا نمک کھایا ہے۔''

''ٹاٹا نمک۔ دیش کا نمک''

واؤ! اس نے بے اختیار داد دی۔ ''بچوں کو دکھایا؟''

میں نے بتایا ''تین بار دکھایا، سمجھایا پھر ایک فضول سا اشتہار لگا، تو میں نے ٹی وی ہی بند کر دیا۔

''ایک بات کہوں'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا ''یہ تو آپ کے میڈیا والوں کو جو ہر خیال اور پروگرام چوری کرتے ہیں سبق سبقاً دکھانا چاہیے۔'' ''اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کابینہ کے اجلاس سے لے کر ہر تعلیمی اور کاروباری ادارے کے پالیسی سازوں کو بھی دکھانا اور سنانا چاہیے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

☆☆

رات نو دس بجے دفتر سے آ کر میں بالعموم ایک گھنٹہ ٹی وی دیکھتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا ٹاک شوز کافی وقت لے جاتے تھے۔ بھلا ہو مہر بخاری اور مبشر لقمان جیسے میزبانوں کا کہ انھوں نے اپنے جیسے کتنے پروگراموں کا کریز اور اہمیت ہی ختم کر دی۔ راجہ پورس کے ہاتھیوں نے بھی اپنے لشکریوں اور سپہ سالاروں کے ساتھ اس جیسا ہی کچھ کیا ہوگا۔ پلانٹڈ اور پیڈ پروگرام دیکھنے میں بھلا کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میزبان نے کسی سے پیسے لیے اور مفادات کمائے ہیں تو ایسے میں ناظرین کا کیا قصور کہ وہ آپ کے ارشادات عالیہ بھی سنیں اور آپ کے ممدوح کو بغور دیکھیں بھی۔ اس سے تو وہ اخبار سو درجے اچھے ہیں کہ ایسی سفارشی تصویروں اور خبروں کے نیچے لکھ دیتے ہیں ''Advertisement'' یا ''Advertorial''۔

میرے دونوں بچے اور میں باجماعت ''کلر ٹی وی'' کے ڈرامے تب تک دیکھتے ہیں جب تک کمر درد اور پتھر بچنے کا بازار نہیں سج جاتا یا جب اچانک کوئی انتہائی فضول اشتہار چلنے لگے جس پر میں گھبرا کر چینل بدل دیتا ہوں۔ یہ اٹھنے کا اشارہ ہوتا ہے۔ حالانکہ دل میں کہیں ڈر اور شرمساری بھی ہوتی ہے کہ جاتے جاتے وہ یہ بھی تو سوچ سکتی ہیں کہ بابا اکیلے بیٹھ کر یہ اشتہار دیکھیں گے۔ ممکن ہے وہ کبھی نہ سوچیں صرف میرا ڈر ہی ہو مگر ایسے ڈر سے ڈرنا ہی بہتر ہے۔

میں نے اہلیہ کو بتایا کہ جب سیاسی نجومیوں کے تبصروں، خدشوں اور وسوسوں کی کوفت اور بے زاری سے بھر کر میں اٹھنے والا تھا تو اچانک ''کلر'' پر ٹاٹا نمک کا اشتہار سامنے آ گیا اور میں حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ برسوں بعد کسی اشتہار کے آئیڈیے، سلوگن اور الفاظ نے اس قدر خوشی دی تھی۔ اشتہار دیکھتے ہی میں نے لیپ ٹاپ آن کیا اور اس سے متعلقہ ساری معلومات ڈھونڈ نکالیں۔ یہ اس سے کہیں کم وقت میں دستیاب ہو گئیں جتنی راجہ پرویز اشرف نے نائین زیرو میں ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر الطاف بھائی کی تقریر سننے میں گزارے۔ بے چارے پہلی بار خیر سگالی کے لیے گئے اور الطاف بھائی ۴۰ منٹ سے پہلے رکنا ہی بھولے رہے۔

یہ اشتہار عام پاپولر سوچ سے ۱۸۰ ڈگری کے فرق سے بنا تھا۔ ہمارے ہاں کبھی کبھی نورس والے بھول نہ جانا پھر پپا، نورس لے کر گھر آنا، کبھی ہمدرد نونہال کے ساتھ اخلاقی پیغام والا کوئی اشتہار ہوتا تھا۔

احمد فوڈ والوں کا جام اور جیلی کا اشتہار یوں شروع ہوتا تھا، ''صبح سویرے اٹھنا ہے یہ اچھی عادت۔ اللہ کے آگے جھکنا ہے سب سے اچھا کام۔ پھر جام اور جیلی کا نام اور پیغام ہوتا تھا۔ ایک دو بار کراچی سے ٹپال چائے والوں کا بھی اچھا اشتہار آیا تھا مگر ٹیلی فون کی کمپنیوں کے اشتہاروں نے تو سب روایتوں اور قدروں کو بلڈوز کر کے رکھ دیا۔

ٹاٹا جن کا سلوگن ہے ''Leader with Trust'' کوئی چھوٹی موٹی جذباتی کمپنی نہیں ہے۔ ۱۹۳۹ء سے قائم یہ کمپنی اب ۴۰۰ بلین روپے کی قیمت اور ورتھ رکھتی ہے ہر ماہ ٹاٹا نمک کے ۳۰۰ ملین (۳ ہزار لاکھ یعنی ۳۰ کروڑ پیکٹس) فروخت ہوتے ہیں۔ ۴۶۴۵ لوگوں کے ساتھ کام کرنے والی ٹاٹا کیمیکلز کا ہیڈ آفس ممبئی میں ہے۔ اس کے کارخانے گجرات، مہاراشٹر، یو پی اور مغربی بنگال میں ہیں۔ ۲۰۰۶ء سے ایک کمپنی خریدی جس کے کینیڈا، چیشائر، یوکے اور نیوجرسی (امریکا) میں پلانٹس کام کر رہے تھے۔ ۲۰۰۸ء میں ایک امریکی کمپنی کے ۱۰۰ فیصد شیئر ۴۰۰۰ کروڑ میں خریدنے کے بعد دنیا میں سوڈا ایش بنانے والی دوسری بڑی کمپنی بن گئی ہے۔ ۹۵۴۳ کروڑ روپے سالانہ ریونیو کی حامل ٹاٹا پیکٹ نمک بنانے والی بھارت کی سب سے بڑی کمپنی ہے۔ اس نے اس سال ''دیش کا نمک'' نام سے کی گئی طاقتور، مؤثر اور منفرد کمپین سے نمک کی برانڈ پوزیشننگ ہی بدل دی ہے۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اپنے آپ نہیں ہوا۔ ٹاٹا کے نائب صدر سیلز اور مارکیٹنگ کیپل مہرہ نے کہا:

''یہ درست ہے کہ سالوں سے ہم نمک کے خواص اور فوائد پر ہی فوکس کرتے رہے ہیں۔ ٹاٹا کو بطور لیڈر یہ ضرورت تھی کہ وہ بڑی سوچ کے ساتھ آئے۔ ہم نے جذبات کے ان پہلوؤں کو اس سے جوڑ دیا ہے جو بہت بنیادی اور ضروری ہوتے ہیں۔'' تب اس نے زور دے کر کہا، اس سوچ نے ٹاٹا نمک کو صحت اور ذائقے کی کیٹگری یا شیلف سے اٹھا کر جہاں یہ ہمیشہ سے اپنی ''پیورٹی'' (Purity) کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا، اب اسے کروڑوں لوگوں کے دلوں سے جوڑ دیا ہے۔

یہ ایک بہترین مثال ہے کہ کیسے صرف پیسا کمانے والے کارپوریٹ اداروں کا ذہن بدلے تو صرف دس پیسے کے نمک سے بھی ملک کے ہزاروں بے سہارا بچوں کو چھت، حفاظت، عزت اور تحفظ مل جاتا ہے اور تخلیقی طور پر کیے اور سوچے کام کی وجہ سے آپ ایک ایسی نئی پہچان پا لیتے ہیں جو نقل کرنے والوں کو یا مکھی پر مکھی مارنے والوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اب یہ بات راجہ صاحب کو، زرداری صاحب یا قائم علی شاہ کو سمجھانا بہرحال آسان نہیں ہاں کائرہ صاحب یا پنجاب کے خادم اعلیٰ یا نئے نئے بنے نائب وزیراعظم پرویز الٰہی تو سمجھ سکتے ہیں۔ ذکر کا معاملہ تو یہ ہے کہ کوئی پسند نہ بھی کرے تو کرنا تو پڑے گا کہ اس کا بہرحال اثر تو ہوتا ہے کسی پر کم، کسی پر زیادہ۔

سارا مسئلہ ہی سوچ کا ہے۔ ہمارے میڈیا، حکومت اور کارپوریٹ سے جڑا ہر اہم آدمی کمانے پر لگا ہوا ہے۔ خوب کھا اور کما رہا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس ملک اور قوم کو لوٹایا (Return) کیا جا رہا ہے۔ کیا ہم ایسے خوش بخت ہیں کہ کچھ نام ڈھونڈ سکیں جنھوں نے ٹاٹا کے نمک کی طرح اچھے کاموں، اچھی سوچ سے ہماری زندگی کو زیادہ ''سالٹی'' بنا دیا ہو۔ Saltier Saft۔

میں سوچتا ہوں کہ اجتماعی طور پر سیاسی و سماجی اور کاروباری اداروں کی کامیابی ہو، انفرادی اور اجتماعی آمدن کی بڑھوتری ہو، پودے ہوں یا بچے یہاں تک کہ قوم کا مستقبل اور تعمیر و تشکیل سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ایک آدھ بار رکھنے سے یہ نہیں پھلتے پھولتے۔ سوچ کو بدلنے، اس میں خوبصورتی اور تازگی لانے کا موسم بہت طویل اور مسلسل ہوتا ہے۔ ذرا سی بے دھیانی سے جڑیں تک سوکھ جاتی ہیں اور سوکھی جڑیں بار بار پانی دینے سے بھی ہری نہیں ہوتیں۔

ہماری سوچ کی جڑوں پر قومی و سیاسی بے دھیانی سے یا پورے دھیان سے سطحی سوچ، فوری کامیابی اور زیادہ منافع کے لیے سستی جنسی اشتہا کو جگانے والے رقص اور گانوں کے پانی کا چھڑکاؤ اتنا بڑھ گیا ہے کہ کبھی تو خوف آتا ہے کہ کچھ عرصے بعد ۸۰ چینلوں کی اس ''دلدلی زمین میں'' کسی اچھے خواب خیال کا گزر ہی کیسے ہوگا؟

سنا ہے سیانے کبھی کہا کرتے تھے کہ عقل مند وہ ہوتا ہے جو اپنی غلطیاں خود بھگتانے، دوسری صورت میں لوگ آپ کے حوالے سے یہ کام خود کر لیتے ہیں۔ ایک غلطی سوچ اور اپروچ کی ہوتی ہے۔ یہ غلطیوں کی ماں کہلاتی ہے جو ڑ کے بغیر انڈے اور بچے دیے جاتی ہے۔ انڈیا کو اندھا دھند نقل کرنے کی عادت کو ہمارے میڈیا نے تقریباً ایمان کا حصہ جان کر یوں بے دھڑک اپنا رکھا ہے کہ ہدایتکار فہیم برنی نے پچھلے دنوں اداکار شان سے کہا تھا ''ہمیں تو انڈیا کا ڈراما دکھا کر کہا جاتا ہے، دیوار کا رنگ بھی وہ کر دو اور کپڑے بھی وہی پہنا دو۔'' اسی سوچ نے نقل کرنے والے دولے شاہ کے

چوہوں کو سوچ کی ایک رسی میں پرو دیا۔ ہر چینل پر ایک جیسے سطحی ڈرامے، ڈانس، میوزک شوز، سب میں انہی کی نقل کچھ عرصہ یہ سلسلہ کامیابی سے چلا اور پھر پٹنے لگا تو اب ان کے پورے پورے سیریل، میوزک شوز، ڈانس پروگرام، ریئلٹی شوز حتیٰ کہ واہیاتی کی آخری منزل تک پہنچے ایوارڈ شوز اٹھا کر چلانے شروع کر دیے ہیں۔

سنا ہے کبھی ہمارے ہاں بھی سنسر اور میڈیا پالیسی ہوا کرتی تھی۔ یہ سن کر ایسے ہی لگتا ہے جیسے کوئی ہڑپا اور موہن جوداڑو کے آثارِ قدیمہ سے ملنے والے نوادرات کا ذکر کرے۔

میری بیٹی انورے تزمین ۴ر سال کی ہونے والی ہے۔ آج صبح اس نے عجیب حرکت کی، جب میں اپنا بیگ اور کالم گاڑی میں رکھ رہا تھا تو بولی ''بابا! میری ننھی میں کیا ہے؟''

میرا دل تو چاہا کہ کہہ دوں ہاتھی مگر باز رہا۔ بیوی نے دور سے آواز لگائی تھی اپنے بچوں کو بچے ہی سمجھا کریں۔ میں نے بڑے پیار سے کہا خود ہی بتا دو۔

بولی ''بابا ہار گئے''۔

''جی بیٹا! بابا لوگ اپنی بیٹیوں سے ہمیشہ ہار ہی جاتے ہیں۔''

وہ بھاگ کر میرے گلے لگ گئی بلکہ لٹک گئی۔ ''بابا! میرا دل کرتا ہے آپ کو کچا کھا جاؤں ٹاٹا نمک لگا کر۔''

کیوں! میں نے کیا قصور کیا ہے؟ اس نے اپنی بند مٹھی کھولی اس میں کتنے سارے سکے (Coins) تھے۔ بابا آپ کی گاڑی میں پڑے تھے۔ میں نے سارے نکال لیے۔ آپ کے ڈریسنگ ٹیبل کی ڈرا میں پڑے تھے میں نے وہ بھی لے لیے تھے، آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے اپنے منے والے پرس میں رکھ لیے تھے۔

پھر اب کیا کرنا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں'' اس نے افسوس سے سارے سکے میرے ہاتھ میں پلٹتے ہوئے کہا ''بابا! وہ اصل میں دیش کا نمک جو کھایا ہے۔ رات آپ خوش ہو رہے تھے ناں اشتہار دیکھ کر اور بتا رہے تھے کہ گلگ ہمیشہ بھرا رہے مگر ایمانداری کے پیسوں سے، تو بابا یہ تو میں نے پوچھے بغیر چکر بازی کی تھی ناں! اتنے پیسوں کے بس ۲ر جوس اور ۲ر چپس آنے تھے۔ وہ تو آپ ویسے ہی لے دیں گے، تو پھر میں کیوں غلط کام کروں۔ صبح مما بھی کہہ رہی تھیں کہ چٹکی بھر ایمانداری بھی بڑی ہوتی ہے۔''

چٹکی بھر نمک کے اشتہار میں اتنا اثر ہوتا ہے۔ دسترخوان پر سجے کم نمک والے کھانے پر ڈالنے کے بعد ذائقہ بدلتے اور بہتر ہوتے تو دیکھا تھا۔ لیکن ایک اشتہار کی چٹکی بھر لائن اور پیغام بھی زندگی کی مٹھاس بڑھا دیتا ہے، یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہنے کو تو ہم سب بڑوں نے اپنے دیش کا کافی نمک کھایا ہے۔ کچھ بے صبروں نے تو دیش کو بھی کافی کھایا ہے۔ ساتھ ساتھ ہندوستان کی تہذیب اور کلچر کو انٹرٹینمنٹ کے نام پر تو باقاعدہ گھٹنوں کے بل ہو کر لقمہ لقمہ جرعہ جرعہ نہیں بلکہ ڈیک لگا کر پیا بھی ہے۔

ملک میں میڈیا کی ترقی کے علمبردار اور ملک کی سیاست اور سماج کو صحیح رُخ دینے کے ذمے دار دونوں ہی اتنے مصروف ہیں کہ انھیں ذومعنی اشتہاروں کا جادو جس کے بارے میں کبھی سات پردوں میں بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی، سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔

ممکن ہے میری طرح کسی روز آپ کا بھی دل چاہے کہ آپ استاد، طالب علم، مینیجر، مالک، کارخانہ دار، سیاست دان یا محنت کش ہوں کہ ایک روز آپ اپنا چینل کھولیں اور اچانک اس پر ایک اشتہار شروع ہو، ایک پاکستانی ماں اپنے بچے سے کہہ رہی ہو، ''میں تو بس اتنا چاہتی ہوں میرا بچہ جو بھی بنے پہلے اچھا انسان بنے اور سچا مسلمان بنے۔''

مگر جلدی مقبول ہونے کی ہوس اور اس سے جلدی مالدار ہونے کی آرزو میں مبتلا لوگوں سے ایسی خواہش کیونکر کی جا سکتی ہے۔ ایسی بات سن کر ان کی تو جبینوں پر آئی شکنیں بھی نہیں جائیں گی مگر کیا کروں سوچ بدلے تو کچھ بدلنے کا راستہ بھی نکلے، یہ تو سوچنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ شکنوں کے خوف سے کیا آرزو کرنا بھی بند کر دیں..... آرزو بدلے تو ہی قوموں اور کاروبار کی آبرو بڑھتی ہے۔ سوچ بدلتی ہے تو پھر بہت کچھ بدل جاتا ہے مگر خالی آرزوؤں سے بھلا کب آبرو بڑھتی ہے۔

◆◆◆